25

مع منتخب مقالات: اسلامی بیداری میں ادب کا حصہ

رابطۂ ادب اسلامی (عالمی) کا سہ ماہی اردو ترجمان

کاروانِ ادب اسلامی

زیر سرپرستی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

مرکزی دفتر رابطۂ ادب اسلامی (عالمی)

پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

کاروانِ ادب اسلامی

سرپرست اعلیٰ: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (صدر رابطۂ ادب اسلامی (عالمی))

مجلس مشاورت:

مولانا محمد ناظم ندوی
پروفیسر عبدالحلیم ندوی۔ دہلی
مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ
پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی، دہلی
پروفیسر ظہور احمد اظہر
مولانا محمد سلطان ذوق ندوی
پروفیسر عبداللہ عباس ندوی، مکہ مکرمہ
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ
پروفیسر تحسین فراقی
پروفیسر وقار احمد رضوی

مدیر مسئول: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی۔ جے۔ این۔ یو دہلی
پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، بی۔ ایچ۔ یو۔ بنارس یونیورسٹی
مولانا نذر الحفیظ ندوی لکھنؤ

معاون انتظامی: اقبال احمد ندوی — کتابت:۔ حامد

معاون طباعت: محمد غفران ندوی — طباعت:۔ پاریکھ آفسٹ، لکھنؤ

زرِ تعاون

فی شمارہ	چالیس روپے
سالانہ برائے ہندوستان	ایک سو پچاس روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک	چار سو روپے یا ۱۲ امریکی ڈالر

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں ——— RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

پتہ:۔ صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد نمبر ۴-۵	جنوری — جون ۱۹۹۸ء	شمارہ نمبر ۴-۱

۱- منزل بہ منزل — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۶

مقالات

۱- مصر اقبال کے اشعار میں — ڈاکٹر جلال الدین الحفناوی مصری — ۹
۲- دانش حاضر اور اقبال — ڈاکٹر محسن عثمانی — ۲۹
۳- علامہ اقبال کی فقیرانہ زندگی کی چند جھلکیاں — محمد بدیع الزماں — ۳۶
۴- اقبال کی جمالیاتی حسیت — ڈاکٹر سید غیاث الدین — ۵۴
۵- امیر الشعراء احمد شوقی بک کی عربی منظومات کے اردو نثری تراجم — پروفیسر وقار احمد رضوی — ۶۳
۶- سوانحی ادب اور قرآن — ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی — ۹۵
۷- ملفوظات و مواعظ ادب کے آئینہ میں — رؤف خیر — ۱۰۲

شعر و ادب

۱- سوال (نظم) — شفیع مشہدی — ۱۱۴
۲- غزل — فطرت بھٹکلی — ۱۱۵

مقالات مذاکرۂ علمی اسلامی بیداری میں ادب کا حصّہ

منعقدہ ۳/۵/اکتوبر ۹۷ء ـــــ بمقام پٹنہ

خطبۂ استقبالیہ	ڈاکٹر احمد عبدالحی	۱۱۶
اسلامی بیداری میں ادب کا حصّہ (سکریٹری رپورٹ)	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۱۲۱
ابتدائیہ	ادارہ	۱۲۹
۱۔ اسلامی بیداری میں ادب کا حصّہ (خطبۂ صدارت)	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	۱۳۱
۲۔ اسلامی بیداری میں علامہ شبلی نعمانی کا حصّہ "الفاروق" کے تناظر میں	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۱۴۰
۳۔ اسلامی بیداری میں علامہ سید سلیمان ندوی کا حصّہ	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	۱۴۷
۴۔ اسلامی بیداری میں مولانا محمد علی جوہر کے ادب کا حصّہ	پروفیسر محمد اجتباء ندوی	۱۵۸
۵۔ مولانا محمد علی جوہر کی اردو صحافت کے اہم موضوعات	ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن	۱۷۰
۶۔ الہلال میں آزاد کا دعوتی پہلو	مولانا عبدالرشید ندوی	۱۸۰
۷۔ اسلامی نشأۃ ثانیہ۔ نگارش آزاد کے حوالے سے۔	شاہنواز احمد خاں	۱۸۸
۸۔ اسلامی بیداری میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا حصّہ "سچ" کے حوالے سے	اقبال احمد ندوی	۱۹۸

۹- علامہ اقبال اور اسلامی نشأۃ ثانیہ	مولانا صدر الحسن ندوی	۲۰۴
۱۰- مسدس حالی۔ منظر اور پس منظر	اقبال ظفر	۲۱۵
۱۱- اسلامی نشأۃ ثانیہ میں مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کا حصہ	مولانا محمود حسن حسنی ندوی	۲۲۵
۱۲- مولانا مناظر احسن گیلانی کی ادبی و علمی خدمات	مولانا انیس الرحمٰن قاسمی	۲۳۷
۱۳- مولانا ابوالمحاسن سجاد اور ان کی خدمات	مفتی نسیم احمد قاسمی	۲۴۶
۱۴- اسلامی نشأۃ ثانیہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا حصہ ماذا خسر العالم کی روشنی میں	مولانا محمد الیاس ندوی	۲۵۵
۱۵- سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور اسلامی نشأۃ ثانیہ	مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری	۲۶۳
۱۶- فکر اسلامی کے احیاء میں کلام اقبال کی اہمیت	شاہ ہلال احمد قادری	۲۷۷
۱۷- اسلامی نشأۃ ثانیہ اور بہار کا اردو ادب (پس منظر و پیش منظر)	پروفیسر وہاب اشرفی	۲۸۵
۱۸- اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں اردو صحافت کا کردار	ڈاکٹر مظفر حسین غزالی	۲۹۵

محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

الفاظ جب اثر رکھتے ہیں

الفاظ جب صاحب الفاظ کے احساس و تأثر کو، اس کی خوش دلی اور بد دلی کو، اس کے جذبہ و تڑپ کو اس کے کیف و مسرّت اور اس کی رنجوری و دل فگاری کو ادا کرنے کی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں تو وہ ادب کا ساز بن جاتے ہیں، اور جب الفاظ کسی صاحب علم کے علم و تحقیق کو، اس کی عقلی کاوش اور اس کے نتیجۂ فکر کو اور اس کے نقطۂ نظر کو سنجیدہ انداز میں پیش کرنے کا کام کرتے ہیں تو علم و واقفیت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور علمی دائرہ عمل میں اپنے طے شدہ مفہوم و معنی اور طے کردہ اصطلاحات اور متعینہ حقائق کو ادا کرتے ہیں، لیکن ادب میں الفاظ اصلاً موقع و محل، حالات و کیفیات کے حق کو ادا کرتے ہیں، اور صاحب الفاظ کے اندرونی محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں، اس کام کے لیے وہ کہیں محاوروں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، اور کہیں تلمیحات کا روپ اختیار کرتے ہیں، کہیں حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں اور کہیں مجاز کی، اور کہیں کسی دلنواز یا دل فگار واقعہ کی یاد دلا دیتے ہیں، اور کہیں صدق بیانی کا فرض انجام دینے کے لیے نرم اسلوب اور سادہ انداز میں دل کو چھونے والی بات کہتے ہیں، یہی وہ رنگ ہے جو ادب کو قوّت و اثر کا حامل بناتا ہے، اور عبارت میں وہ اثر و کشش پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ دلوں میں اتر جاتا ہے اور رجحانات کو نیا موڑ دیتا ہے، اپنی انھیں خصوصیات کے ذریعہ وہ کبھی خواہشات نفس کا

ترجمان بن جاتا ہے اور کبھی بہکتے ہوئے قدموں کو تھام لیتا ہے، ادب کے ان دونوں طرح کے اثرات کے نمونے ادب کی تاریخ میں خاصے ملتے ہیں، اور ان کو ادب کے مؤرخ اپنی اپنی پسند اور رجحان کے مطابق کرتے ہیں، اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان کو ادب کے اصل اور قابل توجہ نمونے قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا عمل ذہنوں کی تفریح ولذت، اور کچھ کا عمل انسانی رجحانات کی تشکیل وتربیت ہوتا ہے، ادب کے ذریعہ تشکیل رجحان وتربیت کے عمل نے تاریخ کے بعض ادوار میں غیر معمولی اثر ڈالا ہے، اور پوری پوری قوم کا مزاج بدل دیا ہے، جس سے بعض بعض وقت کسی کسی قوم وملک میں انقلاب برپا ہوگیا ہے، اسی قسم کے عمل نے مسلمانوں کے سماج میں بارہا بہکتے ہوئے قدموں کو راہ پر لگا دیا ہے۔ یہ وسیع دائرہ میں ہوا ہے تو اس کو بعض وقت مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ قرار دیا گیا ہے، جس میں ادب نے مؤثر کارگذاری دکھائی ہے، اس میں ہندوستان کے متعدد ادوار میں صوفیوں اور عوامی مصلحین کا کام بھی نمایاں مثالیں پیش کرتا ہے، صوفیوں اور مصلحین کے علاوہ وقتاً فوقتاً مفکرین وقائدین نے بھی اس سلسلہ میں اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے، ان کے اس عمل کے نمونے ان کے ادب وعلم کے مخلوط کاموں میں ملتے ہیں، جن کو بعض وقت غائر نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے، دونوں گروہوں کے ایسے نمونے ہم کو ان مصلحین اہل علم کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں، عربی اور اردو دونوں میں اس کے بہت نمونے پائے جاتے ہیں، دوسری زبانیں بھی اس سے خالی نہ ہوں گی۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمان اور خاص طور پر دہلی کے مسلمان جس سراسیمگی مایوسی اور افراتفری کا شکار ہوئے تھے ان کو جامع مسجد دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جس زبان واسلوب بیان میں مخاطب کیا تھا، وہ دلوں میں قوت وہمت پیدا کرنے والا، اور عرصہ تک ادبی یادگار رہنے کی حیثیت کا مالک ہے، اسی طرح آزادی سے قبل انگریزوں کے اقتدار کے زمانہ میں مسجد کانپور اور دیگر سانحوں کے موقع پر مولانا کے البلاغ اور الہلال کے اداریے ایسے ادبی شکوہ اور زور بیان کے حامل ہوتے تھے جن سے ہزاروں مسلمانوں کے دلوں میں ہلچل پیدا ہوئی، اور جذبہ وتڑپ ابھری، اسی طرح مولانا محمد علی جوہر

کی تحریریں اور بیانات بھی ادبی طاقت کے مالک ہوتے ہیں، تحریک آزادی سے ہٹ کر بھی تاریخ اسلام کی متعدد کتابوں اور سماجی اصلاح کی متعدد تحریروں میں بھی شاندار اور پر اثر نمونے ملتے ہیں، اور یہ صرف موجودہ عہد ہی میں نہیں بلکہ سابقہ زمانوں میں بھی ہوتا رہا ہے، عربی میں تو فاتح اندلس طارق بن زیاد کی جنگ سے قبل تقریر جو اس وقت بھی پڑھنے پر خون میں ہلچل پیدا کرتی ہے، اسی طرح حضرت حسن بصری کے مواعظ، علامہ ابن الجوزی کی صید الخاطر و دیگر کتابیں اس کی نمایاں مثالیں ہیں، موجودہ عرب دنیا کے کئی مصلحین قوم کی تحریریں بھی دلوں کو ہلانے والی ملتی ہیں،

اس طرح کی تحریریں اور تقریریں اگرچہ اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے ادب کے عنوان میں داخل نہیں کی جاتی ہیں، بلکہ ان کو عموماً تاریخ کے موضوع میں شامل سمجھا گیا ہے۔ لیکن ان سے ادب کا جو یا مؤثر نمونے حاصل کر سکتا ہے۔

مسلمانوں کو حسن بیان اور پر اثر اداء کا رجحان دراصل قرآن مجید اور حدیث شریف سے ملا ہے، قرآن مجید میں نصیحت اور تفہیم کے لیے جو طرز کلام ملتا ہے وہ اپنے مضمون کے اعتبار سے نصیحت، تنبیہ، تعلیم و ہدایت ہے، لیکن اپنی عبارت اور طرز ادا کے اعتبار سے ادب کے اعلیٰ معیار کو بھی مات دے دیتا ہے۔ اسی طرح حدیث شریف میں نصیحت و ہدایت کے موقعوں پر جو اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے وہ جگہ جگہ حسن تعبیر اور اثر پذیری میں ادب کے اعلیٰ نمونوں سے بھی فائق نظر آتا ہے۔

گذشتہ سال پٹنہ میں رابطہ ادب اسلامی کے برصغیر کے دفتر نے "اصلاح قوم کی اسلامی کوششوں یا دوسرے الفاظ میں "اسلامی نشأۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ"، کے عنوان پر سیمینار منعقد کیا تھا، جو الحمد للہ وقیع سیمینار ثابت ہوا۔

تازہ شمارہ میں سیمینار کے مضامین کا حصہ اسی موضوع کے سیمینار کے تحت مقالات پر مشتمل ہے، امید ہے کہ قارئین کاروانِ ادب اس سے محظوظ ہوں گے۔

ڈاکٹر جلال الحفناوی مصری
قاہرہ یونیورسٹی مصر

مصر اقبال کے اشعار میں

مصر میں اردو زبان

مقالہ نگار مصری ہیں اور مصر میں اردو کے استاذ، انھوں نے سیمینار کے لیے مقالہ اردو میں لکھا ہے۔ (ادارہ)

یہ بات مشکل ہے کہ ہم مصر میں زبان اردو کی آمد کی تاریخ کو بالضبط متعین کریں، البتہ تخمیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کے شروع میں مصر میں اردو داخل ہوئی ان ہندوستانیوں کے ذریعہ جو یہاں یا تو تجارت و سکونت کے لیے آئے تھے یا وہ لوگ جو انگریزی لشکروں سے منسلک تھے۔ اور دن بہ دن ان کی تعداد بڑھتی رہی یہاں تک کہ ایک بہت بڑی کالونی بن گئی۔ اور باوجود یہ کہ وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے اور ہر علاقہ کی اپنی خاص زبان تھی لیکن انھوں نے اردو کو عام زبان بنایا جس کے ذریعہ وہ آپس میں بات کرتے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتے۔ پھر اخبار بھی نکالنا شروع کر دیا تاکہ ان چیزوں کو شائع کیا جا سکے جن کے ذریعہ ان کا اپنے وطن سے ربط و تعلق برقرار رہے، اس کے ذریعہ قومیت کے شعلے بھڑکے اور انگریز مخالف جذبات کو ترقی ہوئی۔ ابو سعید نے عربی جریدہ "جہان اسلامی" نکالا اور اس جریدے کا تحریک آزادی ہند میں کارنامہ رہا ہے۔ اور یہ اردو، عربی اور ترکی زبان میں شائع ہو کر ہندوستان تک پہنچ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ انگریز حکومت متنبہ ہو گئی اور اس کو بند کر دیا اور پھر اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ اور ۱۹۳۰ء میں قاہرہ سے ایک ہفتہ وار پرچہ نکلنا شروع ہوا جو اپنی نوعیت کا پہلا پرچہ تھا اس کو محمود احمد عرفانی

نے نکالا اور اس کا مقصد عالم اسلام کو ہندوستانی مسلمانوں سے متعارف کرانا تھا۔

اور جب اقبال ۱۹۳۱ء میں مصر آئے تو یہاں کے بڑے بڑے نامور لوگ ان سے متعارف ہونا شروع ہوئے یہاں تک کہ قاہرہ اقبال کے تعارف کا مرکز بن گیا اور عبدالوہاب عزام کے ذریعہ عربوں نے علامہ اقبال کو پہچانا۔ اور اہل مصر نے اردو میں دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ اور ۷ر مارچ ۱۹۳۹ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں اردو زبان کی تعلیم شروع ہوئی۔ اور اس کے بعد جامع ازہر کے "کلیۃ اصول الدین" میں ۱۹۴۸ء میں اور پھر ۱۹۷۹ء میں "کلیۃ اللغات والترجمہ" میں اردو ڈپارٹمنٹ کا افتتاح ہوا۔ اور اسی سال جامعہ عین شمس میں اردو شعبہ کھولا گیا۔ اور اب اسکندریہ یونیورسٹی میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے۔ شروع شروع میں اس کی تدریس کا کام کچھ ہندوستانی اساتذہ ہی انجام دیتے تھے۔ اور ان میں سرفہرست حسن اعظمی اور مولانا ابوالحسنات اور شیخ لقمان صدیقی ہیں، شیخ لقمان نے اردو نحو کے قواعد کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی جو قاہرہ یونیورسٹی پریس سے ۱۹۶۱ء میں چھپی جو اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ فی الحال ڈاکٹر امجد حسن قاہرہ یونیورسٹی میں اردو کی تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور پھر اس کے بعد مصری اساتذہ کی ایک نسل نے یہ کام شروع کیا جن میں پہلا نام ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم کا ہے جنھوں نے اردو شعر پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے نیز اس مقالہ نگار نے "فن سیرت نگاری شبلی نعمانی کے یہاں" مقالہ لکھ کر قاہرہ یونیورسٹی سے ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے پھر اس کے بعد کچھ مصری اساتذہ نکلے جو مصری یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تعلیم دینے لگے اور زبان وادب کے تعارف میں حصہ لیا لکچرز اور تالیف وتصنیف کے ذریعہ، نیز مصری ریڈیو روزانہ اردو زبان میں ایک پروگرام نشر کرتا ہے۔ اور اسی کے ذریعہ مصر مشرق وسطیٰ اور جزیرۂ عرب میں اردو کا سنٹر بن گیا۔ اور مصر کی بدولت عربی دنیا کو عظیم شاعر علامہ محمد اقبال سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ کیونکہ مصر کے تعلیم یافتہ مہذب لوگ جو اردو جانتے تھے انھوں نے اقبال کے اشعار کا عربی میں ترجمہ کیا اور ان میں سرفہرست ڈاکٹر عبدالوہاب عزام اور شیخ صاوی شعلان ہیں باوجود اس کے کہ وہ نابینا ہیں لیکن انھوں نے اقبال کے شعر کا ترجمہ کرنے میں کمال کر دیا یہاں تک کہ بہت سی

جگہوں میں یہ ترجمہ اصل سے زیادہ اچھا ہوا ہے۔

مصر میں اقبال کے اشعار کا عربی ترجمہ

کسی بھی مہذب معاشرہ میں تحریک ترجمہ کو اس سوسائٹی کی ثقافتی ترقی اور فکری ارتقار کی دلیل سمجھا جاتا ہے اور مشرقی اور مغربی دنیا کی مختلف ثقافتوں سے روشناس ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح ہماری عربی تاریخ نے بھی ترجمہ کی بہت سی بڑی تحریکیں دیکھی ہیں۔ شاید ان میں سب سے بڑی تحریک وہ تھی جو دوسری صدی ہجری مطابق نویں صدی عیسوی میں عباسی عہد خلافت میں چلی تھی، جہاں مختلف علوم وفنون وآداب میں تحریک ترجمہ پروان چڑھی۔ یہاں تک کہ مختلف یونانی فارسی، اور ہندوستانی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اور عصر حاضر میں گذشتہ صدی کے درمیان رفاعہ طہطاوی آئے، اور انھوں نے اپنے شاگردوں کے ساتھ مل کر مختلف مغربی علوم کی دو ہزار سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے ذریعہ انھوں نے عربی ثقافتی زندگی کو ایک نئی ترقی عطا کی۔

ترجمہ کی تعریف ڈکشنریوں میں اس طرح کی گئی ہے کہ "کسی زبان میں قلم بند شدہ نص کو دوسری زبان میں نقل کرنا"، اور یہ نقل کبھی خیانت سے خالی نہیں ہوتا ہے چاہے وہ خیانت کم ہو یا زیادہ اس لیے کہ ہم طبعی طور پر اس ترجمہ میں شک کرتے ہیں، چاہے کتنا ہی اس میں صحت اور دیانتداری کا ثبوت فراہم ہو۔ اور یہ شک اس فاصلے سے رونما ہوتا ہے جو کہ نص اوّل یا قصیدہ اس کے مترجم کے ہاتھ میں ہوتا ہے چاہے ترجمہ نثر میں ہو یا نظم میں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معانی یا الفاظ میں سے کچھ غائب ہو جاتے ہیں جان بوجھ کر یا خطا سے۔ اس جگہ مجھے اٹلی کی ایک مشہور کہاوت یاد آرہی جس کا مطلب یہ ہے کہ "مترجم چور ہے"، یعنی یہ بات محال اور دشوار ہے کہ مترجم جب کسی کا ترجمہ کرنا چاہے تو اس کو مکمل انداز میں دوسری زبان میں ترجمہ کر سکے[1]

---

[1] دیکھو، محمد عنانی: فن الترجمة، الشركة المصرية العالمية للنشر - لونجمان، الطبعة الثالثة - القاهرة: ۱۹۹۶م

عصر حاضر میں ترجمہ کے لیے کچھ اصول اور علمی قواعد اور نظریات نیز مناہج وضع کیے گئے اور پھر یہ "فن" ترجمہ سے "علم" ترجمہ میں شمار ہونے لگا جس کے اصول و قواعد ہیں، نیز یہ ترجمہ مترجم کے اندر اہلیت اور ادبی اور فنی ذوق کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ مترجم کو اس نص سے جس کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے ایک خاص مناسبت ہو۔ اور ایک قسم کی ہم آہنگی پیدا کرنا جس کے ذریعہ مترجم کے لیے یہ اصوات، الفاظ، جملے اور اشکال وصور کے علاوہ ان تمام خوبیوں کا نقل کرنا ممکن ہو جو اس نص کے اندر ہیں، اور یہ اس لیے کہ ترجمہ ایک ایسا فن ہے جو تالیف و تصنیف سے کہیں سخت ہے اور یہ ترجمہ ایک قسم کی تخلیق ہے بلکہ وہ فی ذاتہ تخلیق ہی ہے۔ اور تخلیقی ترجمہ کبھی کبھی مترجم نص کو یہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ ترجمہ اصل نص سے کہیں زیادہ اچھا لگنے لگتا ہے اور یہ کمال اسوقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ کاتب اور مترجم کے مابین ہم آہنگی اور ارتباط نہ ہو۔ اور یہی الصاوی شعلان کے ساتھ، پاکستانی شاعر علامہ اقبال کے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کے ترجمہ اور یمنی شاعر قاضی محمد محمود زبیری کے ساتھ، ہندوستانی شاعر الطاف حسین حالی کی "مسدس حالی" جو مد الاسلام وجزرہ کے نام سے مشہور ہے کے ترجمہ میں ہوا ہے۔

اور جب بات ایسی ہے تو پھر شعری نص کا ترجمہ کیسے ہو؟ بہر حال اس بارے میں نقاد کی مختلف آرا ہیں اور کسی خاص اور واضح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے۔ اس لیے کہ شعر کے ترجمہ کے لیے کچھ اصول و قواعد ہوتے ہیں جو خود شعر سے ہی نکلتے ہیں۔ کیوں کہ قصیدہ کا ایک خاص جوہر ہوتا ہے جو ایک شاعر سے دوسرے شاعر کے بیان سے مختلف ہوتا ہے۔ اور مترجم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ شعر کی غرض وغایت کو پہچانے اور یہ شعری کلام کے ترجمہ میں پہلی گھاٹی کے درجہ میں ہے اور اس کے باوجود شعر کا ترجمہ مکمل نہیں ہوتا، اور چاہے مترجم کتنی ہی امانت کا حریص ہو وہ اس میں خیانت کر ہی بیٹھتا ہے، چاہے شعوری طور پر ہو یا لاشعوری طور پر[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا اور خصوصاً

---

[1] دیکھو۔ محمد عنانی: الترجمۃ الادبیۃ: الشرکۃ المصریۃ العالمیۃ للنشر، لونجمان الطبقۃ الاولیٰ۔ القاہرہ ۱۹۹۷ء

شعر کا شعر میں ترجمہ کرنا بہت بڑی محنت وکاوش کی بات ہے اور ڈاکٹر عزام نے اس کا سامنا کیا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کے "پیام مشرق"، "ضرب کلیم"، "اسرار خودی ورموز بے خودی"، کا ترجمہ کیا اور "جاوید نامہ" کو مکمل نہیں کر پائے۔ اور ڈاکٹر عزام نے اپنے ترجمہ میں معنی اصلی اور شکل وصورت کا لحاظ رکھا ہے جو اس شعر میں ہے اور وزن وقافیہ کی کلی قدرت تصرّف کی گنجائش رکھی جو عربی ذوق کے مناسب بھی ہو۔

اس لیے کہ مترجم کی سمجھ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت بہت دفعہ اس کا ساتھ نہیں دیتی ہے اور وہ شاعر کے افکار کو ہضم کرنے میں پریشانی محسوس کرتا ہے جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے اور جس کو شاعر نے مترجم کی زبان کے علاوہ دوسری زبان میں نظم کیا ہے، اس وجہ سے اصل معنی سے بہت دور ہو جاتا ہے اور کبھی ایسے افکار ومعانی کی طرف مائل ہوتا ہے جو شاعر کے اصلی معنی کے خلاف ہے اس لیے کہ شعر کے ترجمے میں دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ شعر کی اصلی زبان مترجم کی تابع ہو اور مترجم اس کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہو، اور اسی طریقے سے اس کی اپنی زبان میں مہارت ہو اور اس کی جزئیات کا جاننے والا ہو۔

شاعر محمد محمود زبیری کا کہنا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے علامہ اقبال اور خواجہ الطاف حسین حالی کے کلام کا ترجمہ کیا ہے کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شعر کا ترجمہ نثر میں کرنا آسان کام نہیں ہے تو اس کا شعر میں ترجمہ کرنا کیسا ہوگا۔ اور اس شعر کا کیا حال ہوگا اگر وہ شاعر کے لیے اجنبی زبان میں ہو۔ اور یہ بہت بڑی مشکل ہے اور میں بعض معانی کا لفظی ترجمہ کرتے ہوئے محسوس کرتا تھا کہ میں اقبال پر ظلم کر رہا ہوں اور ان کے شعر کی روحانیت کو اس کے جسم سے سلب کر رہا ہوں اور پھر اس کو دوسرے جسم میں ڈالنے کے لیے مجبور کر رہا ہوں۔

شعری ترکیب کی صنعت ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ سے فقط دشوار نہیں ہوتا ہے، بلکہ دشواری اس کے معنی کو اسی زبان میں نقل کرنے میں ہوتی ہے، اور اس سے عجیب بات یہ ہے کہ وہ شرح وتفسیر کی حدود سے خارج ہوتا جاتا ہے کیونکہ جو شخص کسی عمدہ شعر کی شرح کرتا ہے یا اس کو اپنی زبان میں ادا کرتا ہے تو اس شعر کی ترکیب میں پوشیدہ احساسات کے عناصر کی نثر یا تفسیر کرنے

سے عاجز ہے پس کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کا دوسری زبان میں ترجمہ کرے۔

استاد مسعود عالم ندوی نے علامہ اقبال پر ایک مقالہ لکھا ہے اور "الفتح" میں نشر کیا گیا جس کو استاد محب الدین "الخطیب" قاہرہ سے نکالتے تھے اور یہ علامہ اقبال کا مصر سے سب سے پہلے تعارف کا سبب ہے، اس کے بعد شیخ ابوالحسن علی ندوی نے علامہ اقبال پر ایک لکچر موجودہ دارالعلوم جامعہ فؤاد الاول قاہرہ یونیورسٹی میں دیا، پھر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے علامہ اقبال کے شعر کا مطالعہ کیا اور ان سے گفتگو کی اور ان سے اس کے شعر کے عربی ترجمہ کے بارے میں اجازت طلب کی تو انھوں نے اجازت عطا کی۔ مولانا شیخ ابوالحسن علی ندوی لکھا ہے کہ "علامہ اقبال نے استاذ عبدالوہاب عزام کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ان کے شعری کلام کے ترجمے کا ارادہ رکھتے ہیں[1] اور پھر شکوہ کا ترجمہ صادی شعلان نے "حدیث الروح" کے نام سے کیا جس کو ام کلثوم نے راگ کے ساتھ مولانا شیخ ابوالحسن ندوی کہتے ہیں کہ جب انھوں نے یہ سنا کہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام اقبال کے شعر کا شعر میں ترجمہ کرنے جا رہے ہیں تو ان کا ارادہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

اقبال ۱۳۵۰ھ/۱۹۲۱-۱۹۳۴م میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن کے سفر کے بیچ میں مصر کی زیارت کی۔ اور ۱۳۴۵ھ/۱۹۰۵م میں اقبال کا دوستوں کے نام لکھے ہوئے رسائل میں ایسی باتیں ملتی ہیں جس سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ اقبال مصر کے مہذب اور مثقف طبقوں میں مشہور ومعروف تھے۔ اقبال اپنے ایک خط میں جس کو انھوں نے نومبر ۱۳۴۳ھ/۱۹۰۵م میں کیمرج سے اپنے ایک دوست کے نام بھیجا جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے نقل کیا ہے کہ سویس میں ان کی ملاقات بعض مصریوں سے ہوئی۔ پھر کہتے ہیں کہ جب ہم بورسعید پہنچے اس وقت صبح کے تین بجے تھے اور میں سو رہا تھا تو مجھ کو ایک سلیمان نامی مصری ڈاکٹر صاحب نے بیدار کیا اور میں جاگ اٹھا اور ان کے ساتھ بیٹھا اور میں نے ایک مصری نوجوان کی وفد سے ملاقات کی اور سب کے سب جمعیت شبان المسلمین

---

[1] ابوالحسن ندوی: روائع اقبال، المجمع العلمی الاسلامی العلمی۔ الطبقۃ الخامسہ لکھنؤ ۱۹۹۱م ص ۱۶-۱۷

[2] ابوالحسن ندوی: روائع اقبال ۱۷

کے ممبران تھے۔ اور مجھے اس ملاقات سے بہت خوشی ہوئی۔ اور قاہرہ کے ایک مشہور وکیل "لطفی بیدہ" نے ڈاکٹر سلیمان کی زبانی مجھ کو سلام بھیجا اور انھوں نے مجھ کو قاہرہ دیکھنے کی دعوت دی۔[1]

اور رجب ۱۴۵۰ھ / دسمبر ۱۹۳۱ء میں اقبال اسکندریہ سے آتے ہوئے قاہرہ پہنچے اور پانچ دن قیام کیا، اس بیچ انھوں نے کچھ اہل علم اور سیاست داں اور صحافیوں سے ملاقات کی ان میں سے شیخ الازہر مصر کے بڑے مفتی صاحب، وزیر الاوقاف محمد علی "السیاسہ" پرچے کے ایڈیٹر شیخ محمد حسین ہیکل "مجلۃ المنار" کے ایڈیٹر شیخ رشید رضا شامل تھے اور جمعیت الشبان المسلمین کے ایک جلسہ میں انھوں نے تقریر کی اور جمعیت کے نائب شیخ عبدالوہاب نجار نے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کو مہمان محترم کا حاضرین سے تعارف کرانے کی ذمہ داری دی، اور ڈاکٹر عزام نے اقبال کے ساتھ اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے ان کا تعارف کرایا اور "پیام مشرق" کے چند شعر پڑھ کر سامعین کو محظوظ کیا۔[2]

اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام پہلے شخص ہیں جنھوں نے عربی قارئین کے سامنے علامہ اقبال کو پیش کیا اور ان کا دیوان "پیام مشرق" کا ترجمہ کیا اور ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱ء میں کراچی سے شائع ہوا، نیز ان کے دیوان "ضرب کلیم" کا ترجمہ کیا جو ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء میں قاہرہ سے شائع ہوا اور اس کے بعد "اقبال مسجد قرطبہ میں" کا ترجمہ کیا جس کو پاکستانی سفارت خانہ جدہ نے چھاپا ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء میں اور بعد ازاں "اسرار و رموز" کا ترجمہ کیا جو ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء میں قاہرہ میں چھاپی گئی۔ پھر "اقبال کی زندگی ان کی سیرت اور ان کا فلسفہ" نام کی ایک کتاب انھوں نے ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۰ء میں قاہرہ سے شائع کیا۔[3]

شیخ صاوی شعلان نے استاد محمد حسن اعظمی کے ساتھ مل کر ایک کتاب لکھی جس کا نام "ہند و پاک

---

[1] ندوی: روائع اقبال: ۲۷ و رفیع الدین ہاشمی: خطوط اقبال۔ لاہور ۱۹۷۶ء

[2] ظہور اظہر: اقبال العرب علی دراسات اقبال: المکتبۃ العلمیۃ۔ لاہور ۱۱۸

[3] سمیر عبدالحمید ابراہیم: اقبال والعرب۔ مکتبۃ دار السلام۔ الطبقۃ الأولی۔ الریاض۔ ۱۴۱۳ھ / ۲۰-۲۱

میں اسلامی ثقافت اور فلسفہ اقبال اور ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء میں قاہرہ سے چھاپی گئی۔ پھر ان دونوں نے مل کر ایک کتاب بنام "اقبال کے فلسفہ میں موت وحیات، لکھی ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء میں کراچی سے نکلی ہے۔ اور پھر شیخ صاوی شعلان نے اقبال کے شعر کے منتخبات اسلام آباد میں نشر کرنے لگے۔ ۱۳۶۳ھ/۱۳۶۳ء "شکوہ اور جواب شکوہ" کا منظوم ترجمہ شائع ہوا، پھر ان کا قصیدہ "حدیث الروح" اور "طلوع اسلام" قاہرہ سے شائع ہوا، اور شیخ صاوی شعلان نے "ایوان اقبال" نام کی ایک کتاب تصنیف کی جو قاہرہ سے شائع ہوئی۔ اور استاذ نجیب کیلانی نے "اقبال الشاعر الثائر" یعنی اقبال انقلابی شاعر کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس پر ان کو وزارت تعلیم کی طرف سے ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء میں انعام ملا۔

مصر کے مشہور کاتبوں اور ادیبوں نے اقبال کے بارے میں متعدد مقالے لکھے اور مختلف قسم کی اسٹیڈی کی۔ مثلاً عباس محمود العقاد نے ایک مقالہ "اقبال وفلسفۃ" یعنی اقبال اور ان کا فلسفہ کے نام سے لکھا اور اس کی کتاب "ماوراء الطبیعۃ" فارسی کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اور ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے "اقبال شاعر اسلامی" کے نام سے کتاب لکھی اور نظریہ خودی کی شرح کی۔ اور استاذ احمد حسن الزیات نے "تقویۃ الذات عند اقبال" کے نام سے مضمون لکھا اور طہٰ حسین نے ایک مقالہ میں بہترین موازنہ کیا ہے اقبال اور ابوالعلا المعری کے بیچ "اقبال وابوالعلا" کے نام سے اور فتحی رضوان جو کہ اقبال کی قاہرہ کی زیارت کے دوران ان کے ہمراہ تھے، "اقبال الفیلسوف" کے نام سے لکھا۔[1] اور ڈاکٹر عثمان امین استاذ فلسفہ کلیہ الآداب، قاہرہ یونیورسٹی متأثر ہوئے جنھوں نے ایک نیا مذہب بنایا جس کا نام "الجوانیہ" یا ذاتیت رکھا جس کے اوپر اقبال نے زور دیا ہے مگر ڈاکٹر عثمان امین نے اقبال کی باتوں کی تفسیر وتشریح "کانت" وغیرہ مغربی فلاسفہ کے نظریات کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی (۴) اسی طرح شیخ ڈاکٹر احمد شرباصی نے ایک مقالہ بعنوان "من نفحات اقبال شاعر الاسلام الاکبر" لکھا ہے اور اس کے معنی اسلام کے سب سے بڑا شاعر علامہ اقبال کے ارمغان افکار ہیں۔[2]

---

[1] ظہور اظہر: اقبال العرب علی دراسات اقبال: ۱-۱۱

[2] ظہور اظہر: اقبال العرب علی دراسات اقبال: ۳۱-۳۹-۵۳

ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم "اقبال و دیوان ارمغان حجاز" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۶ء میں لاہور پاکستان میں چھپی ہے اور یہ کتاب اقبال کا زمانہ ان کی فکروں اور ان کے فارسی و اردو کے مطالعہ پر مشتمل ہے اور ان کے دیوان کا مکمل ترجمہ اردو اور فارسی دونوں حصّوں کا انھوں نے کیا۔ اور ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر سمیر عبدالحمید نے ڈاکٹر عزام کا "اسرار و رموز" کے ترجمہ کو دوبارہ تحقیق و تعلیق اور نیز ان ترجمہ کے تکمیل کے ساتھ جس کو ڈاکٹر عزام نے نہیں کیا تھا شائع کیا اور یہ کتاب المکتبۃ العلمیہ لاہور سے ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن دارالانصار قاہرہ سے ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۰ء میں شائع ہوا، اور پھر ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء میں السبیل إلی وحدۃ العالم الاسلامی بین اقبال والمودودی کے نام سے ایک کتاب تالیف کی اور اس کے معنی عالم اسلامی کی وحدت کا راستہ اقبال و مودودی کے بیچ۔ اور اقبال کا دیوان "جاوید نامہ" کا ترجمہ عربی نثر میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور ڈاکٹر محمد السعید جمال الدین نے اس کا ترجمہ اور تحقیقی مطالعہ کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء میں یہ بحث شائع ہوئی اور ڈاکٹر حسین مجیب مصری نے اس کے بعد "ارمغان حجاز" کے فارسی حصّے کا ترجمہ شعر میں کیا اور ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء میں اس کو نثر میں نقل کیا اور آخر میں "اقبال اور قرآن" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی[1]

مصر اقبال کے اشعار میں (اقبال اور مصر)

اقبال کے اُردو اور فارسی دیوان پڑھنے کے بعد ہم اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اقبال مصر یا اس سے متعلق ان رموز کا جس کے ذریعہ مصر کی طرف اشارہ ملتا ہے مثلاً نیل، سینا، اہرام، جبل طور، فرعون، یوسف وغیرہ اپنے کلام میں ذکر کرنے کے کتنے شیدا تھے اور یہ تین دیوانوں میں ہے اور وہ بالترتیب کثرت کے اعتبار سے بانگ درا، ضرب کلیم، بال جبریل، ارمغان حجاز (فارسی)

---

[1] سمیر عبدالحمید ابراہیم: اقبال والعرب: ۲۴-۲۵

انھوں نے مصر اور اس کے رمزوں کا ذکر اپنے دونوں دیوان بانگ درا اور بال جبریل میں متفرق مواقع پر شعروں میں کیا ہے جبکہ انھوں نے مصر کو دو قصیدوں میں خاص کیا اپنے دیوان ضرب کلیم میں پہلے کا نام "اہرام مصر"، دوسرے کا نام "اہل مصر سے رکھا۔

علامہ اقبال نے مصر کی زیارت کی اور جمعیت الشبان المسلمین میں ایک لکچر دیا۔ اور قاہرہ کی سیر کی آثار قدیمہ کا مشاہدہ کیا اور ابوالہول اور اہرامات مصر کے بارے میں اپنے مخصوص انداز میں شاعری کی۔ اقبال مکمل طور پر ان چیزوں سے باخبر تھے جو کچھ مصر میں ان دنوں سیاسی اور دینی افکار و تحریکات پائے جا رہے تھے اسی جیسے اسلامی افکار و تحریکات برصغیر میں بھی سرگرم تھیں۔

انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے شروع میں مصر کے اندر بہت سارے مسائل اور مشاکل پیدا ہوئے اور جن کے حل کے لیے اہل فکر کا ناخن تدبیر درکار تھا۔ اور یہ مسائل مصری قومیت، اسلامی خلافت اور عرب قومیت ہیں۔ علامہ اقبال نے مصری قومیت اور عرب قومیت دونوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور ان تحریکوں کے علمبرداروں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

کل ایک شوریدہ خوابگاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائرانِ حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں
غضب ہیں یہ "مرشدانِ خود بیں"، خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں[1]

اقبال نے جب مصر کی زیارت کی تو قومیت کے مسئلہ کو پسند نہیں کیا اور نہ ان کو وہ قائدین اچھے

---

[1] اقبال: کلیات اقبال۔ بانگ درا، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۱۹۹۵ء۔ ۱۶۲ ایضاً سمیر عبدالحمید: ۶۱

لگے جنھوں نے اس وقت قومیت کی دعوت دینی شروع کردی تھی اور قومیت کے خیال کے تحت مسلمانوں میں تفرقہ سے ان کو بچانے کے لیے اس دعوت کو انھوں نے فراموش کردیا۔ اور اقبال اپنے پند و نصائح کے ذریعہ مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہے کہ وہ قومیت کی جادو کے جال میں نہ آئیں اور نہ ہی اس کی چمکدار روشنی کی طرف جائیں۔

اقبال نے مسلمانوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے کہ ملّت اسلامیہ کی بنیاد ایمان و عقیدہ اور رسالت محمدی کی ابدیت و آفاقیت پر ہے اور ان کی قوت کا سرچشمہ ان کی مذہب کے ساتھ وابستگی اور ملی اتحاد و اعتماد ہے ان کا مذہب ہر مکان و زمان کے لیے ہے انھوں نے اس نقطہ کی بھی وضاحت کی ہے کہ اسلام اور مسلمان کسی ملک و سرزمین پر انحصار نہیں کرتے، اسی لیے ملکی حدود کی تبدیلی سیاسی عروج و زوال اور فتح و شکست سے اس طرح متأثر نہیں ہوتے جس طرح ملک و نسب پر انحصار کرنے والی قومیں ہوتی ہیں[1] فرماتے ہیں:۔

پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا [2]

اور پھر فرماتے ہیں:۔

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب [3]

وطن دوستی فکر اقبال کی ابتدا ہے، انتہا نہیں، اور ارتقائے خیال میں یہ پہلی منزل ہے۔ ان کے یہاں وطن دوستی کا جذبہ ہر دور میں پایا جاتا ہے۔ مگر وطن پرستی سے نفرت بھی عام ہے اقبال نے انسان کی مجموعی حیثیت اور اس کے متنوع جہات پر بڑی حکیمانہ نکتہ آفرینی کی ہے، جائے پیدائش کی دوگزر

---

[1] ندوی۔ نقوش اقبال۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ ۱۹۷۶ء - ۳۰۲-۳۰۳

[2] اقبال: کلیات اقبال۔ بانگ درا۔ ۲۰۵

[3] اقبال: کلیات اقبال۔ بال جبریل۔ ۳۲۹

میں سے ابھرنے والے انسان کو آفاق کے بیکراں حدود سے ہمکنار ہونے کے لیے مؤثر اور عام مشاہدے کی تمثیل سے وضاحت کی ہے جیسے عام طور پر بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ مثال کلام اقبال میں بالکل اچھوتی اور یکتا ہے اسے ان کے تصوّر وطنیت کا حاصل کہہ سکتے ہیں[1]

آں کفِ خاکے کہ نامیدی وطن — ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہل وطن را نسبتے است — زانکہ از خاکش طلوع ملتے است

اور پھر اقبال فرماتے ہیں:۔

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہ گذر — چشم کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور!
مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں — دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
آدبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے — عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایّام نے
آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابرِ آزادی اٹھا، برسا گیا[2]

اور ابوالہول کے تمثال کے سامنے اقبال نے چند اشعار کہے اور اس کو (اہل مصر سے) کا نام دیا۔

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھکو
وہ ابوالہول کہ ہے صاحب اسرارِ قدیم
دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ اُمم
ہے وہ موت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمد ہے، کبھی چوبِ کلیم!

---

[1] عبدالحق: فکر اقبال کی سرگذشت۔ رحمان منزل، بلوا گھاٹ، جونپور۔ ۱۹۸۹ء ۱۴۵-۱۴۶

[2] اقبال: کلّیات اقبال: بانگ درا۔ ۱۵۲

[3] اقبال: کلّیات اقبال: ضرب کلیم۔ ۶۰۶-۶۰۷

حقیقت میں اقبال اُمّتِ مسلمہ کے نظامِ حیات کی تشریح و توضیح کر رہے ہیں کہ محض عقل و دانش پر اعتماد و بھروسہ ناکافی ہے بلکہ قوت و طاقت کی اشد ضرورت ہے یہاں تک کہ بلا طاقت و قوّت کے دستور العمل معاہدہ اور قانون کی کوئی قیمت نہیں ہے سوائے ان روشنائی جس کے ذریعہ وہ قانون و معاہدہ لکھا گیا ہے یعنی اس ردی کے سوا اور کوئی قیمت ہی نہیں جب تک کہ طاقت اور پاور نہ ہو اور اس حکمت کی تعلیم ان کو ابوالہول نے دی ہے پس وہ چیز جو تقدیر انسان کو بدل سکتی ہے وہ بہت بیش قیمت ہے۔

اور باوجود یہ کہ قوّت کی شکل و نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے مگر وہ حقیقت جس کا انکار ممکن نہیں ہے وہ طاقت و پاور کی ہر زمانے میں ضرورت رہی ہے اور اسی طریقہ سے آئندہ زمانے میں بھی اس کی ضرورت رہے گی۔ اور یہ قوّت کبھی تو موسیٰ علیہ السّلام کی لاٹھی کے شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تلوار کی شکل میں۔ اور مؤمن کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے پاس قوّت کا یہ سرمایہ ہو تاکہ اس کے ذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام لیتا رہے ورنہ تو وہ مؤمن ہی نہیں ہوگا بلکہ راہب کہلائے گا اور رہبانیت روح اسلام کے منافی ہے۔

اسی طرح مصر میں اقبال نے اہرام کے بارے میں بھی لکھا تاکہ فن میں اپنے نظریہ کی تشریح کر سکیں اور اپنے مخصوص اسلوب بیان میں لکھا، وہ کہتے ہیں کہ فنکار کو اپنے فن کے ذریعہ کمال کے انتہا کو پہنچنا اس وقت ممکن ہوگا جب وہ اپنی ذاتیت کو طبیعت کی تقلید سے آزاد کر دے اور دوسرے لفظ میں فن کو خلود و دوام سے جب ہی ہمکنار کرنا ممکن ہوتا ہے جب فن کے اندر اصالت اور جدت پائی جائے[1] اہرام مصر کے عنوان سے علاّمہ اقبال کہتے ہیں:۔

اس دشتِ جگر تاب کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر!
اہرام کی عظمت سے نگونسار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

---

[1] سمیر عبدالحمید ابراہیم: اقبال والعرب۔ ۶۲-۶۳

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو!
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر! [1]

علامہ اقبال مصر پہنچے اور اس کے سیاسی حالات کو دیکھا حالانکہ اس وقت احیاء خلافت کی بات چل رہی تھی بعض رائے یہ تھی کہ ملک کو خلیفہ کے ماتحت بنایا جائے اس لیے انھوں نے مناسب سمجھا کہ بادشاہ، اصحاب الرائے لوگوں کو خطاب کریں جس میں واضح کریں کہ خلافت کا مطلب فقط تاج اور ملک نہیں ہے بلکہ خلافت ایک ایسا اسلامی اسلوب عمل ہے جو ایسے دلوں سے پھوٹ کر نکلنے والی ہے جو اپنے رب پر ایمان لانے والے ہوں، اپنے پیدا کرنے والے کے لیے، عاجزی کرنے والے ہوں اور پھر اقبال اپنے آپ پوچھتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دوبارہ لوٹ کر آئیں تاکہ مصر کے بادشاہ فاروق کو خلافت کے معنی سمجھا سکیں گویا جو کچھ اقبال کے ذہن میں تھا وہ ابو بکرؓ و عمرؓ کی خلافت تھی، اور اسی طریقہ سے اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ وہ پاک صاف زمانہ دوبارہ لوٹ کر ہمارے اس دور میں آئے اور جب اقبال کے فلسفہ کی بنیاد تحریک ہے تو وہ تمنا کرتا ہے کہ جزیرہ عرب سے صحرائی ہوا چلے جہاں سید المرسلین پر رسالت نازل ہوئی ہے اور وہ نیل کی موجوں کو بھڑکا دے اور ہوا کے داغ رسالت محمدیہ اور عطر نبوّت کو اٹھائے ہوئے فاروق اعظم کے پیغام فاروق مصر تک پہنچائے [2] اقبال کہہ رہے ہیں:۔

تو اے باد بیابان از عرب خیز
ز نیل مصریان موج برانگیز
بگو فاروق را پیغام فاروق
کہ خود در فقر و سلطانی بیا میز
خلافت فقر و با تاج و سریر است
زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است

---

[1] اقبال: کلیات اقبال، ضرب کلیم - ۵۷۸، ۵۷۹

[2] سمیر عبدالحمید ابراہیم: اقبال والعرب - ۶۴ - ۶۵

جوان بخت آمدہ از دست ایں فقیر
کہ بے او پادشاہی زود میراست [1]

ان اشعار سے اس چیز کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کی اقبال نے ملک کو خبر دی ہے کہ اس کا ملک مائل بزوال ہے اور ویسا ہی ہوا، اس لیے کہ اسلامی تعلیم سے دوری فاروق سے مصری سلطنت کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ پس اقبال نے اپنی نصیحت میں بار بار اس کے کان میں کہا کہ عقل و قلب کے داعی کا جواب دینا چاہیئے اور اس کو اس بات کی وصیت کرتا ہے کہ ایسا مومن بننے کی کوشش کرے جس کے ذریعہ دینی روحانیت چوٹی تک رسائی حاصل کر سکے اور یہ چاہتا ہے کہ اس کو قصد السبیل کی طرف رہنمائی کرے اس بات پر کہ چھلکا چھوڑ کر مغز و لباب کی طرف توجہ دے [2]

اقبال کے شعر میں رموز بہت زیادہ پائے جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ اقبال نے عالم غائب کو رمزیت کی شکل میں پیش کیا ہے اور اس کے رموز کسی قسم کی کوئی شکل و صورت نہیں دیتے، زندگی کا امتزاج اور اس کی انشراح اس میں واضح ہے اور وہ چیزوں کا نام نہیں ذکر کرتا ہے بلکہ رمز و کنایہ کا ذکر کرتا ہے اور اقبال کی رمزیت کی خوبی بنیادی طور پر اس میں پوشیدہ اور مخفی ہے کہ وہ ترکیبی اعتبار سے ان رموز سے مختلف ہے جس کو دوسرے شعراء نے استعمال کیا ہے چاہے وہ اردو میں ہو یا فارسی میں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال نے عربی شعر و زبان و تاریخ سے مدد حاصل کی ہے پس ہم اقبال کی رمزیت کو موسیٰ۔ فرعون، کلیم۔ طور کی شکل میں دیکھتے ہیں اور یہ سب انسانی تاریخ کی دینی اجتہاد کی کہانیاں ہیں لیکن یہ چیزیں اقبال کے یہاں خیر و شر کے نیچ ابدی دستبرداری پر دلالت کرتی ہیں [3] اور مندرجہ ذیل اشعار ان رموز و کنایات پر دلالت کرتے ہیں جن کے ذریعہ اقبال نے مصر نیل و سینا و

---

[1] اقبال: کلیات اقبال (فارسی) کتب خانہ نذیریہ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ دوسری بار ۱۹۷۱ء-۶۳

[2] سمیر عبدالحمید ابراہیم: اقبال والعرب۔ ۶۶-۶۷

[3] " " " " ۳۷

فرعون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اقبال اور فرعون

اقبال نے مصر کی قدیم تاریخ میں خاص طور پر دلچسپی لی ہے اور فرعون کو جابر، ظالم اور سرکش و شر سے تعبیر کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جو کہ نبوت اور رحمت و خیر کے نمائندہ تھے جب حکیم سنائی کی قبر کی زیارت کی تو اس سے متأثر ہو کر اپنے دیوان بالِ جبریل میں کہتے ہیں

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں ابتک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا! [1]

اور موسیٰ و فرعون کے بیچ موازنہ کرتے ہوئے اپنے دیوان ضربِ کلیم میں فقر و ملوکیت کے عنوان کے تحت کہتے ہیں:۔

اسکی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم! [2]

اور دیوان ضربِ کلیم میں "غزل" کے عنوان سے کہتے ہیں کہ ہر انسان کی زندگی میں خواہشات ہوتی ہیں پس اگر کسی کی خواہش دنیا میں علم و فن کی سعادت سے مستفیض ہونا ہو تو اقبال کی خواہش دنیاوی زندگی یہ ہے کہ اس کا دل حق کو جاننے کے لیے مضطرب و کوشاں رہتا ہے اور وہ ایک عمدہ موازنہ فریقین کے درمیان کرتا ہے اور اہل فکر و اہل ظاہر کا معجزہ فلسفہ و حکمت میں پوشیدہ ہے جبکہ اہلِ ذکر و اصحاب باطن کا معجزہ مخفی ہے موسیٰ فرعون و طور میں:۔

معجزۂ اہلِ فکر، فلسفہ و پیچ پیچ
معجزۂ اہل ذکر، موسیٰ و فرعون و طور [3]

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، بال جبریل، ۳۱۷

[2] " " " ضربِ کلیم ۴۹۲

[3] " " " " ۵۱۳

اور پھر ضرب کلیم میں "نفسیات غلامی" کے تحت کہتے ہیں:۔

ہو اگر قوت فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

ضرب کلیم۔ ۶۲۰

اقبال اور سینا

اقبال نے سینا کا مختلف ناموں سے ذکر کیا۔ ان میں سے بعض کا ذکر قرآن میں بھی وارد ہوا ہے مثلاً طور سینا، برق ایمن، وادیٔ مقدّس، وادی ایمن اور جبل طور کا اقبال نے خاص اہتمام کیا ہے۔ اقبال کے دیوان "بانگِ درا" میں ہمالیہ کے عنوان کے تحت کہتے ہیں:۔

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

کلیات اقبال۔ بانگ درا ص۲۱

اور پھر کہتے ہیں:۔

کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے — چھوٹا سا طور تو، یہ ذرا سا کلیم ہے

کلیات اقبال۔ بانگ درا ص۴۱

جلتی ہے تو کہ برق تجلّی سے دور ہے — بیدرد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے

کلیات اقبال: بانگ درا ص۴۵

ہر دل مے خیال کی مستی سے چور ہے — کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

کلیات اقبال: بانگ درا ص۵۱

محبّت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے — ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

کلیات اقبال: بانگ درا ص۷۴

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم — تھی تری موج نفس بادِ نشاط افزائے علم

کلیات اقبال۔ بانگ درا ص۷۴

کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کلیات اقبال: بانگ درا ص۸۲

کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی

کلیات اقبال: بانگ درا ص۹۹

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضہ کرے کوئی

کلیات اقبال: بانگ درا ص۱۰۲

جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

کلیات اقبال۔ بانگ درا ص۱۱۶

مگر آئی ہے نسیمِ چمن طور کبھی !
سمت گردوں سے ہوائے نفس حور کبھی

کلیات اقبال: بانگ درا ص۱۲۵

ہے زمین قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمت مغرب میں جو روشن بھی مثل شمع طور

کلیات اقبال: بانگ درا ص۱۴۶

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

کلیات اقبال: بانگ درا ص۱۶۹

برقِ ایمن مرے سینہ پہ پڑی روتی ہے
دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے؟

کلیات اقبال: بانگ درا ص۱۷۳

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

کلیات اقبال: بانگ درا ص۲۰۲

لیکن فقیہہ شہر نے جس دم سنی یہ بات
گرما کے مثل صاعقۂ طور ہو گیا

کلیات اقبال: بانگ درا ص۲۱۷

غافل اپنے آشیاں کو آ کے پھر آباد کر
نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بیں

کلیات اقبال: بانگ درا ص۲۲۱

شرارے وادیٔ ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن
نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخم سینائی

کلیات اقبال: بانگ درا ص۲۴۴

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلہ سینائی کر

کلیات اقبال: بانگ درا ص۲۷۹

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

کلیات اقبال: بانگ درا ص۳۳۲

ارنی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر
یہ حدیثِ کلیم و طور نہیں

کلیات اقبال: بانگ درا ص۳۳۵

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر و در نہ
تو شعلۂ سینائی میں شعلۂ سینائی

کلیات اقبال: بانگ درا ص۴۱۳

دلِ طورِ سینا و فاران دو نیم!
تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم

کلیات اقبال: بانگ درا ص۴۱۵

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

کلیات اقبال: ضربِ کلیم ص۵۸۹

ایک دن اقبالؔ نے پوچھا کلیم طور سے
اے کہ تیرے نقش پا سے وادی سینا چمن
آتش نمرود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریز
ہو گیا آنکھوں سے پنہاں کیوں ترا سوزِ سخن
تھا جواب صاحب سینا کہ مسلم ہے اگر
چھوڑ کر غائب کو تو حاضر کا شیدائی نہ بن

کلیات اقبال: بانگ درا ص۲۴۰

اپنے وادی سے دور ہوں میں
میرے لیے نخل طور ہے تو!

کلیات اقبال: بال جبریل ص۳۹۴

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا

کلیات اقبال: بانگ درا ص۸۱

اقبال اور دریائے نیل

اقبال نے دریائے نیل کا کئی بار ذکر کیا، وہ فرماتے ہیں:۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل — ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
چرخ نے بالی چرالی ہے عروسِ شام کی؟ — نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی؟

کلیات اقبال: بانگ درا ص ۵۱

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک؟
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لیے

کلیات اقبال: بالِ جبریل ص ۳۴۱

اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے شمود
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوں و نیل

کلیات اقبال: بال جبریل ص ۳۸۸

خود ہے زندہ تو دریا ہے بیکراں نہ ترا
ترے مزاق میں مضطر ہے موج نیل و فرات

کلیات اقبال: ارمغان حجاز (اردو) ص ۶۶۸

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

کلیات اقبال: بانگ درا ص ۲۶۵

ڈاکٹر محسن عثمانی

دانش حاضر اور اقبال

یہ بات ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اقبال ایک مفکر اور پیامبر شاعر تھے۔ ان تینوں پہلوؤں کی جامعیت میں اقبال کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ اقبال کی شخصیت کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ فلسفی اور مفکر تھے۔ ان کے خیالات میں فلسفیانہ گہرائی پائی جاتی ہے۔ اقبال کا مقابلہ اگر دنیا کے بلند قامت فلسفیوں سے کیا جائے گا تو شاید صف اوّل میں ان کو جگہ نہ مل سکے۔ اسی طرح سے صرف پیامبر اور راہبر کی حیثیت سے ان کا مقابلہ دنیا کے عظیم پیشواؤں اور رہنماؤں سے کیا جائے گا تو بھی ان کو امامت وقیادت کا درجہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ اور صرف شاعری کو اگر معیار قرار دیا جائے تو دنیا میں بہت بڑے اور بلند مرتبہ شاعروں کی کمی نہیں۔ لیکن اگر ہم مذکورہ بالا تینوں پہلوؤں کو کسی ایک شخصیت میں مجسم دیکھنا چاہیں تو اقبال کا مقام ان تمام شخصیتوں سے اونچا نظر آئے گا جن میں مذکورہ بالا تینوں وصف پایا جاتا ہو۔ اقبال کی عظمت کو سمجھنے کے لیے یہ ایک بنیادی بات ہے۔

اقبال عظیم شاعر تھے۔ اور عظیم شاعر ایک عظیم فنکار ہوتا ہے۔ اور فن سائنس سے مختلف ایک چیز ہے۔ اس کا کام حسن وجمال کی تخلیق ہے۔ فنکارانہ پیرایہ اظہار میں سائنس کی سی قطعیت اس میں نہیں پائی جاتی۔ فن منطقیانہ استدلال سے خالی ہوتا ہے۔ فن جذبہ اور وجدان کے حریری اور خواب آگیں وسیلہ کو اختیار کرتا ہے۔ اور بہ ہزار لطافت ونزاکت کسی کیفیت کو پھیلاتا اور پہنچاتا ہے شعر کے فن میں اشاعت وترسیل کا کام واعظانہ اور خطیبانہ نہیں ہوا کرتا۔ اس کی فضا خاموش ہوتی ہے۔ فنکار سکوت لالہ وگل سے کلام پیدا کر سکتا ہے اور پھول کی پتّی سے ہیرے کا جگر کاٹ سکتا ہے۔

سینۂ شاعر تجلی زار حسن ہوتا ہے اور اس کی مینائے فکر سے حسن انوار کا دریا رواں ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ خوب کو خوب تر بناتی ہے۔ اس کے آب و گل میں بحر و بر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس کا دل جہانِ تازہ کا آئینہ ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک شاعر خود خضر بھی ہے اور ظلمات میں جرعۂ آب حیات بھی ہے۔ اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری ہوتی ہے۔ اس کے اعجاز ہنر کے آگے فطرت بھی خجل اور شرمندہ ہے۔ خورشید اس کے وجود سے کسب ضیاء کرتا ہے۔

شاعر دلنواز میں شانِ خلیل عیاں ہوتی ہے لیکن آزر کے بتکدوں کو پاش پاش کرنے کا کام شاعری کی دنیا میں ضربت سے نہیں بلکہ فنکارانہ حرفت سے ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں ہوتا ہے جب شاعر کی فکر و آگہی پورے طور پر وجدان اور جذبہ سے ہم آہنگ ہو کر آمادۂ تخلیق ہو اور اس خاص کیفیت کو لفظوں کا ریشمی لباس پہنانے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس لیے کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعری اپنے مقصد و مدعا تک پہنچنے کے لیے سائنس اور فلسفہ کے برعکس صراحت، وضاحت اور منطقانہ قطعیت کا نہیں بلکہ ابہام، پراسراریت، رمزیت، ایمائیت، غنائیت، شعریت موزونیت، لرزش و ارتعاش، سیماب وشی، وجد و سرور، رومانیت اور جذبہ کے نمود و تموج کا سہارا لیتی ہے۔ اس اعتبار سے شاعری کا راستہ نثر سے مختلف اور اس کی دنیا نثر کی دنیا سے الگ اور ممتاز ہے۔ اگر شاعر پر بوقت تخلیق علم و آگہی اور ہوش و خرد کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کی شاعری نثر سے قریب ہو جاتی ہے۔ اور اگر نثر نگار پر جذبہ اور وجدان اور سکر و سرور کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو پھر نثر شاعری سے جا ملتی ہے۔ شاعری اور نثر کے فرق و امتیاز کو کسی مبصّر نے اس طرح واضح کیا ہے کہ نثر سیدھی شاہراہ پر سیدھے چلنے اور شاعری پیچدار طریقہ سے چلنے اور رقص فرمانے کا نام ہے۔

شعر کی دنیا رنگ و جمال اور حالت سکر کے کمال کی دنیا ہے۔ شاعری کے ذریعہ ترسیل سے پیام کی اثر انگیزی دو آتشہ اور سہ آتشہ بن جاتی ہے۔ لیکن اس میں یہ نقص ہوتا ہے کہ اس کے قطعی الثبوت اور واضح الدلالہ نہ ہونے کی وجہ سے شارح اور مبصّر اگر بصیرت سے بہرہ مند نہ ہو تو غلط نتیجہ تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ دانش حاضر کے بارے میں اقبال کے شاعرانہ ردعمل کی تشریح

میں بھی فہم وفکر کا عدم توازن پایا جا سکتا ہے۔ دانش حاضر کے لیے اقبال سے بڑھ کر باخبر اور صاحب نظر کوئی دوسرا شاعر نہیں کہ وہ اس کی آگ میں مثل خلیل ڈالے گئے تھے اور وہ اس کے میخانہ کے مدّتوں تک بادہ نوش رہ چکے تھے۔ وہ اس کے ساقی اور مہبا دونوں سے پورے طور پر واقف تھے۔ اور اس بارہ خاص میں نہ تو حالی ان کی ہمسری کر سکتے تھے اور نہ اکبر الہ آبادی ان کے ہم رتبہ ہو سکتے تھے۔ اگرچہ دونوں شاعر اقبال کی طرح بڑے اور پیامبر شاعر تھے۔

اقبال کے شاعرانہ صیغۂ اظہار میں دانش حاضر کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک عقل و دانش کی قسمت میں خواہ وہ حاضر ہو یا قدیم حضور نہیں۔ اگرچہ وہ آستاں سے دور نہیں۔ حکمت و دانش کے سارے نمائندے سر بہ جیب ہیں۔ عقل وہ چراغ رہ گذر ہے جسے درون سینہ ہنگاموں کی خبر نہیں۔ وہ دانش حاضر جس کا ایک جلوہ صنعتی انقلاب ہے اقبال کے شعر کے مطابق فیضان سماوی سے محروم ہے۔ اور اس کے کمالات کی حد برق و بخارات ہے اس دانش حاضر سے روشن ذہن ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہے۔ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر سکتا ہے لیکن زندگی کی شب تاریک کو سحر نہیں کر سکتا۔ وہ ذہن علم جدید کے پیچ وخم میں اس طرح الجھ کر رہ گیا کہ نفع وضرر کے فیصلہ کی صلاحیت سے محروم ہو گیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ شیشۂ تہذیب حاضر "مئے لا" سے تو لبریز ہے مگر اس کا پیمانہ "الا" سے خالی ہے۔ اس تہذیب کا سحر زخمہ ور کی تیز دستی کا مرہون منت ہے۔ اس کے جلوے پابہ رکاب ہیں ایوان فرنگ سست بنیاد ہے اور پکے ہوئے پھل کی طرح خود بخود گرنے کو تیار ہے۔ بیکاری و میخواری و عریانی و افلاس فرنگی مدنیت کے فتوحات ہیں۔ اس کا ضمیر تاجرانہ ہے۔ اس کی رنگینی اور حسن آفرینی نظر کا فریب ہے۔ اس کی آزادی دراصل گرفتاری ہے۔ یہ سر بہ سر عقل عیار ہے۔ اس کی روح عفیف نہیں ہے۔ اس کا سینہ بے نور اور اس کا وادی ایمن شایان تجلّی نہیں۔ اس کے دونوں نظامہائے حیات خدا شناس اور آدم فریب ہیں۔ سرمایہ داری خراج اور اشتراکیت خروج ہے۔ اس کا چہرہ روشن اور اندرون چنگیز سے تاریک تر ہے، یورپ اگرچہ دانش حاضر کا نقیب اور نمائندہ ہے اور روشنی علم و ہنر سے مالا مال ہے لیکن یہ ظلمات بے چشمۂ حیواں ہے۔ علم و حکمت اور تعلیم

مساوات کے باوجود ظلم و بربریت اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ اس کی بے تاب بجلیوں سے خود اس کا آشیانہ خطرہ میں ہے۔ وسائل کی فراوانی استہلاک (CONSUMERISM) کا عذاب اسی کا بخشا ہوا ہے۔ مال و زر کی فراوانی اس کے پاس ہے لیکن دل کا سکون اور اپنا سراغ اسے ہاتھ نہیں آتا ہے۔ مشینوں کا نکلا ہوا دھواں انسانیت کا کفن ہے۔ تہذیب جدید جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے اور آلات جو کارخانوں سے ڈھل کر نکلتے ہیں احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں۔

اقبال نے مغربی تہذیب اور دانش حاضر پر جو بھی تنقید کی ہے وہ جذبات کے دھندلکوں میں اور شعری پیرایۂ اظہار میں کی ہے۔ اور جب فن کے کمال کے اظہار کے ساتھ کسی شے کی شعری ترسیل ہوتی ہے تو وہ کئی گنا زیادہ مؤثر بن جاتی ہے۔ وہ ترسیل جسے جذب دروں کا قاصد میسر آگیا ہو تیز رَو اور برق سے تیز تر ہوتی ہے۔ وہ زمین کے پھولوں اور آسمان کے ستاروں سے بڑھ کر دل نشیں ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد قاری کا امتحان ہوتا ہے۔ امتحان میں کامیابی یہ ہے کہ وہ جذبے کی شراب سے کیف و سرور تو حاصل کرے لیکن ہوش و خرد کو پیالے میں غرق ہونے سے بچالے اور اپنے توازن کو برقرار رکھے۔ شاعر کی تو اپنی شاعرانہ مجبوری ہوتی ہے کہ وہ بحور و اوزان اور ردیف و قافیہ کے جبر کی وجہ سے سو فیصدی توازن کے ساتھ ترسیل نہیں کر سکتا۔ لیکن قاری اگر اپنے فکر کو متوازن نہ رکھ سکے تو یہ تعقل اور آگہی کا عیب کہلائے گا اور اس لیے لائق مواخذہ ہوگا۔

اقبال نے دانش حاضر سے تاکید اور تواتر کے ساتھ اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اور یہ بیزاری کچھ غلط بھی نہیں۔ مغربی تہذیب میں ہزار عیب ہیں۔ اس کا سفینہ گھن کھایا ہوا ہے اور دیمک کا چاٹا ہوا ہے۔ اس کے خامۂ تہذیب پر ہزار بد اطواریوں کے داغ ہیں۔ اقبال جو اس تہذیب کے محرم راز اور اس کی خرابیوں سے آگاہ تھے کیونکر نہ اس کی خرابیوں سے پردہ اٹھاتے اور اپنی ملّت کو ان سے بچانے کی کوشش کرتے۔ اس فرض منصبی کو ادا کیے بغیر شاعری پیمبری نہیں بن سکتی تھی۔ اقبال نے پیامبری کے لیے شاعری کو وسیلۂ اظہار بنایا تھا۔ اقبال کے پاس یہی ایک فن تھا جس میں کمال بھی تھا اور جمال بھی تھا۔ تاثیر بھی تھی اور سحر انگیزی بھی تھی۔ اور یہی فن کا نقطۂ عروج ہے جس نے اقبال کے فلسفے اور پیام دونوں کو شام و سحر کی قید سے آزاد کر کے جاوداں بنا دیا۔

اقبال نے اپنی فنکارانہ تخلیق میں جو شعر کے پیرائے میں ہے دانش حاضر سے اپنی شدید بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اگر اقبال اپنی شعری کاوشوں میں دانش حاضر کے بارے میں آگہی کو وجدان کا رنگ و روپ نہ دیتے اور وجدان کے اظہار کا شعری اسلوب اختیار نہ کرتے تو ان کی یہ تنقید اتنی کارگر اور تیر بہدف نہ بن سکتی تھی۔ انھوں نے اپنے محسوسات کو ہنر کے کمال کے ذریعہ ہر قلب کی دھڑکن بنا دیا۔ لیکن کیا واقعی اقبال کی آگہی دانش حاضر کے بارے میں یکطرفہ اور یک رخی ہے؟ اقبال کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ دانش حاضر کے صرف منفی پہلو پر تنقید ایک شاعرانہ انداز ہے اور اس کا مقصد قوت اور تاثیر پیدا کرنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دانش حاضر یا جدید تمدّن کا ہر پہلو عیب دار ہے اور اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جو قابل اخذ اور لائق استفادہ ہو۔

اقبال نے دانش حاضر کی تباہ کاری دکھانے کے لیے جذبہ کے تموج کا شاعرانہ واسطہ اور وسیلہ اختیار کیا ہے لیکن دانش حاضر کے بارے میں اقبال کے رویہ کا اس سے پورے طور پر اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اقبال دانش حاضر کے محاسن کے بھی قائل اور معترف ہیں۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنے خطوط اور نثری تحریروں میں کیا ہے۔ ان تمام چیزوں کو سامنے رکھا جائے تو اس سے اقبال کے فکر کا تضاد نہیں بلکہ اس کے فکر کے توازن کا اظہار ہوتا ہے۔ اقبال نے اپنے ایک خط میں جاپان کی تعریف اس لیے کی ہے کہ اس کی عظمت کا دارومدار صنعت پر ہے۔ اقبال کسی ملک کی عظمت کو ناپنے اور طے کرنے کے لیے کارخانوں کو اور صنعت میں خود کفیل ہونے کو معیار قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:۔

> "بڑھئی کے ہاتھ جو محنت اور مشقّت کے سبب کھردرے ہو گئے ہوں، ان نرم نرم ہاتھوں کی بہ نسبت بدرجہا خوبصورت اور مفید ہیں جنھوں نے قلم کے سوا کسی چیز کا بوجھ کبھی محسوس نہیں کیا۔"

اقبال کے مذکورہ بالا بیان میں اور اس بیان میں کہ احساس مروّت کو آلات کچل دیتے ہیں کوئی تضاد نہیں ہے۔ دراصل اقبال مشین کے اور آلات کے مخالف نہیں ہیں بلکہ انسانوں پر

مشینوں کی حکومت کے خلاف ہیں وہ معیار زندگی کی اس بلندی کے خلاف ہیں جس سے معیار بندگی میں پستی اور سستی پیدا ہوتی ہے۔

اقبال نے ایک نثری تحریر میں جس کا ترجمہ ملّت بیضا پر ایک عمرانی نظر کے نام سے مولوی ظفر علی خاں نے کیا ہے صنعتی تعلیم کو مسلمانوں کی معاشی آزادی اور اقتصادی بہتری کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ گویا صنعت وحرفت سائنس اور ٹکنالوجی جسے دانش حاضر سے الگ نہیں قرار دیا جاسکتا اقبال کے نزدیک ان کی تعلیم نہ صرف ضروری ہے بلکہ ترقی اور عروج کا اس کے بغیر تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے اس رویہ کا مزید ثبوت یہ ہے کہ علی گڑھ میں جامعہ کے قیام (۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء) کے بعد جب گاندھی جی نے اقبال کو اس قومی ادارے کی سربراہی قبول کرنے کی دعوت دی تو اس کے جوابی خط میں اقبالؔ نے یہ لکھا:۔

> "ہم جن حالات سے دوچار ہیں ان میں سیاسی آزادی سے قبل معاشی آزادی ضروری ہے اور اقتصادی لحاظ سے ہندوستانی مسلمان دوسرے فرقوں کے معاملہ میں بہت پیچھے ہیں۔ بنیادی طور پر انھیں ادب اور فلسفہ کی نہیں بلکہ ٹکنیکل تعلیم کی ضرورت ہے جس کی بنا پر انھیں معاشی آزادی حاصل ہوگی اس لیے فی الحال انھیں اپنی صلاحیتیں اور توجہ اسی مؤخرالذکر تعلیم پر مرکوز کرنی چاہیئے۔ جن معزز حضرات نے علی گڑھ میں نئی یونیورسٹی قائم کی ہے انھیں چاہیئے کہ اس نئے ادارے میں خصوصی طور پر طبعی علوم کے ٹکنیکل پہلو پر زور دیں اور اس کے ساتھ حسب ضرورت مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کریں۔"

(خط مورخہ ۲۹ رنومبر ۱۹۲۰ء)

اقبال ملّت بیضا کی نجات کے لیے دانش حاضر کے ایک پہلو ادب اور فلسفہ کے بجائے دانش حاضر کے دوسرے پہلو طبعی علوم اور ٹکنالوجی کے نہ صرف معترف ہیں بلکہ اس کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے جہاں آلات اور مشینوں کی مذمّت کی ہے وہاں ان کی مراد وہ صنعتی تہذیب ہے جو انسان کو مادیت سکھاتی اور روحانیت سے دور کرتی اور انسانیت سے

محروم کرتی ہے۔

بیسویں صدی کے ایک معروف نومسلم مفکّر اور مصنّف ڈاکٹر محمد اسد نے بھی اپنی کتاب اسلام دوراہے پر (Islam at the Cross Road)، میں بجنسہٖ ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو یورپ سے جو چیز لینی چاہیے وہ مغربی ادب اور مغربی شاعری نہیں بلکہ سائنس اور تکنیکی تعلیم ہے۔

اقبال کی شاعری کے مضمرات کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے صرف چند شعروں تک اپنے مبلغ علم کو محدود کر دینے سے خرابیوں کے اندیشے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اقبالؔ مشرقی اور مغربی علوم پر درک رکھتے تھے۔ اس درک کے باوجود انھوں نے علم اور عقل کی مخالفت بھی کی ہے۔ یہاں بھی ان کی مراد وہ علم اور وہ عقل ہے جس سے یقین کی روشنی ختم ہوتی ہے اور محبّت کے چراغ گل ہو جاتے ہیں اور ایمان واذعان سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔ اقبال روحانی اور اخلاقی قدروں کا چراغ روشن رکھنا چاہتے تھے۔ اسلام کے نظام اقدار کے ساتھ ان کی وابستگی مستحکم اور غیر متزلزل ہے۔ اسلام کے نظام اقدار اور اس کی روایت سے پورے طور پر آگہی کے بغیر اقبال سے آگہی ممکن نہیں ہے جس طرح عقیدۂ مسیحیت سے آگہی کے بغیر دانتے اور ملٹن کی شاعری کے محرکات اور مفاہیم کے ادراک کی کوشش امر بے سود اور سعی لاحاصل ہے۔

محمد بدیع الزماں

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

علامہ اقبال کی فقیرانہ زندگی کی چند جھلکیاں

میں نے اس مضمون کا عنوان دانستہ طور پر علامہ اقبال کی "فقیرانہ زندگی" رکھا ہے "درویشانہ زندگی" نہیں۔ حالانکہ علامہ نے اپنے کلام میں خود کو کئی مقامات پر درویش اور مرد درویش بھی کہا ہے۔ مگر چونکہ "فقیری" ایک طریق زندگی ہے اور وہ خود اپنا طریق زندگی فقیرانہ بتاتے ہیں، جسے وہ "امیری" کی ضد بھی قرار دیتے ہیں اس لیے یہ عنوان اس مضمون کے لیے موزوں سمجھا گیا۔ اس لیے بھی کہ علامہ نے "فقر" اور "فقیری" کا سارا جواز قرآنی تعلیمات، رسول اللہؐ، صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کی زندگیوں سے فراہم کیا ہے جن کا یہی طریق زندگی تھا اور جن کی شانِ امارت میں اسی "الفقر فخری" کا سماں رہتا تھا۔ اقبال مسلمانوں کے زوال کی واحد وجہ صرف ان میں شانِ فقر کی کمی "ضربِ کلیم" کی نظم "مسلمان کا زوال" کے درج ذیل شعر میں بتاتے ہیں ؎

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسّر تونگری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اور پھر اسی مجموعہ کی نظم "فقر و راہبی" میں اس کمی کو زوال کی اصل وجہ بتاتے ہوئے

یہ تأسف کرتے ہیں ؎

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

دوسری وجہ اس مضمون کا عنوان "علامہ اقبال کی فقیرانہ زندگی" رکھنے کی یہ ہے کہ "فقر" ایک طریق زندگی ہے جب کہ تصوّف کی اصطلاح میں درویش وہ ہے جو علائقِ دنیوی سے بالکل کنارہ کر چکا ہو اور یوں خلوت گزیں ہو گیا ہو کہ کائنات اس کے اندر سمٹ کر سما گئی ہو اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یکسوئی حاصل کر کے تسخیرِ کائنات کی طرف متوجہ ہو۔ یہ وہ منزل ہے جہاں سے سالک اور طالب حقیقت "مقام فنا" کی طرف بڑھتا ہے۔ عجمی تصوف میں درویشی سے جو تصوّرات وابستہ ہیں وہ کم و بیش بے عملی کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے کلام میں درویشی کے تصوّر میں بے عملی کا شائبہ تک موجود نہیں ہو سکتا۔ اقبال کا درویش بے عمل تو نہیں لیکن کم عمل ضرور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درویشی کے مرحلہ پر اقبال طالب حقیقت کو تفکّر کے مرحلوں سے گزارتے ہیں۔ صوفیا کے یہاں درحقیقت جو پورا مردِ مومن تھا وہ اقبال کے یہاں آتے آتے محض درویش رہ گیا۔ یعنی وہ جہاں بیں اور خدا بیں تو ہو گیا، لیکن اس نے باعمل ہو کر اپنے تجربات اور اپنی شخصیت سے نیابتِ الٰہی کے فرائض انجام دینے سے گریز کیا اور اس کی ذات کے کئی مرحلے صوفی خلوتوں ہی کی نذر ہو گئے۔

قبل اس کے کہ علامہ کی "فقیرانہ زندگی" پر گفتگو کی جائے یہ ضروری ہے کہ ہم علامہ کے تصوّرِ فقر کی خاصیت اور ماہیت کو گرفت میں لائیں کیونکہ "شانِ فقر" طریق زندگی ہے جس کی بقول اقبال درپردہ قرآنی روح ہے۔ یہ سیمینار اور مذاکروں میں علمی بحث اور مقالوں کا موضوع ہی نہیں بلکہ متاعِ مصطفویؐ کا امین بننے کے مترادف ہے جس کے جلو میں صدق و اخلاص و نیاز و سوز، درد و داغ ذوق و شوق، تسلیم و رضا اور تسخیرِ جہاں کے عناصر کی آمیزش ہے۔

فقر طریقت کی ایک اصطلاح ہے جسے اقبال نے قطعی الگ معنوں میں استعمال کیا ہے کیونکہ وہ خود صوفیانہ طریقۂ کار کے من و عن قائل نہ تھے۔ ان کے مطابق شریعت کو

پرکھنے اور بہ نظر عمیق اس پر عمل کرنے کا نام ہی طریقت ہے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:۔

پس طریقت چیست اے والاصفات شرع را دیدن باعماقِ حیات
کس نہ گردد در جہاں محتاج کس نکتہ شرع مبیں ایں است و بس

اقبال فقر و استغنا سے وہ بے نیازی مراد لیتے ہیں جسے مادی وسائل کی موجودگی اور غیر موجودگی کا خیال تک نہ ہو۔ اقبال نے ایسے تو سارے کلام میں "فقر" کی ماہیت پر روشنی ڈالی ہے مگر "بال جبریل" کی غزل ۵۹ میں اس لفظ پر بسیط روشنی ڈالی ہے جس میں فقر کی سب سے بڑی صفت "عفتِ قلب و نگاہ" بتاتے ہیں جس کی وجہ سے انسان میں مسیحائی اور کلیمی کے خواص پیدا ہوتے ہیں اس غزل میں وہ فقر کو توحید کا راز دار بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔

علم کا مقصود اور فقر کا مقصود اور
اَشہد ان لا الٰہ، اشہد ان لا الٰہ

اقبال کے نظامِ فکر میں خودی، عشق اور فقر تینوں ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں اور ایک کو دوسرے سے الگ کر کے گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔ متذکرہ بالا غزل میں اقبال خودی کو فقر کی سان پر چڑھانے کی بات کرتے ہیں مگر "ضرب کلیم" کی نظم "لا الٰہ الا اللہ" میں کہتے ہیں کہ ؎

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اس سے معلوم ہوا کہ فقر اور توحید الٰہی میں شدید مناسبت پائی جاتی ہے۔ یعنی فقر توحید سے جدا کوئی چیز نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ عقیدہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ توحید ہے اور عمل کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ فقر ہے۔ جب ایک مسلمان عقیدۂ توحید کو اپنی عملی زندگی سے ظاہر کرتا ہے تو وہی عقیدہ فقر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

"الفقر فخری" کی میراث صحابہ کرامؓ کو عشقِ رسولؐ سے ملی۔ فقر اور شاہی یہ دو موتی ہیں جو سرکار دوعالمؐ نے توحید کے سمندر سے حاصل کیا تھا۔ فقر کا موتی آنحضرتؐ کی نگاہ بن گیا اور شاہی کا موتی آپؐ کے دست مبارک میں شمشیر بن گیا۔ اس نکتہ پر اقبال کا یہ شعر ہے ؎

خسروی شمشیر، درویشی نگہ
ہر دو گوہر از محیط لاالٰہ !

اس کے بعد ان دونوں صفات یعنی خسروی اور درویشی کی تجلّی صحابۂ کرامؓ کے قلوب پر عکس فگن ہوگئی اور ہر صحابی نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس نعمتِ خداداد سے اپنا اپنا دامن بھر لیا۔ کہتے ہیں ؎

فقر و شاہی وارداتِ مصطفےٰؐ است
ایں تجلّی ہائے ذاتِ مصطفےٰؐ است

اقبال کے نزدیک فقر ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا نام ہے۔ یہ حضورؐ کا سرمایہ ہے اور ہم اس کے امین ہیں ؎

فقر ذوق و شوق و تسلیم رضا ست
ما امینیم ایں متاعِ مصطفےٰؐ ست

قرآن پاک جس فقر کی تلقین کرتا ہے وہ ہر لمحے زندگی کا احتساب کرنے کا نام ہے۔ فقر غار و کوہ میں سکون تلاش کرنے کا نام نہیں بلکہ بحر و بر میں ہلچل مچانے کا نام ہے۔ فقر مردہ دلی اور زندگی سے فرار کا نام نہیں بلکہ زندگی کی سختیوں کو ذوق و شوق سے برداشت کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا نام ہے۔ اس کی سب سے بڑی صفت غیرتمندی ہے۔ کیونکہ ایسا فقیر غریبی میں بھی اپنی عزّت نفس کو قائم رکھتا ہے۔ اور باعزّت زندگی بسر کرتا ہے۔ "ارمغان حجاز" کی درج ذیل رباعی میں اس کی صفت کو اقبال یوں بیان کرتے ہیں:

غریبی میں ہوں محسودِ امیری — کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر و درویشی سے جس نے — مسلماں کو سکھا دی سر بزیری

اقبال کے نظامِ فکر میں اسلام انسان میں ایسا فقر پیدا کرتا ہے جس میں مسکینی اور دلگیری نہیں ہوتی بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے غیرت ہوتی ہے اور مسلمان کی شناخت یہ ہے کہ وہ غیور ہوتا ہے۔ اس لیے اقبال کے کلام میں ایک اصطلاح "فقر غیور" ہے جس سے

ان کی مراد غیرت کا مادہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس اصطلاح کو دین اسلام کے مترادف قرار دیتے ہوئے "ضرب کلیم" کی نظم "اسلام" کے درج ذیل شعر میں کہتے ہیں ؎

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقر غیور"

اقبال کے نظامِ فکر میں "فقیری" ایک علم ہے جس کی حقیقت کا شاہد ہر شخص کا ضمیر ہے۔

آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاہد
مشکل نہیں اے سالکِ رہ علم فقیری (ضرب کلیم: "محراب گل افغان کے افکار" ۱۵)

اس کی شہادت ہر شخص کے ضمیر میں اس لیے ملتی ہے چونکہ خدا خود فرماتا ہے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا" البقرہ، ۲۸۶)

لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے)"۔ (الانعام، ۱۵۲)

وَلَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (ہم کسی شخص کو اس کی مقدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے" (المؤمنون، ۶۲)

لہٰذا علم فقیری عین فطرت کا اقتضا ہے اور اللہ کسی ایسے کام کا حکم نہیں دیتا جس کا کرنا طاقت بشری سے باہر ہو۔ تصوف کی اصطلاح میں "علم فقیری" کا مفہوم "وصول الی اللہ" ہے اور یہ اختیاری ہے۔ یہ وہ حبِ ایمانی ہے جو صرف اتباعِ رسول سے پیدا ہوتی ہے۔

اقبال کا "فقیری" اپنی ساری جبلی صلاحیتوں اور خوبیوں کو قوۃ سے فعل میں لا کر بنی آدم کو نیکی کی طرف مائل کر کے ایسا نظام قائم کرتا ہے جو مقاصد فطرت کی صرف نگہبانی ہی نہیں کرتا بلکہ فسوں گر یعنی مغربی تہذیب کا محاسب ہو کر لوگوں کو اس تہذیب کے غیر اسلامی نظام سے آگاہی بھی دیتا ہے جسے اقبال "ضرب کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے آخری بند کے درج ذیل شعر میں "سرمایۂ سلطانی" سے تعبیر کرتے ہیں:۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی پابندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی
دنیا میں محاسب ہے تہذیب فسوں گر کا ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی

چونکہ فقر کی روح قرآنی ہے اس لیے اقبال "ضربِ کلیم" ہی کی نظم "سلطانی" میں فقر کا مقام سلطانی ہی قرار دیتے ہیں:۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار اسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سبحانی

اقبال فقیری کی ایک صفت "بوئے اسد اللٰہی" کا بھی پایا جانا ضروری قرار دیتے ہیں یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عشقِ رسولؐ میں گرویدگی کے ساتھ توکل الی اللہ پر کامل ایمان ۔ بالِ جبریل کی غزل ۳۴ میں کہتے ہیں ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

"بال جبریل" کی ایک رُباعی میں اقبال امیری کا تعلق فقیری سے اور فقیری کا روشن ضمیری سے قائم کرتے ہوئے صوفیوں پر طنز کرتے ہوئے مسلمانوں کو پھر وہی قلب و نظر عطا کیے جانے کی مانگ خدا سے کرنے کی صلاح دیتے ہیں، جو ضمیر کو روشن کر کے اسے امیری کا مستحق بنائے کہتے ہیں:۔

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری

صرف یہی نہیں کہ علامہ کی ذاتی زندگی فقیرانہ تھی، جس کا ذکر آگے آرہا ہے، بلکہ وہ اپنی اولاد کو بھی اس طریق زندگی کو اپنانے کی تلقین کرتے رہے۔ اپنے فرزند جاوید اقبال کو (جو چند سال قبل پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے) جب وہ لندن میں زیر تعلیم تھے "بال جبریل" کی نظم "جاوید کے نام" میں یہ تلقین کرتے ہیں ؎

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اور پھر اسی زمانہ میں "ضرب کلیم" کی نظم "جاوید سے" کے آخری بند میں یہ درس دیتے ہیں۔

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز — دین و دولت قمار بازی
ناپید ہے بندۂ عمل مست — باقی ہے فقط نفس درازی
ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لیے موت — ہے اس کا مقام شاہبازی
روشن اس خرد کی آنکھیں — بے سرمۂ بوعلی و رازی
حاصل اس کا شکوہ محمود — فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرافیل — رکھتا نہیں ذوقِ نے نوازی
ہے اس کی نگاہِ عالم آشوب — در پردہ تمام کار سازی
یہ فقر غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مرد غازی

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

اقبال کے تصوّر فقر پر اس مختصر سی گفتگو کو "بال جبریل" کی ایک رباعی کے درج ذیل شعر پر ختم کرتے ہوئے اب آگے اقبال کی فقیرانہ زندگی کی چند جھلکیاں پیش کی جارہی ہیں ؎

تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

صرف یہی نہیں کہ اقبال اپنے فرزند جاوید اقبال کو اپنی نظموں کے ذریعے فقیرانہ زندگی گزارنے پر وعظ و نصیحت کرتے تھے بلکہ خانگی زندگی میں بھی جب انھیں اس طریق زندگی سے

منحرف پاتے تو ان کی سرزنش بھی کرتے۔ جاوید اقبال اپنے بچپن کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ابّا جان کو انگریزی لباس سے سخت نفرت تھی۔ مجھے ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کیا کرتے۔ منیرہ (جاوید اقبال کی ہمشیرہ) بھی اگر اپنے بالوں کو دو حصوں میں گوندھتی تو بُرا مانتے اور کہتے: "اپنے بال اس طرح نہ گوندھا کرو، یہ یہودیوں کا انداز ہے" اور اگر میں کبھی غلطی سے اپنی قمیصوں یا شلواروں کا کپڑا بڑھیا قسم کا خرید لاتا تو بہت خفا ہوتے۔ کہتے: تم اپنے کو کسی رئیس کا بیٹا سمجھتے ہو، تمہاری طبیعت میں امارت کی بو ہے، اور اگر تم نے اپنے یہ انداز نہ چھوڑے تو تمہیں کھدّر کے کپڑے پہنوا دوں گا"۔ میرے لیے بارہ آنے سے زائد قمیص کا کپڑا خریدنا یا آٹھ روپے سے زائد کے بوٹ خریدنا جرم تھا۔ جس کی سزا کافی کڑی تھی۔ ویسے انھیں اگر کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں آج پلنگ پر سونے کے بجائے فرش پر سویا ہوں تو بڑے خوش ہوا کرتے۔ اپنی زندگی میں صرف ایک بار انھوں نے مجھے بائسکوپ دیکھنے کی اجازت دی۔ وہ ایک انگریزی فلم تھی جس میں نپولین کا عشق دکھایا گیا تھا۔ مگر مجھے یاد ہے کہ ابّا جان کو یہ نہ بتایا گیا بلکہ کہا گیا کہ اس فلم میں نپولین کے حالات زندگی ہیں"۔

اقبال حد درجہ غریب اور تنگ دست تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے فرو ہونے کے بعد بابا صالح (جو کشمیری برہمن تھے اور سترہویں صدی میں مشرف بہ اسلام ہوئے) کی اولاد کشمیر کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بیشمار کشمیری خاندانوں کی طرح ہجرت کر کے سیالکوٹ میں مقیم ہو گئی۔ پہلے پہل اقبال کے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک کا نام شیخ نور محمد (والد اقبال) اور دوسرے شیخ غلام قادر جو نہر کے محکمے میں ملازم تھے۔ اقبال کے والد بہت کس مپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ ان دنوں سیالکوٹ میں ایک ڈپٹی کلکٹر وزیر علی بلگرامی ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے ترس کھا کر شیخ نور محمد کو اپنے یہاں پارچہ دوزی پر ملازم رکھا اور ایک سنگر مشین منگوا دی جو اس زمانہ میں نادر چیز تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد شیخ نور محمد نے یہ ملازمت ترک کر دی اور برقعوں کی

ٹوپیاں سینے لگے۔ ان کے یہاں دو لڑکے ہوئے۔ بڑے کا نام شیخ عطا محمد اور چھوٹے شیخ محمد اقبال (یعنی علامہ اقبال) برادر بزرگ نے معمولی سی تعلیم پائی مگر جب ان کی شادی راٹھوروں کے خاندان میں ہوئی جہاں زیادہ تر فوجی پنشنر تھے تو ان لوگوں نے شیخ عطا محمد کو فوج میں بھرتی کرادیا۔ بعد میں ملازمت ترک کرکے انھوں نے رُڑکی انجینئرنگ اسکول سے امتحان پاس کیا اور ایم۔ ای۔ ایس میں اوورسیر ہوگئے۔ اقبال نے سیالکوٹ کے اسکاچ مشن اسکول سے ۱۸۹۵ء میں انٹرمیڈیٹ کیا اور اسی سال لاہور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے پاس کیا۔ پھر اقبال اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں ۱۹۰۵ء میں تین سال کے لیے یورپ گئے جہاں انھوں نے کیمبرج سے ایم۔ اے میونخ (جرمنی) سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور لندن سے بیرسٹری کی ڈگریاں لیں۔ اقبال کا بچپن سے لے کر ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس آنے تک سارا تعلیمی خرچ ان برادر بزرگ نے پورا کیا۔ اسی لیے اقبال نے "بانگِ درا" کی نظم "التجائے مسافر" میں اپنے برادر بزرگ کو "یوسف ثانی" کے لقب سے نوازتے ہوئے سورہ یوسف ۱۲ کے رکوع ۸ اور ۹ کی تلمیح کی ہے جس سے اُن کی مراد یہ ہے کہ میرے برادر بزرگ نے مجھے اسی طرح مدد کی جس طرح جب حضرت یوسفؑ مصر میں با اقتدار ہوگئے تو مصر میں قحط پڑنے پر اپنے بھائیوں کی مدد غلّہ سے کی تھی۔ یہ ساری باتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ چونکہ اقبال نے تیئس سال کی عمر تک (یعنی یورپ سے واپس آکر ۱۹۰۸ء میں وکالت شروع کرنے تک) انتہائی مالی پریشانیوں اور کسمپرسی کی زندگی گزاری اس لیے قناعت اور توکل ان کی فطرت ثانیہ بن گئی اور اس کے بعد کی ساری زندگی کا طریق فقیرانہ رہا اور اسی لیے "بانگِ درا" کے بعد کے سارے مجموعوں میں فقر فقیری مردِ فقیر، فقیر وغیرہ کی اصلاحیں لاتعداد بار ان کی غزلوں اور نظموں میں ملتی ہیں۔

اقبال بیرسٹر تھے اور ان کا واحد ذریعہ معاش وکالت تھا جس پیشہ سے وہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۴ء تک منسلک رہے حالانکہ ان کا انتقال اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ آخری سالوں میں انھوں نے اپنی علالت کی وجہ سے وکالت چھوڑ دی تھی اور نواب بھوپال کے ماہانہ وظیفہ پر زندگی کے باقی سال گزارتے رہے۔ بحیثیت وکیل اقبال کی ماہانہ آمدنی کبھی ایک ہزار روپئے

سے زیادہ نہیں بڑھی۔ ملازموں کی تنخواہ، مکان کا کرایہ وغیرہ نکال کر سات سو روپئے ان کے پاس بچ رہتے تھے جس میں سے کچھ رقم والدین کو سیالکوٹ بھیجا کرتے تھے اور باقی سے اپنا خرچ چلاتے تھے وکالت سے وہ کچھ زیادہ رقم پس انداز نہ کر سکے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مقدمے ہی اتنے لیتے تھے جن کی آمدنی سے گھر کا خرچ پورا ہو جائے۔ چنانچہ وہ ہر مہینے کی دس تاریخ کے بعد کوئی مقدمہ نہ لیتے اور اگر کوئی موکل اصرار کرتا تو اسے اپنے کسی دوست کا پتہ بتا دیتے اور اگر اس پر بھی وہ نہ ٹلتا تو اسے اگلے مہینوں کی پہلی تاریخوں میں آنے کا مشورہ دیتے۔ اگر کوئی مقدمہ جھوٹا یا کمزور ہوتا تو اسے ہاتھوں میں لینے سے صاف انکار کر دیتے۔ ایک دفعہ ایک شخص آپ کے سامنے ایک مقدمہ لایا جس کے بارے میں علامہ کا خیال تھا کہ بالکل بے جان ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس مقدمہ کی پیروی کرنے سے معذرت کا اظہار کیا۔ لیکن موکل اپنی ضد پر اڑا رہا اور کہنے لگا کہ اس مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں مجھ سے منہ مانگی فیس وصول کریں۔ اگر میں مقدمہ ہار بھی گیا تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوگا۔ آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس سنہری موقع سے خوب فائدہ اٹھاتا۔ لیکن آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حرام کمائی کا قائل نہیں ہوں۔ جب بے حد اصرار پر بھی علامہ راضی نہ ہوئے تو وہ خفا ہو کر واپس چلا گیا۔

علامہ کی فقیرانہ زندگی پر ان کے معاصر اور ایک ہی شہر لاہور کے رہنے والے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب "اقبالیات" میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ان (علامہ) کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات کے بعد ہی لوگوں میں شائع ہوئے ورنہ عام خیال یہی تھا کہ جیسے اور "سر صاحبان" ہوتے ہیں ویسے وہ بھی ہوں گے۔ (اقبال کو حکومت برطانیہ کی طرف سے یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو سر کا خطاب عطا ہوا تھا جس کی بنا پر لوگ انھیں ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال کہا کرتے تھے) لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجیے جس سے اس نائٹ (یعنی سر) اور بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ لگا سکیں گے۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لیے اقبال اور سر فضل حسین اور ایک

اور قانون داں صاحب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شان دار کوٹھی میں اُن کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معًا ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاکؐ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اس نے بوریے پر سو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم (علی بخش) کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے۔ غسل خانے میں ہی سوتے رہے ——— ۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔ جب باہر کی دنیا اُن کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی تو کسی کو خبر نہ ہوتی تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے اس کی اصلی شخصیت کیا ہے؟ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو سیاسی اغراض کے لیے سادگی و فقر کا اشتہار دیتے ہیں اور سوشلسٹ بن کر غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر ان کی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہے"

اقبال کی آواز ۱۹۳۴ء میں بیٹھ گئی تھی۔ حکیم نابینا کے علاج سے ان کی جسمانی صحت تو اچھی ہو گئی مگر گلے کی تکلیف بدستور موجود رہی۔ حیدر آباد کے مشہور ادیب ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے مشورہ پر علامہ بجلی کے علاج کے لیے ۳۱ر جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال پہنچے۔ سر راس مسعود (سر سیّد کے پوتے) نے انھیں اس الٹرا وائیلٹ (بنفشی شعاعوں) کے غسل کی دعوت دی تھی۔ جو ان دنوں ریاست بھوپال کے وزیر تعلیم تھے۔ نواب صاحب نے بڑی کوشش کی کہ علامہ شاہی مہمان خانے میں قیام کریں۔ مگر علامہ نے یہ کہہ کر معذرت پیش کی کہ وہ سر راس مسعود کی دعوت پر آئے ہیں لہٰذا ان ہی کے پاس ٹھہرنا مناسب ہے۔ چنانچہ سر راس مسعود نے انھیں "ریاض منزل" میں ٹھہرایا۔ قیام بھوپال کے دوران نواب صاحب کے ملٹری سکریٹری کرنل محمد خاں ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے تاکہ انھیں بھوپال میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ چنانچہ جب

انھوں نے کوئی خدمت سرانجام دینے کے متعلق علامہ سے استفسار کیا تو علامہ نے جواب دیا۔

"میرا کھانا سادہ ہونا چاہیئے۔ میں ڈائننگ روم میں کھانے کا عادی نہیں۔ اس لیے اگر میں ڈائننگ ہال میں نہ آسکوں تو برا نہ مانیے۔ مجھے جس وقت بھی بھوک لگے گی کھالوں گا۔"

کرنل محمد خاں بیان کرتے ہیں کہ جب کھانے کے بعد وہ علامہ کا کمرہ دیکھنے گئے تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ وہ بستر جو راس مسعود نے اپنے معزز مہمان کے لیے بچھوایا تھا، ان کے خدمتگار علی بخش نے اٹھا دیا تھا اور اس کی جگہ علامہ کا سادہ بستر لگا دیا تھا۔ پہلے تو وہ علی بخش پر ناراض ہوئے مگر جب اس نے کہا کہ علامہ جہاں بھی جاتے ہیں اپنا سادہ بستر ساتھ لے جاتے ہیں اور ان کا قیام کہیں بھی ہو وہ اپنے ہی بستر پر سوتے ہیں۔ علامہ کا قیام ایک ماہ سات دن رہا۔

علامہ کا یہ دوسرا دورۂ بھوپال تھا۔ اس کے قبل وہ نواب بھوپال کی دعوت پر مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ ۹ رمئی ۱۹۳۱ء کو بھوپال گئے تھے۔ تیسری بار پھر علاج کے سلسلہ میں وہ ۱۷ رجولائی سے ۲۸ راگست ۱۹۳۵ء تک بھوپال میں مقیم رہے اور چوتھی بار وہ ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو بھوپال گئے اور اس دفعہ شاہی مہمان کی حیثیت سے "شیش محل" میں ٹھہرائے گئے۔

علامہ ۱۹۱۵ء میں ریاست حیدرآباد گئے جہاں انھیں یونیورسٹی میں تین لکچر دینے تھے۔ اس کے قبل وہ ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد جا چکے تھے جہاں وہ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد اور سر اکبر حیدری کی صحبتوں سے مستفید ہو چکے تھے۔ ۱۸ رجنوری کو آپ کی ملاقات نظام حیدرآباد سے ہوئی۔ نظام کے دربار میں حاضر ہونے والوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ "آصف جاہی" دستار اور بکلس لگائیں۔ لیکن علامہ اقبال کو ان رسمی معمولات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ جب اس سفر سے علامہ واپس ہونے لگے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد بنفس نفیس رخصت کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر آئے۔ وہ کچھ تحائف علامہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں یہ ڈر بھی تھا کہ علامہ کی خوددار طبیعت اسے

قبول نہیں کرے گی۔ اس کی ترکیب انھوں نے یہ نکالی کہ وہ دیر تک علامہ سے گفتگو کرتے رہے۔ جب گاڑی روانہ ہونے لگی تو انھوں نے فوراً سب تحائف علامہ کے ڈبے میں رکھوانے شروع کر دیئے۔ علامہ نے اپنی عادت کے مطابق ان تحائف کو واپس کرنے کے لیے کافی کوشش کی مگر مہاراجہ نے سلام کرتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ یہ میری طرف سے حقیر تحفے ہیں، انھیں قبول فرمالیجئے اور خود وہاں سے کھسک گئے، اتنے میں گاڑی بھی اسٹیشن سے باہر نکل چکی تھی۔

افغانستان میں جب بچہ سقہ نے ۱۹۲۹ء میں امان اللہ خاں نیازی کو تخت سے دستبردار کر دیا تھا تو ان کے چچازاد بھائی نادر شاہ اس زمانہ میں پیرس میں مقیم تھے۔ افغانستان کو مزید تباہی سے بچانے کے لیے وہ لاہور کے راستے افغانستان گئے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر نادر شاہ کے استقبال کے لیے اقبال بھی موجود تھے۔ گاڑی کی روانگی سے قبل اقبال نے نادر شاہ کو علاحدگی میں لے جاکر کہا:۔

"تم ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو۔ میں ایک فقیر آدمی ہوں۔ صرف دعاؤں ہی سے تمہاری خدمت کر سکتا ہوں۔ اس وقت میرے پاس پانچ ہزار روپئے موجود ہیں۔ اگر یہ حقیر سی رقم تمہارے کسی کام آسکے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

نادر خاں نے جو چشم پر آب تھے، فقیر کے اس دین کو نیک شگون سمجھتے ہوئے بڑے احترام سے قبول کر لیا۔ نادر خاں اسی سال تخت نشین ہوا تو اس نے ملک میں تعلیمی اصلاحات کا خاکہ تیار کرنے کے لیے علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو کابل بلایا۔ یہ بات اکتوبر ۱۹۳۳ء کی ہے۔ اس وفد کی ملاقات کابل میں "قصر دلکشا" میں ہوئی۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت اقبال نے نادر شاہ کے لیے قرآن مجید کا ایک نسخہ رکھ لیا تھا۔ قرآن مجید کا یہ نسخہ پیش کرتے ہوئے علامہ نے شاہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"اہلِ حق کی یہی دولت و ثروت ہے۔ اسی کے باطن میں حیات مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتدا کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اسی کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب

اسی کا فیضان ہے۔"

اقبال کے ہاتھوں قرآن مجید کا نسخہ وصول کرتے ہوئے نادر شاہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جواب میں اس نے کہا:۔

"جب میں جلاوطن تھا اور کوہ و صحرا میں غم زدہ وقت کاٹ رہا تھا، جب میرے پاس زندگی کے وسائل کی کمی تھی اور مادی طاقت کا فقدان تھا جب میرا کوئی ساتھی اور غمخوار نہ تھا تو یہی کتاب میری رفیق و رہنما اور ہمدرد و غم گسار تھی۔"

پہلی ملاقات میں مغرب کی نماز کے موقع پر نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی تو علامہ نے کہا:۔

"نادر شاہ، میں نے اپنی عمر کسی عادل بادشاہ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گذاری ہے۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کو پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے ہیں، تو کیا تو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا۔ امامت تجھ ہی کو کرنی پڑے گی۔"

محمد نادر خاں نے ابتدائی تعلیم ملٹری کالج دہرہ دون (یو۔پی) میں پائی تھی۔ بعد ازاں مزید فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان گئے اور امیر امان اللہ خاں کے عہد میں افغانی فوج کے سپہ سالار مقرر ہو گئے۔ بعد میں امان اللہ خاں سے کچھ اختلاف ہونے پر انھیں فرانس میں سفیر مملکت مقرر کر کے بھیج دیا گیا۔ جہاں سے واپس آکر وہ ۱۹۲۹ء میں تخت نشین ہوئے مگر انھیں ۱۹۳۳ء میں قتل کر دیا گیا اور ان کی جگہ محمد ظاہر شاہ نے لی جنھیں جولائی ۱۹۷۳ء میں ان کے بہنوئی وزیر اعظم محمد داؤد نے تخت سے دستبردار کر کے جلاوطن کر دیا اور وہ اس وقت سے روم میں جلاوطنی کے دن گزار رہے ہیں۔

اقبال نادر شاہ کی اسلام دوستی سے حد درجہ متاثر تھے۔ چنانچہ ان کے قتل پر اقبال نے "نادر شاہ افغان" نظم لکھی جو ان کے مجموعۂ کلام "بال جبریل" میں شامل ہے۔ علامہ نے

"مسافر" میں بھی نادر شاہ کی سیرت کے اس پہلو کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

گفت نادر در جہاں بیچارہ بود از غم دین و وطن آوارہ بود
غیر قرآں غمگسار من نہ بود قوتش ہر باب را بر من کشود
گفتگوئے خسرو والا نژاد
باز با من جذبہ سر شار او

اقبال کے آخری ایام حد درجہ مالی کسمپرسی میں گذرے مگر انھوں نے قناعت اور توکل کو نہ چھوڑا۔ ۱۹۳۴ء سے مستقل طور پر بیمار رہنے کی وجہ سے اور پھر اپنی بیگم کی علالت نے ان کی پریشانیوں کو بڑھا دیا تھا۔ وکالت کی آمدنی بہت گھٹ گئی اور گذر اوقات مشکل سے ہونے لگی۔ ان کی بیگم کا علاج دہلی کے حکیم نابینا کا خط و کتابت کے ذریعہ ہو رہا تھا۔ علامہ کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ حکیم صاحب کو لاہور بلائیں اور بیگم دہلی جانے سے معذور تھیں۔ چنانچہ نذیر نیازی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک روز کے لیے حکیم صاحب قبلہ لاہور تشریف لائیں۔ مجھے معلوم نہیں، ان کی فیس کیا ہے؟ اگر وہ کچھ کم فیس قبول کر لیں تو میں ان کی عنایت کا بہت شکر گذار ہوں گا۔ ایک سال سے زیادہ مدت ہوئی ہے کہ میں اپنی علالت کی وجہ سے کچھ کام نہ کر سکا۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے ہیں۔ تاہم جہاں تک ممکن ہو سکے گا میں حکیم صاحب کے سفر کا بار اٹھانے کو حاضر ہوں۔"

علامہ کی بیگم کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا ابھی اقبال کو تین سال اور زندہ رہنا تھا۔ ان کی اولاد جاوید اقبال اور منیرہ بہت ہی چھوٹے تھے۔ گھر میں ان کی دیکھ بھال کو سوا ملازم علی بخش کے کوئی نہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی مساعی سے ایک جرمن خاتون استانی کی طرح رکھی گئی۔ ان سارے اخراجات کو پورا کرنا بہت مشکل تھا۔ علامہ کے دوست سر راس مسعود آپ کی مالی پریشانیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ ان ہی کی کوششوں سے نواب بھوپال کی طرف سے پانچ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ علامہ کی خود دارانہ اور فقیرانہ زندگی نے اس وظیفہ کو لینے میں تامل کیا۔ مگر جب نواب صاحب بھوپال نے یقین دلایا کہ یہ ریاست کی طرف سے نہیں بلکہ

ایک مخلص دوست کے اظہارِ عقیدت کے طور پر ہے تو آپ نے اسے قبول کر لیا اور سر راس مسعود کو لکھا:۔

"اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ انھوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔"

اس کے بعد سر راس مسعود نے کوشش کی کہ سر آغا خان بھی پانچ سو روپئے ماہانہ کی رقم دینے پر آمادہ ہو جائیں تاکہ علامہ اپنی باقی زندگی آرام سے گزار سکیں۔ ان کی کوششوں سے یہ وظیفہ بھی منظور ہو گیا۔ مگر جب علامہ کو پتہ چلا تو انھوں نے سر راس مسعود کو اس پیش کش کو نامنظور کرتے ہوئے لکھا:۔

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور اگر کافی نہ ہو تو بھی میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا، روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔"

انہی ایام میں دولت آصفیہ، حیدرآباد کے مدار المہام سر اکبر حیدری نے ایک ہزار روپیہ کا چیک علامہ کو بھیجا جس کے ساتھ ایک خط بھی تھا جس میں سر اکبر حیدری کی طرف سے لکھا تھا:۔

"یہ رقم شاہی توشے خانے سے ہے۔ جس کا انتظام میرے ذمے ہے۔ بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے۔"

"جس کا انتظام میرے ذمے ہے" کے الفاظ علامہ کی خوددار طبیعت کے لیے تازیانے سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئے۔ چنانچہ آپ نے یہ کہہ کر کہ شاید آپ لوگوں نے مجھے نہیں سمجھا،

یہ رقم واپس کردی۔ اس واقعہ سے متأثر ہو کر علاّمہ نے ایک نظم "سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدرآباد دکن کے نام" لکھی جو ان کے مجموعۂ کلام "ارمغان حجاز" میں شامل ہے، جس نظم کا آخری شعر ہے ؎

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

علاّمہ کی فقیرانہ زندگی کی ایک جھلک اس وصیت نامہ میں ملتی ہے جو انھوں نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو لکھا تھا جس میں اپنی ساری کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کو اور مسودات جاوید اقبال کو دینے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"باقی میرا اسباب مثلاً دو قالین برنگ سُرخ و دری، صوفہ و کرسیاں، بکس اور پہننے کے کپڑے، ان کی نسبت میری وصیت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد میرے پہننے کے تمام کپڑے عزیزاں میں تقسیم کر دیئے جائیں"

اقبال ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۴ء تک لاہور میں کرایہ کے مکان میں رہے۔ انھوں نے میو روڈ میں ایک مکان بنایا جس میں وہ ۱۹۳۵ء منتقل ہو گئے۔ پیسہ کی کمی کی وجہ سے یہ مکان کچھ ایسا بنا کہ ایک دو سال کے اندر خستہ ہو گیا۔ علاّمہ کا گھریلو خرچ تو نواب بھوپال کے وظیفہ پر چل رہا تھا مکان کی مرمت کا پیسہ کہاں سے لاتے۔ انہی سالوں میں مشہور شاعر احسان دانش کا میو روڈ سے گزر ہوا اور انہی دنوں اس مکان کی خستہ حالی پر انھوں نے ایک نظم زیر عنوان "ڈاکٹر اقبال کی کوٹھی" لکھی جس میں ہم علاّمہ کی فقیرانہ زندگی کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ چند اشعار یہ ہیں:۔

سنسان سی دہلیز تھی چپ چاپ سے کمرے — جیسے کبھی اوّل سے سجایا نہ سنوارا
دالان کے زینوں میں تھا برسات کا پانی — اینٹوں کے پلستر کے شگافوں سے نظارا
حیراں تھا کہ ہوتا ہے ضیا بار یہاں سے — تہذیب کے گردوں کا درخشندہ ستارا
ہے جس کی نظر شعلۂ مستور کی شاہد — ہر موجِ نفس جلوۂ سینا کا شرارا
حل کرتا ہے راتوں کو ستاروں کے معمّے — ہے عرش بریں جس کے تخیل کا کنارا

ہر لفظ ہے مستقبل زرّیں کا پیامی ہر بات میں بیداریٔ مسلم کا اشارا
اللہ کی قدرت کا تماشا تھا نظر میں
اقبال کا اور ایسے مکاں میں ہو گذارا

ڈاکٹر سید غیاث الدین

اقبالؒ کی جمالیاتی حسیت

رابطہ ادب اسلامی کے اس سمینار کی مناسبت سے میں سعید جعفری کے ان الفاظ کو اپنے مقالہ کی تمہید کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ "جس وقت ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ لکھی جائے گی اس وقت اقبالؒ کی اہمیت کا لوگوں کو صحیح اندازہ ہوگا۔"

اقبال کی شان وعظمت کے بیان کے لیے یہی کافی ہے کہ داغ، حالی، شبلی، امیر مینائی اکبر الہ آبادی جیسے اساتذۂ فن واساطین زبان کی موجودگی میں اقبال پر تنقیدی تحریروں کا سلسلہ بہت جلد شروع ہوگیا تھا حالانکہ وہ نہ صرف ان بزرگوں کے مقابلہ میں نہایت جونیئر شاعر تھے بلکہ ان کے شاگردوں کی صف میں تھے۔ داغ کے تو وہ باضابطہ شاگرد بھی تھے۔

تنقیدی حیثیت سے اقبال پر جتنا لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے یہ کسی اور کے نصیب میں کم آیا ہے بلکہ یوں کہیئے کہ نہیں آیا ہے۔ یہ تنقیدی آثار علم وادب کا بڑا سرمایہ ہیں اقبالیات اقبال کے فلسفہ وادب کا مجموعہ ہے لیکن بہرحال فلسفہ غالب ہے جو ان کے فلسفہ کے دلدادہ ہوئے۔ انھیں زبان وبیان کی طرف خاطر خواہ توجہ کا موقعہ نہ ملا یا وہ ایسا کرنے سے قاصر رہے اور جو ان کی مخالفت پر اتر آئے وہ اس میدان میں تو زچ ہوگئے۔ اور عاجز آکر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر زبان وبیان کی خامیاں نکالیں اور اپنی تسکین کا سامان خود ہی فراہم کرلیا۔ ان حضرات کا جواب ہم اقبال ہی کے ایک مکالمہ سے دیتے ہیں جس کو خلیفہ عبدالحکیم نے اپنے مقالے۔ اقبال۔ حالات اور شاعری میں نقل کیا ہے۔

" ایک ایرانی نے کہا کہ غالب ہندوستان میں فارسی کا بڑا شاعر مشہور ہے۔

لیکن ہمیں تو وہ اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں معلوم ہوتا۔ اقبالؔ نے کہا غالبؔ کا یہی کمال ہے کہ ایرانی کی سمجھ میں نہ آئے" (۲)

پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ نے بہت پہلے "اقبالؔ کی منظر نگاری" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا تھا، جو "ہمایوں" مئی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا پھر اس کو ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مجموعہ "اقبالیات کے نقوش" (۳) میں شامل کر کے اقبالؔ صدی کے موقع پر اقبالؔ اکادمی پاکستان سے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ اس مقالہ میں آزادؔ نے اقبالؔ کی منظر نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

" اردو کی موجودہ اصلاح یافتہ شاعری جس کی داغ بیل حالیؔ اور آزادؔ نے ڈالی تھی اقبال کے میدان عمل میں آنے سے پہلے مروّج اور مقبول ہو چکی تھی۔ اس شاعری کا جزو اعظم منظر نگاری تھا۔ ان کے ہمعصروں اور مقلدوں نے منظر نگاری میں خوب رنگ آمیزیاں کیں بعض شعراء نے اسی صنعت شاعری کو اپنا خاص مضمون بنالیا۔ بعض نے ملکی اور ملّی مضامین میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے منظر نگاری کو ذریعۂ امداد کے طور پر استعمال کیا اقبالؔ کا تعلق صریحی طور پر دوسرے طبقہ سے ہے۔ چنانچہ کلام اقبالؔ میں جابجا منظر نگاری کو واردات قلب، جذبات ملّت اور نکات فلسفہ وغیرہ کو دلکش اور مؤثر بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے، ان کی اولین نظموں میں "کوہ ہمالیہ" کے دوسرے ہی بند سے اس حقیقت کا ثبوت مل جاتا ہے کہ وہ ہمالیہ پر ایک بیانیہ نظم نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ ان کا اصل موضوع اس عنوان کے پردہ میں "حب وطن" ہے۔"

اس مقام پر آزادؔ نے مثال کے طور پر نظم "ہمالیہ" کا یہ بند نقل کیا ہے ؎

لیلیٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلف رسا — دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہوا۔
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

میں اس مقام پر اس بند کے ماقبل دو بندوں کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں ؎

جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی — جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبان برگ سے گویا ہے اس کی خامشی — دست گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنج خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

آخر الذکر بند کے مضمون کو شاعر اور مقامات پر بھی بیان کرتا ہے اور قاری پر کچھ اور کیفیتیں طاری کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "ایک آرزو میں" گویا ہے ؎

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو یہ دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزا — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی — جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

"فلسفۂ غم" کے یہ اشعار خاص طور پر لائق توجہ ہیں ؎

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی — آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اسکا صورت رخسار حور — گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اسکے گوہر پیارے پیارے بن گئے — یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی — مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے — دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہر روانِ زندگی گر کے رفعت سے ہجوم نوعِ انساں بن گئی
پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

اسی طرح نظم "شاعر" کے یہ اشعار ؎

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے پی کے شراب لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مست مئے خرام کا سن تو ذرا پیام تو زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دختر خوشخرام ابر کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے
جام شراب کوہ کے خمکدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے

اور طویل نظم "طلوع اسلام" میں فارسی کا یہ شعر ؎

کشید ابر بہاراں خیمہ اندر وادیٔ و صحرا صدائے آبشاراں از دراز کوہسار آمد

"ساقی نامہ" میں یہ مضمون انتہائی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

اقبال کی یہ منظر نگاری ان کی اس جمالیاتی حسیت کی آئینہ دار ہے جو قدرت نے ان کی ہستی میں ودیعت کی تھی جس نے بتمام و کمال شاعر کو وہ قدرت بخشی کہ وہ مناظر فطرت کے آئینہ میں اپنی گوناگوں اندرونی کیفیات کا پرتو دیکھ سکے اور اپنی شاعری کے پیکر میں ڈھال سکے۔ اقبال کے یہاں حسن و قبح کا معیار یہ ہے کہ اچھی چیز وہ ہے جو انسان میں قوت و بیداری پیدا کرے اور بری وہ ہے جو اسے کمزور کر دے اور خوابیدہ بنا دے۔ وہ جدید آرٹ سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اس سے

چست و چالاک شیروں پر بھی نیند طاری ہو جاتی ہے۔

اقبال حسن و جمال کی جستجو میں کسی سے پیچھے نہیں رہے ہاں معیارِ حسن کی بلندیوں میں وہ بہتوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ فطرت نے اپنے مناظر میں کچھ ڈھونڈھ نکالنا ان کو بچپن ہی میں سکھا دیا تھا۔ اپنے عہدِ طفلی کا بیان وہ اس طرح کرتے ہیں ؎

تکتے رہنا ہائے! وہ پہروں تلک سوئے قمر — وہ پھٹے بادل میں بے آواز پا اس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ و صحرا کی خبر — اور وہ حیرت دروغ مصلحت آمیز پر
آنکھ وقفِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا — دل نہ تھا تیرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

اقبال علیہ الرحمہ نے اپنے اردو کلام میں سو سے زائد مقامات پر "پھول" کا مضمون باندھا ہے اور ہر مقام پر بیان و معانی کی کیفیات مختلف ہیں جن میں یکسانیت بھی ہے اور روانی بھی ہے ایک مختصر مقالہ میں ان تمام مقامات کا احاطہ ممکن نہیں، یہاں منفرد نوعیت کی چند مثالوں پر اکتفا کی جا سکتی ہے ؎

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آتی نہیں — اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا — ساغر ذرا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے — رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر — اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی، درختوں کی ہری — تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری

پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہو کر — چٹک او غنچۂ گل تو مؤذن ہے گلستاں کا

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود — گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز بست و بود

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی مہک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ — شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگیں اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زرّیں اپنا
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینۂ شبگانی کے مزے لیتی ہے

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے آب گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

وداع غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصلِ بہاری یہی ہے بادِ مراد

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو
پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دل سوز
کہ سازگار نہیں یہ جہان گندم و جو
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

عشق و مستی نے کیا ضبط نفس مجھ پہ حرام کہ گرہ غنچہ کی کھلتی نہیں بے موج نسیم

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹے میں ہے خوئے دل آویزی

موازنہ مقصود نہیں پھر بھی یاد آتا ہے کہ میر انیس نے کہا تھا ؎

اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

اقبال کی مضمون آفرینی ہر طرح کے تکلف و آورد سے خالی ہے۔ اقبال کے اندر کا شاعر اپنی اس نگاہ سے کام لیتا ہے جو نہ محض سرخ و زرد رنگ دیکھ کر رہ جاتی ہے اور نہ ہی اپنی پلشن کے لیے مہر و ماہ کی محتاج رہتی ہے جو اندھیروں میں اجالے پیدا کرتی ہے جس کو خواب کے پردہ میں موت کی بیداری نظر آتی ہے۔ اور جو ظاہر کو باطن کی خوبیوں سے سنوار کر اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہے اور سامان نظر کے ساتھ سامان قلب و جگر بھی فراہم کرتی ہے۔ شاعر ایسی نگاہ کو "بہائے نظارہ" قرار دیتا ہے اور کہتا ہے۔ ؎

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں

کہ بیچینی نہیں فطرت جمال و زیبائی

اور جب اس نگاہ سے اس کو کچھ نظر آتا ہے تو یوں گویا ہوتا ہے ؎

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی وہ چاند یہ تارا ہے، وہ پتھر، یہ نگیں ہے

دیتی ہے مری چشم بصیرت بھی یہ فتویٰ وہ کوہ، یہ دریا، وہ گردوں، یہ زمیں ہے

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے، نہیں ہے

پھر وہ جلال و جمال کو یکجا کر دیتا ہے اور اس کا بیان یوں کرتا ہے ؎

اسی نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر ترا نفس ہے۔ اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اسی لیے اقبال کی منظر نگاری ایک عجیب کیف سے سرشار کرتی ہے اور شاعر کی جمالیاتی حسیت کے ساتھ ساتھ اس حقیقی معرفت و آگہی کا پتہ دیتی ہے جو شاعر کو ہر دم بیقرار رکھتی

ہے اور کہلاتی ہے ۔ ؎

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتش کدے ہزار
یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے گل میں مہک، شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے آگہی
اصل کشاکش من و تو ہے آگہی

فراق کی خوبی بیان کی جاتی ہے کہ ان کی شاعری زندگی سے بہت قریب ہے رسوئی میں کنگھی کی کھنک ان سے شعر کہلا لیتی ہے، لیکن اس کی کھنک سے زبان کی چاشنی تو حاصل ہوتی ہے مگر نہ دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہے اور نہ کسک بیدار ہوتی ہے اس کے برخلاف اقبال کے یہاں زبان کی چاشنی کا لطف بھی ہے اور اس کے ساتھ معانی کی گہرائی کا کیف بھی چنانچہ سوپ اور چھلنی کی روایتی چشمک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسولینی کے حوالے سے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں ۔ ؎

میں پھٹکناں ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں ہیں سبھی تہذیب کے اوزار، تو چھلنی میں چھاج

اسی طرح نظم ابر کوہسار میں ناولوں کی کنگھی، اور گانوں کے استعارے ملاحظہ ہوں ؎

بن کے گیسوئے رخ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں شانۂ موجۂ مرمر سے گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں بالیاں نہر کی گرداب کو پہناتا ہوں

اقبال کی جمالیاتی حسیت بلاشبہ آفاقی ہے لیکن فطرت بشری سے بے پروا نہیں ہے یعنی نہ ایسی افراط کہ شاعر خود کو بشریت سے ماورا سمجھتے ہوئے رشتہ و پیوند سے بے نیاز ہو کر اپنوں پرایوں سے پرے ہو جائے اور نہ ایسی تفریط ہے کہ رشتہ و پیوند میں گم ہو کر مقام عبدیت سے غافل ہو جائے اس حقیقت کو وہ خود اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

حسن نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

حسن نسوانی جو انسانی فطرت کا تقاضا بھی ہے اور کمزوری بھی لیکن بہر حال اقبال اسے متاع بازار قرار دینے سے نہ صرف بیزار ہیں بلکہ برہم ہیں اس حسن کو چراغ خانہ کی صورت میں

جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں اسی لیے برملا دعوی کرتے ہیں ۔ ؎

نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

اور پھر ان کی طبیعت جو یا اس حسن کو اس کے حقیقی مقام پر ڈھونڈھ نکالتی ہے اور "صبح کا ستارہ" میں یوں گویا ہوتی ہے ؎

کسی پیشانی کے افشاں کے ستاروں میں رہوں
کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں رہوں

اشک بن کر سر مژگاں سے اٹک جاؤں میں
کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں

جس کا شوہر ہو رواں ہو کے ذرہ میں مستور
سوئے میدانِ وغا حب وطن سے مجبور

یاس و امید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو
جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرماتی ہو۔

جس کو شوہر کی رضا تاب شکیبائی دے
اور نگاہوں کو حیا طاقتِ گویائی دے

زرار رخصت کی گھڑی عارض گلگوں ہو جائے
کشش حسن غم ہجر سے افزوں ہو جائے

لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں
ساغر دیدۂ پرنم سے چھلک ہی جاؤں

حواشی

۱۔ سعید جعفری : اقبال کی نگاہ میں عورت کی حیثیت (مقالہ) } مشمولہ کتاب "اقبالیات کے نقوش" از: ڈاکٹر سلیم اختر اقبال اکاڈمی لاہور ۱۹۷۷ء

۲۔ خلیفہ عبدالحکیم : اقبال۔ حالات اور شاعری (〃)

۳۔ جگن ناتھ آزاد : اقبال کی منظر نگاری (〃)

پروفیسر وقار احمد رضوی

(دوسری اور آخری قسط)

امیر الشعراء احمد شوقی بک کی عربی منظومات کے

اردو نثری تراجم

احمد شوقی بک شاعر نیل کے لقب سے مشہور ہیں اور وہ بلا مقابلہ مصر کے تمام شعراء کے امیر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں مغربی خیالات کا اظہار ہے جو ان پر فرانسیسی لٹریچر کے مطالعہ کا اثر ہے۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یعنی مدح کے وقت مدح اور مرثیہ کے موقع پر درد و غم کا اظہار کرتے ہیں شوقی قاہرہ میں ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی و ثانوی تعلیم حاصل کی۔ شیخ صالح کے مدرسہ میں چار برس کی عمر میں داخل ہوئے پھر کئی مدرسوں میں منتقل ہوئے۔ یہاں تک کہ مصر کے کالج سے ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۸۷ء میں خدیو توفیق بن اسمٰعیل کے خرچ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس گئے۔ وہاں دو سال تک قانون کی تعلیم حاصل کی۔ اس دوران انہوں نے انگلستان اور الجزائر کی بھی سیر کی۔ ابھی قانون کی تعلیم کا تیسرا سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ بیمار پڑ گئے جس کے علاج کے لیے الجزائر گئے۔ صحت یاب ہونے کے بعد پھر پیرس آئے اور قانون کی تعلیم کا تیسرا سال مکمل کیا۔ پیرس میں قیام کے دوران انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی افکار کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور ابن الرومی کی طرح ان خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں کیا۔ شوقی، صاحب ثروت و امارت تھے۔ ۱۸۹۶ میں حکومت مصر کی طرف سے مستشرقین کی کانفرنس منعقدہ جنیوا میں نمائندہ بنا کر بھیجے گئے۔ پھر وہ خدیو مصر کے انگریزی ترجمان کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن جب حکومت برطانیہ نے خدیو مصر کو معزول کر دیا تو یہ اس عہدے سے سبکدوش

ہو گئے۔ پھر جب سلطنت برطانیہ نے ان کو جلاوطن ہونے کا حکم دیا تو یہ اسپین چلے گئے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک کا زمانہ ان کی جلاوطنی کا ہے۔ اس جلاوطنی کی وجہ سے ان کے دل میں قوم و وطن کا جذبہ شدت اختیار کر گیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب مصر کا سیاسی مطلع صاف ہوا اور حالات درست ہوئے تو وہ پھر مصر لوٹ آئے۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک کا دور شوقی کی ادبی زندگی کے عروج کا زمانہ ہے وہ حافظ ابراہیم کے ہم پلہ شاعر مانے جاتے تھے۔ اور جب ۱۹۳۲ء میں حافظ ابراہیم کا انتقال ہوا تو انھوں نے حافظ کی موت پر ایک دردناک مرثیہ رنانہ (رُلانے والا) کے عنوان سے لکھا جس کو رسالہ الضیاء نے اپنی کئی اشاعتوں میں شائع کیا۔ پھر جب اسی سال شوقی کا انتقال ہوا تو امین ناصر الدین نے حافظ ابراہیم کی زبان سے ان کا مرثیہ لکھا اس کو بھی رسالہ الضیاء نے کئی اشاعتوں میں چھاپا۔

۱۹۲۷ء میں شوقی کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ انعقاد پذیر ہوا جس میں عرب ممالک کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو امیر الشعراء کا لقب عطا کیا۔

شوقی کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

دور اول : ۱۸۹۱ تا ۱۹۱۵ اس دور کی شاعری قدیم اسلوب کی شاعری ہے کیوں کہ اس میں زیادہ تر طویل منظومات ہیں۔ جو مدح، مرثیہ غزل اور خمریات کے موضوعات پر لکھی گئی ہیں اگرچہ اس دور کی شاعری قدیم طرز پر لکھی گئی روایتی انداز کی شاعری ہے لیکن اسلوب میں نیا پن اور تراکیب و بندش الفاظ میں جدت ہے۔ بیان میں سلاست و روانی ہے نئی تشبیہات و استعارات ہیں اور ان کی شاعری کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے نفسیات انسانی اور مدرکات کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا ہے۔

دور دوم : ۱۹۱۵ تا ۱۹۱۹ شوقی کی زندگی کا یہ زمانہ ان کی جلاوطنی کا زمانہ ہے انھیں اس دور میں حرمان نصیبی، حزن و ملال، اور رنج و الم کا احساس ہوا۔ اس احساس نے ان کو حُبّ الوطنی، ملی زوال انسانی دکھ درد کا ادراک دیا۔ اور انہوں نے نہ صرف نغمۂ غم بلکہ غم انسانیت کے

گیت گائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ذات سے نکل کر آفاق کی پنہائیوں میں سرگرداں ہوئی ہے۔ انھوں نے انقلابات زمانہ کو دیکھا تھا۔ اور تعمیر ہوتے ہوئے نئے سماج کی نبض پر ہاتھ رکھا تھا۔

دور سوم : ۱۹۱۹ تا ۱۹۳۲ جب شوقی جلاوطنی کا زمانہ گذارنے کے بعد مصر واپس آئے تو ان کا دل ارض وطن کی محبت سے سرشار تھا۔ انہوں نے قومی زوال اور وطن کی بگڑتی ہوئی حالتِ زار پر آنسو بہائے اور ملک و قوم کو اونچا اٹھانے کے لیے نظمیں لکھیں۔ اور قومی فلاح و بہبود کا پیغام دیا۔

-:——:-

عنوان ۱ اللہ ۔ خدا

۱۔ اللہ کی حجت روشن ہے۔ (قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہے حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَةُ۔ اللہ کی حجت غالب ہے (انعام) یعنی چاند سورج کی روشن دلیلوں سے اس کی حقانیت ثابت ہوتی ہے) کیونکہ صبح کی روشنی میں شک دور ہو جاتا ہے شاعر حضرات اللہ کی کُنہِ حقیقت کو طلب نہ کریں۔ کیونکہ اگر اس کی عظمت کی حقیقت کو عظیم لوگ پا لیتے تو (وادیٔ) سینا اور (واقعۂ) اسریٰ اس حقیقت کے ساتھ لوٹتے۔

نوٹ : مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی اصلی حقیقت معلوم ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور موسیٰ علیہ السّلام کو معلوم ہوتی اور وہ اس کی خبر ہم کو دیتے۔

اس لیے شعراء جو بلند خیال ہوتے ہیں وہ اس کی حقیقت کو نہ ڈھونڈھیں۔

۲۔ وہم دور ہو جاتا ہے خیالات میں اور قریب ہوتا ہے (یعنی وہم و خیال کُنہِ ذات میں ٹاکٹوئیاں مارتے ہیں) اور عقل اس کے بارے میں دور جانے والا مسافر ہے۔ اور فکر، فرار اختیار کرتی ہے جائے فرار کی طرف۔

نوٹ : مطلب وہم و خیال، عقل و فکر سب عاجز ہیں۔ کُنہِ ذات پانے میں۔

۳۔ تو نے عقل کو کہیں تو باندھ دیا ہے اور کہیں کھلا چھوڑ دیا ہے۔ (یعنی بعض چیزوں

میں تو ایسا عاجز کر دیا ہے کہ وہ سمجھ نہیں پاتی مثلاً کُنہِ ذات اور بعض چیزوں میں معلوم کر دیا ہے یعنی عقل بعض (عقل) اشیاء کا ادراک کر لیتی ہے)

اور حیران کر دیا ہے برہانِ عقل کو اپنے بارے میں یعنی (کنہِ ذات کے بارے میں) اور معلوم مسئلوں میں سہل کر دیا ہے۔ (گویا) عقل (کے ہاتھ میں) تو نے ایک ٹھوس پتھر دیدیا ہے اور اس کا تراشنا (بھی)۔

اور گھاس کے اوپر (آسمانوں) میں اور ستاروں کے نیچے زمین میں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے۔ (یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جو کچھ زمین و آسمان میں ہیں سب اللہ کی تسبیح و تہلیل کرتی ہیں)

تیری (کُنہِ ذات) کے بارے میں ارض و سماء بالکلیہ وہم نہیں کرتے۔

۴۔ ہند کے مندروں میں حریص لوگ ساکت نہیں (جب کنہِ ذات کی تصدیق نہ ہو سکی) مسجد میں لوگ تیری حقیقت کی تسبیح پڑھتے ہیں اور روح تیری محبت میں غرق ہے۔ اور تیری وجہ سے یعنی ایمان کی بدولت (تیرے ذکر میں) ڈوبی ہوئی ہے۔ تیرے عشق کے سبب سقراط کو دم صبح زہر کا پیالہ دیا گیا۔

۵۔ عقل در آں باب (کنہِ ذات) (محو) تحیر ہے۔ وہ افلاک پر جاتی ہے اور تفتیش کرتی ہے وہ زمین پر ہل چلاتی ہے اور تحقیق کرتی ہے۔ (یعنی عقل آسمان اور زمین کو کرودتی ہے کہ کوئی سِرا کنہِ ذات کا مل جائے۔ ع۔ ڈور کو سلجھا رہی ہے اور سِرا ملتا نہیں) وہ عقل منازل قمر میں پناہ گزین ہوتی ہے۔ جب وہ بجلی چمکاتے ہیں۔ (یعنی منازل قمر میں بھی فکر کرتی ہے یہ اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہے جَعَلَ فِی السَّمَاءِ بُرُوْجًا اللہ نے آسمانوں میں برج یعنی منازل قمر بنائے جن سے ستاروں کا پتہ ہوتا ہے۔ سورۃ فرقان)

اور وہ عقل محسوس کرتی ہے۔ ایسے ہاتھ کو جو اس (عقل) کے ماوراء عالمین کو مارنے والا ہے۔

۶۔ ابر، آسمان میں خدا کی رفعت کی طرف چڑھا۔ اور زمین راہ چلی پئے سرِ کریم اور وہم راہ چلا پئے کنہِ حقیقت (یعنی سب خدا کی پناہ لینے کے لیے مضطرب ہیں یا رجوع الی اللہ ہیں) خدا نے وہم کو امور میں بتدریج (غور) کرنا سکھایا (کیونکہ) حقیقتوں کی اصل ان کا تلاش کرنا ہے۔

۷۔ جب زمانہ کمسن تھا اور جوان نہیں ہوا تھا۔ اور جب قدیم لوگ بچوں (کبوتروں) کی عقل میں تھے۔ تو کافر نے دست فضل و کرم و رحمت کو دیکھا کہ اس نے فریاد کرنیوالے اور چیخنے والے بازو بچھائے ہیں۔ وہ مستغیث جو شکایت کرتا ہے۔ اللہ سے مصیبت اور بدحالی کی۔ یعنی جب لوگ جاہل اور ان پڑھ تھے اس وقت بھی لوگوں نے خدا کو پہچان لیا تھا۔ وجود خداوندی کو مانتے تھے۔

۸۔ کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام، خدا کی ہیبتِ جمال سے چندھے اور کمزور بصر والے ہو گئے۔ وہ (موسیٰ)، کوہ، ارض مدین سب پر سکتہ ساطاری ہو گیا۔ اور جب رسول اللہ (صلعم) قریب ہوئے تو رعب سے پیشانی کے بل گر گئے۔

نوٹ: قرآن مجید میں قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنیٰ۔ لیکن یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جناب باری تعالیٰ کو دیکھ کر پیشانی کے بل گر گئے۔ غالب شاعر کو مغالطہ ہوا ہے۔ اس واقعہ سے جب آنحضرتؐ نے حضرت جبرئیلؑ کو دیکھا تھا۔

حدیث میں ہے کہ ان کے سَو سے زیادہ بازو بھی تھے۔

اور سلیمانؑ گذر گئے (حالانکہ ان کی بہت بڑی سلطنت تھی) مگر اللہ تعالیٰ کا وجود باقی ہے۔ بادشاہ اور اُمراء اللہ کے حضور متواضع ہیں۔ (یعنی سب اس کے سامنے جھکتے ہیں)۔

۹۔ جمالِ مطلق نے جمالِ خداوندی کے ساتھ پناہ لی ہے (جمال مطلق خدا ہے) جمال، جلال پر غالب ہے۔ جمال و جلال پرتو انوار الٰہی ہیں۔ محامد و محاسن اسی کے گرد طواف کرتے ہیں (گھومتے ہیں (لَہُ اَسْمَاءُ الْحُسْنیٰ تمام صفات اسی (خدا) کی ہیں) مدح

اور مبالغہ، مدح کیا پائے گی۔ یعنی کتنی ہی مدح کرو وہ حق مدح ادا نہیں کر سکتی (لَوْ کَانَ مِدَادَ الْبَحْرِ قرآن مجید میں ہے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے تب بھی صفات خداوندی بیان نہیں کی جا سکتیں)۔

۱۰۔ وہ (خدا) وہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں ایسا ملک ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ (لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اللہ کے لیے ہے۔ (القرآن)

کتنے ممالک اور زمانے گذر گئے لیکن وہ (خدا) باقی ہے (مرور اعصار کے باوجود) بادشاہ، غرور سے ہوش میں آگئے اور (اپنی نخوتوں سے) باز آگئے۔ اور قیصر و کسریٰ اور ہارون رشید مٹی کے نیچے ذلیل و فقیر ہیں۔

۱۱۔ فیصلے کی طاقت اللہ کی ہے۔ (اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ حکم اللہ کے لیے ہے۔) اس (فیصلے) کی کاٹ اور دھار بھی خدا کے لیے ہے۔ کوئی چیز اللہ کے فیصلے پر غالب نہیں آسکتی۔ اللہ اس فیصلے کے ذریعے ستون زمین (جس پر زمین قائم ہے) کو مارتا ہے۔ پس وہ اس کو ہلا دیتا ہے۔ (اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَھَا جب زمین کو ہلایا جاتا ہے۔ (القرآن) جب اللہ فیصلے کو حرکت دیتا ہے تو تاج گر جاتے ہیں۔ (تاج فغفور و قیصر و کسریٰ) اور بڑے بڑے ہتھیار بند لشکر جو کثرت اسلحہ سے جگمگا رہے ہوں، منتشر ہو جاتے ہیں۔ (اس کے فیصلے یا حکم سے)۔

۱۲۔ وہ ملائکہ کرام جنھوں نے نور چنا اور اچھا زیور پہنا، اللہ ان کو لباس نور پہنانے والا ہے، وہ اللہ کی حمد و ثنا اور تعظیم کے لیے وقف ہیں وہ عاجزی کرنیوالے ہیں۔ وہ چپکے چپکے تحید و ثنا (تسبیح) کرتے ہیں جس طرح قُرّاء آہستہ پڑھتے ہیں۔

۱۳۔ اور وہ فرشتے کودتے ہیں درمیان بازو والوں اور پر والوں کے، (یعنی وہ بال و پر والے ہیں) پروانوں کے کودنے کی طرح (مطلب وہ فرشتے حد سے تجاوز نہیں کرتے) وہ پروانے جو روشنی جمع کرنیوالی اور بھر کنے والی (شمع) کے گرد، گرتے ہیں وہ فرشتے ایسا

لباس پہنتے ہیں جس کو سرِ نعمت سے منقش کیا ہے اور نیکی نے بُنا ہے۔

۱۴۔ عرش الٰہی، رفعت کی چوٹی پر سربلند ہے۔ اس میں جوہرِ حق مبین کے نگینے ہیں۔ اور جبرئیل جن کا زمانۂ قدیم سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ علاقۂ خاص ہے۔ اس کے سامنے شکستہ حال ہیں یعنی متواضع ہیں۔ (لفظی ترجمہ ہوا کہ پروں کو پھیلانے والے ہیں) اور اگر رُسل اس کی معرفت اور قربت کا دعویٰ کرتے ہیں تو وہ غلط دعویٰ کرتے ہیں (یعنی وہ اس سے بَری ہیں)

۱۵۔ وجود واجب، ظن وخیال، اعتبار وفرض سے ماوراء ہے۔ وہ ایسا مقام ہے جہاں خیال کا گذر نہیں ہوسکتا۔ وہ طول وعرض ومکان سے مبرّا ہے۔ اس کے وجود کے آسمان کی کوئی حد نہیں یعنی لامکاں ہے۔ کوئی چٹیل میدان اور درخت والی زمین (دشت وصحرا ونخلستان) اس منزل کے مشابہ نہیں ہے۔

۱۶۔ گویا کہ وہ (منزل یا عرش) ایک ن (نون) ہے کہ جس کو اللہ کے قلم نے تخلیق کیا۔ پھر حسنِ صناعی سے اس کے حصے کو مکمل کیا (یعنی دائرہ کھینچا) اور جب ایجاد نے اس کا نقطہ لگانے کا ارادہ کیا تو اس قلم نے جانب اتم (یعنی اوپر کی طرف) اس (خدا) کو بلند کیا۔ اور نون (دائرے) کو نیچے کر دیا۔ اور آپ چمکتے ہوئے نقطہ ہیں۔

۱۷۔ علم (یعنی کنہِ حقیقت کا) اس جگہ بخل اور حفاظت ہے مطلب اللہ نے بتایا ہی نہیں۔ اور عزت، اس جگہ واقعیت اور دفع کرنا ہے حرمت کی چیزوں سے (یعنی عزت اللہ کے لیے ہے قرآن مجید میں ہے اَلْعِزَّةُ لِلّٰهِ)۔ بزرگی اللہ کے لیے ہے جس نے مارا متکبر کو دراں حالیکہ وہ غصہ کرنے والا تھا۔ (قرآن مجید کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ اللہ تعالیٰ غرور کرنے والے کو پسند نہیں کرتا) پس وہ متکبّر، مہار کو ڈھیلا کر کے اللہ کے سامنے مطیع ومنقاد ہو جاتا ہے اس پر مُردنی چھا جاتی ہے اور ہکا بکا رہ جاتا

ہے۔متکبّر کی بیماری (تکبّر) کے لیے کوئی دوا نہیں۔

۱۸۔ حضرت یوشع علیہ السّلام (نبی) اس حقیقت کی روشنیوں سے نابینا ہو گئے۔اور شیخ الرئیس بوعلی سینا کا روشن علم اس (اللہ) کی کنہِ ذات کا پتہ نہیں لگا سکا۔اس (اللہ) کی حقیقت کے سامنے ارسطو اور اس کے تلامذہ عاجز ہیں جب فنا کی ہوا چلی تو وہ فلاسفہ اور مشائیین (ارسطو فلسفۂ مشّائیت کا بانی تھا) بکھر گئے۔اور زمین نے اپنی چکی میں ان کو پیس ڈالا یعنی خاک آلود ہو گئے۔

۱۹۔ بفضلہٖ تعالیٰ ان فلاسفہ نے سعی وجہد سے کمال علمی کا لباس پہنا۔پس انہوں نے اپنے آپ کو کچھ سمجھا (یعنی اپنے آپ کو سمجھنے لگے) ان کاملین کو ذکاوت (علمی) نے متکبّر بنا دیا۔جس شخص نے خود علم حاصل کیا ہو وہ اس کی مثل نہیں جس کو اللہ نے علم عطا کیا ہے۔(یعنی لدنّی ہے) کچھ لوگ صاحب رائے ہوتے ہیں اور کچھ ذو الرائے نہیں ہوتے (کیونکہ) جو غیر ذوالرائے ہے وہ حکایت اور نقل کرتا ہے (اس کی اپنی ذاتی رائے نہیں ہوتی)۔

۲۰۔ بہت سے مقرب بارگاہ (خداوندی) موہوب ہیں (یعنی عطا کیے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس علم لدنّی ہے) اور بہت سے آپ کے باب عالی کے دریوزہ گر ہیں اور منتظر اجازت ہیں۔وہ دونوں (یعنی موہوب اور غیر موہوب) سرِّ مکنون یا راز خفی کے بارے میں چٹیل میدان (علم کے) میں حیران و ششدر رہیں جلّ جلالہ کی شان اس کے کتیم راز کی حفاظت کرتی ہے۔اس کی جلالت کے داہنے ہاتھ میں (س) اور بائیں ہاتھ میں (ر) ہے۔(یمین و یسار سرّ ہے)۔

۲۱۔ محبت کا دریا چھوٹی کشتی سے دو گز اونچا ہے۔کشتی اگر اس میں ایک گز چلے تو پھٹ جائے گی۔پس تو آنکھ کو اس سمندر میں بادبان کر اور حفاظت کر کیونکہ گرداب میں ڈوبنے والے کتنے ہاتھ ہیں جو مقبول (بارگاہ) ہوئے۔اور بعض وہ ہیں جو تہی دامان رہے۔(یعنی بعض بحر معرفت میں غوطہ زن ہوئے

اور بعض ہاتھ خالی رہے۔)

۲۲- اللہ (کو سمجھنے کے) لیے کتنی ایسی علامتیں (آیات) ہیں جن کو مشرک نہیں سمجھ سکتے۔ وہ آیاتِ بیّنات ہیں خالص بینائی رکھنے والوں کے لیے جو (اس کا) ادراک کر سکتے ہیں۔ مثلاً آسمان کو فضا میں معلق کیا (بغیر ستونوں کے) (قرآن مجید میں ہے اُنظُرُ اِلَی السَّمَاءِ کَیفَ رُفِعَتْ آسمان کی طرف دیکھو کس طرح اس کو بلند کیا) فلکِ دوار کو حرکت کرنے والا کیا اور اس (آسمان) میں گھٹنوں کے بل بٹھائے ہوئے ستاروں کو ثابت (ٹھہرا ہوا) کیا۔ (آسمان میں بعض ستارے ثابت ہیں اور بعض چلنے والے جو سبع سیارہ کہلاتے ہیں)۔

۲۳- انھیں آیات میں سے ستارے ہیں۔ سمّاکِ رامح (ذوالرمح، نیزے جیسے ہوتا ہے۔ اور اعزل بھی ستارہ ہے) اور سمّاکِ اَعزل دونوں ساتھ ہیں (یعنی ان میں وہی محبت ہے) اور فرقدان (دو ستارے) جو عداوت سے بری ہیں یہ دونوں بھی ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں اور سورج کا ہاتھ زیادہ تکلے اور چرخے کے اوپر ہے یعنی اس سے برابر شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اور بدر (ماہِ شب چہاردہم جس کی ۲۸ منزلیں ہوئی ہیں) ہر گھڑی اپنی منزل میں یعنی جس دن کی جو منزل ہے وہ اسی میں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ تیرھویں شب اس کی گرہیں کھول دیتی ہے۔

۲۴- انہی علامات میں سے ایک چیونٹی ہے۔ جو تلاشِ معاش میں نشیب و فراز جاتی ہے۔ تو پھر یہ بتاؤ کہ وہ کس دل اور کس عقل سے ان باتوں کو سمجھتی ہے؟ عقل؟ کہ وہم کرنے والا اس عقل کی جگہ کو گم کر دیتا ہے۔ (یعنی وہ عقل سے ادراک نہیں کرتی) بلکہ ہدایت کرنے والا ہاتھ اس کو الہام کرتا ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ اس کی رہنمائی کرتا ہے) اگر ہدایت نہ ہوتی تو چیونٹی سے حزم اور ہوشیاری ظاہر

نہ ہوتی۔

۲۵۔ انہی علامات میں سے رزق ہے۔ جو ایک راز کی طرح محفوظ رکھا گیا ہے۔(یعنی کسی کو نہیں معلوم کہ کس کو کتنا رزق ملے گا؟ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے القرآن)

کوئی اس بھید کو نہیں پاسکتا۔ کیونکہ رزق کے بھید کے ساتھ سخاوت کے (ک) اور (ن) نے بخل کیا ہے (یعنی لفظ کن نے) مطلب اللہ نے یہ راز کسی کو نہیں بتایا۔ جھوٹا ہے حریص اور اس کا حرص جو رزق) کو طرح طرح سے طلب کرتا ہے۔ اللہ نے اس کے لیے جو مقدر کر دیا ہے اس کے سوا اس کو نہیں مل سکتا اور وہ اس سے زیادہ کا طالب ہے۔ اس لیے وہ جھوٹا ہے۔ عنقریب اس حریص کو اس کا مال بخل لیا اور جنون لوٹے گا۔ چاندی اور سونا ہمیشہ رہے گا۔ یعنی وہ اپنی حرص میں رہے گا اور مال اپنی جگہ۔

۲۶۔ فرعون اور اس جیسے لوگ ہمیشہ نہیں رہے (یعنی حیات دوام نہ پاسکے) قصر و ایوان کی رفعت نے اس کو نفع نہیں پہنچایا۔ (سب خاک میں مل گئے) ان سرکش اور متکبر کے پاس گروہ اشرف (نبی) آیا۔ ان کی پیشانیاں حکم قرآن پر گر گئیں (کسریٰ کے محل کے کنگرے گر گئے تھے) اور جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

۲۷۔ اللہ نے نفوس (جاندار) کو موت اور عشق کے ساتھ ذلیل کیا۔ جس (شخص) نے زمین کو روندا اور جو بلند ہوا (اللہ) اس پر غالب آیا۔ اور اگر ستارہ کے ساتھ بھی عشق (روح) سرایت کر جاتا تو وہ بھی بلندی سے پستی کی طرف گر جاتا اور اس کے اہل قبیلہ اس پر روتے۔ مطلب جاندار نہیں ہے۔

ورنہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کے مصداق وہ بھی ہوتا

۲۸۔ داؤد علیہ السلام نے قرأۃ زبور میں کوتاہی نہیں کی۔ اور نہ عیسیٰ یسوع نے اسنو

بہانے میں اور نہ رسول اللہؐ نے قرآن پاک کی تلاوت میں وادی (سینا) کے کوہ و دمن روشن ہوئے۔ پس کلیم بام رفعت کو پہنچے انہوں نے اس بات کا وہم تک نہیں کیا کہ کوئی (اللہ) کا شریک ہو سکتا ہے۔

عنوان نظم ۲ اَلنُّبُوَّۃُ۔ نبوت

۱۔ ہدایت (مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا کی گئی۔ پس تمام کائنات اس کی وجہ سے روشن ہے۔ اور زمانے کا دہن متبسم اور ثنا خواں ہے۔ (یعنی تعریف کرتا ہے)

۲۔ جبرئیل علیہ السلام اور شریف فرشتے اس ہدایت کے گرد ہیں۔ اور وہ لوگ دین و دنیا کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بشارت دینے والے ہیں۔ (کہ رسول ہدایت پیدا ہونے والے ہیں۔ غالباً ولادت باسعادت کے وقت کا نقشہ ہے)

۳۔ عرش روشن ہے اور دربار الٰہی شاد ہے۔ اور سدرۃ المنتہیٰ جو محفوظ ہے وہ بھی خوش ہے۔ سدرۃ اس لیے خوش ہے کہ اب شیاطین اوپر نہیں جائیں گے

۴۔ گلزارِ قرآن مجید، ترنم ریز، نکہت بیز اور متبسم ہے بلند رفعتوں پر (اپنے) ترجمان (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ (کہ اُس کو ان جیسا ترجمان حقیقت ملا)

۵۔ اور وحی، ماءِ عذب و شیرین سے میٹھے پانی کا قطرہ قطرہ ٹپکاتی ہے اور لوح و قلم بدیع اس کو سیراب کرنے والے ہیں۔

۶۔ مصحفِ لوح میں رسولوں کے نام (موتیوں کی طرح) پروئے گئے ہیں اور ان سب میں اسم محمدؐ طغراء ہے (یعنی جلی حروف میں لکھا ہوا ہے)

۷۔ اللہ کا اسم اس کے نادر حروف میں اس جگہ (یعنی مصحف میں) الف ہے۔ اور رسول اللہ کا نام وہاں ب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ کا نام ہے اور بعد میں محمدؐ کا۔

۸۔ اے خیر الناس! (محمدؐ) آپ دنیا میں مبعوث رسولوں میں گلِ سرسبد کی طرح ہیں۔ آپ ہی کے ذریعہ لوگوں نے ہدایت پائی۔

۹۔ آپ کا گھرانہ، خاندان نبوت ہے۔ جس میں توحید پرست خواتین اور موحّد ہی ہیں۔ اور یہ روایت ضعیف نہیں ہے۔ (کیونکہ) رسول اللہؐ کی تمام پشت میں ایسا نہیں ہے۔

(بنو ہاشم خانۂ کعبہ کے متولی تھے ایام جاہلیت میں۔ آنحضرتؐ کا تعلق اسی خاندان سے ہے)۔

۱۰۔ حضرت آدم علیہ السّلام (کی نسل میں) جتنے باپ ہوئے، ان لوگوں میں کسی کو خیر الآباء نہیں بنایا سوائے آپ کے یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم بہترین پدر ہیں۔ اور آپ بہترین ماؤں کے ہیں کہ ان ماؤں کو جمع کیا یا محفوظ کیا حضرت حوّا نے آپ کے لیے۔

۱۱۔ ان آباء (باپوں) نے نبوت کی عزت پائی (خاندان نبوت کا سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ جس میں بیشتر نبی ہوئے) اور وہ (آباء یعنی انبیاء) مضبوط ہوئے مگر عزتِ عزیزہ آپؐ پر ختم ہو گئی۔

۱۲۔ نبوت کی عزت آپ کے خاندان کے لیے پیدا کی گئی اور وہ خاندان اس نبوت کے لیے۔ کیونکہ بڑی چیزوں (بلند مراتب) کے اہل عظیم لوگ ہوتے ہیں۔

۱۳۔ اللہ نے آسمان کو آپ کی (ولادت یا نبوت کی) خبر دی پس وہ مُزین ہو گیا اور زمین مشک بار ہو گئی (خوشی سے یا جھک گئی)

۱۴۔ آپ کا چہرہ نمودار ہوا کہ اس کے عارض حق (آگیں) ہیں۔ اور اس کی پیشانی کا نور

ہدایت اور حیا ہے (یعنی اس کی جبیں (سے) نورِ ہدایت اور حیا (پھوٹتی ہے)

۱۵۔ اس چہرے پر نور نبوت کی بنا پر رونق ہے۔ اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ان کے طریقے سے اس چہرے پر نشان یا علامت ہے۔

۱۶۔ اور آسمان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ پر فخر کیا۔ (وَمُبَشِّرًا بِاَیَاتِیْ مِنْ بَعْدِی اِسْمُہٗ اَحْمَدُ۔ حضرت عیسیٰ نے خوشخبری دی تھی کہ میرے بعد ایک پیغمبر آئیں گے ان کا نام احمدؐ ہوگا۔ القرآن)

اور حضرت مریم صلوٰۃ اللہ علیہا کھلکھلائیں اور جھومیں یعنی خوش ہوئیں۔

۱۷۔ وہ دن (یوم ولادت یا بعثت) کہ جس کی صبح و شام کو زمانے پر ناز ہے حضرت محمدؐ کے سنگ جو روشن ہیں۔

۱۸۔ وہ دن کہ رفیع آثار حق کہ اس حق پر (اب) کوئی جھنڈا بلند نہیں ہوگا۔ (وہ حق) تمام ملک (کائنات) میں فتحمند ہے۔

۱۹۔ وہ دن کہ ڈرائے گئے تخت، ظالموں کے، پس وہ متزلزل ہو گئے اور ان کے تاج زنگ آلود ہو گئے۔ (اشارہ ہے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کی طرف)

۲۰۔ اور آگ کہ ظالموں نے روشن کی تھی اس کے انگارے بجھ گئے اور پانی سوکھ گیا (آتش کدۂ ایران ولادت باسعادت کے موقع پر سرد پڑ گیا تھا)

۲۱۔ اور علامات (نشانیاں) پے بہ پے آتی ہیں۔ اور معجزات کثیرہ ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام ان نشانیوں کو لے کر صبح شام آتے ہیں۔

۲۲۔ خوشا وہ یتیم کہ اس کے فضل کی علامت نمودار ہوئی۔ اور بعض یتیم اللہ کی نعمت اور ذکا، ہوتے ہیں۔

۲۳۔ آپ کے نام پر گہوارے (بچپن) میں بارش طلب کرتے اور ساتھ آپ کے قصد کے (یعنی آپ کے ذریعہ) معائب دور کرتے ہیں۔

۲۴۔ اہل صدق و امین نے آپ کو بچپن میں امین و صادق (کی حیثیت سے) پہچانا

۲۵۔ اے وہ صاحب خلق! کہ بلندی ان کو چاہتی ہے۔ (یعنی بلندی قدم چومتی ہے) اور کبار آپ کے اخلاق کے عاشق ہیں۔

۲۶۔ اور اگر آپؐ دین قائم نہ کرتے، تب بھی آپکے اخلاق، دین ہو جاتے۔ کہ آپکے نورِ (اخلاق) سے اوقات روشن ہوتے ہیں۔

۲۷۔ خصلتوں نے آپ کو خلق عظیم سے مزین کیا (قرآن مجید میں ہے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ بیشک آپ صاحب خلق عظیم ہیں)
بڑے بڑے بزرگ لوگ آپ کے خصائل سے متأثر ہوتے ہیں اور ان پر فریفتہ ہیں۔

۲۸۔ آپؐ آسمانِ جمال کے آفتاب ہیں۔ اور یوسف علیہ السلام کا حُسن آپ کے نور سے مستنیر ہے۔ یعنی آپؐ آفتاب ہیں اور یوسف علیہ السلام شعاع ہیں۔

۲۹۔ جب آپؐ سخاوت کرتے ہیں اور اس کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو آپؐ وہ کچھ کر جاتے ہیں جس کو منازل قمر (نچھتر) بھی نہیں کر پاتے۔

۳۰۔ جب آپ معاف کرتے ہیں تو اس حال میں کرتے ہیں کہ آپ انتقام لینے پر قادر ہوتے ہیں۔ اور جاہل لوگ آپ کی معافی کو حقیر (توہین) نہیں سمجھتے۔

۳۱۔ جب آپؐ رحم کرتے ہیں تو آپ یا تو ماں ہوتے ہیں یا باپ (یعنی دونوں میں سے ایک) اور دنیا میں یہی دونوں (یعنی والدین) زیادہ رحم کرنے والے ہوتے ہیں۔

۳۲۔ جب آپؐ غصہ کرتے ہیں تو وہ غصہ حق میں ہوتا ہے۔ (راہ حق میں) نہ کہ کینہ اور بغض کی (وجہ) سے۔

۳۳۔ جب آپؐ راضی ہوتے ہیں تو یہ رضا اللہ کی خوشی سے ہوتی ہے۔ اور بہت سی رضائیں بہ تکلف بردباری اور دکھاوٹ ہوتی ہیں (مگر آپ کے سب کام اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں)

۳۴- جب آپؐ خطبہ پڑھتے ہیں تو منبروں کو شادمانی ہوتی ہے وہ شادمانی کہ پیش آتی ہے دن کی مجلس کو۔ اور قلوب روتے ہیں۔

۳۵- جب آپؐ فیصلہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ گویا جھگڑا کرنے والوں کے لیے وہ فیصلہ آسمان سے آیا ہے۔

۳۶- جب آپؐ پانی (کی) حفاظت کرتے ہیں یعنی اس کو مخصوص کرتے ہیں۔ (اس وقت) اگر قیصر اور بڑے بڑے بادشاہ پیاسے ہوں۔ تو ان کو وارد نہیں کیا جاتا۔ (عربی میں وارد سیراب کرنے کو کہتے ہیں)

۳۷- جب آپؐ کسی کو پناہ دیتے ہیں تو آپ اس پناہ گزین کے حق میں مثل بیت اللہ کے ہیں۔ (یعنی جس طرح بیت اللہ میں کوئی داخل ہو جائے تو اس کو کوئی خوف نہیں رہتا مَنْ دَخَلَ فِيْهِ فَهُوَ اٰمِنٌ جو اس میں داخل ہو جائے اس کے لیے امن ہے۔ مامون ہے)۔ کہ بیت اللہ میں پناہ گزین پر ظلم داخل نہیں ہوتا۔

۳۸- جب آپؐ کسی نفس کے مالک ہوتے ہیں تو آپ اس مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ شئ مملوک بکریاں (ہی) ہوں۔

۳۹- جب آپؐ شادی کرتے ہیں تو از روئے معاشرت آپ بہترین شوہر ہوتے ہیں اور جب آپ باپ ہوتے ہیں تو دنیا کے آباء آپ کے درے ہوتے ہیں (یعنی از روئے پدر جو صفات آپ میں پائی جاتی ہیں دوسرے آباء میں کم ملتی ھیں۔)

۴۰- جب آپ دوستی کرتے ہیں۔ تو آپ کے اصحاب و احباب، آپ کی چادر میں مجسّم وفا کو دیکھتے ہیں۔

۴۱- جب آپ کسی سے عہد لیتے ہیں تو آپ اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اور جب آپ خود کسی کو عہد دیتے ہیں تو آپ اس کو پورا کرتے ہیں۔ (ایفائے عہد کرتے ہیں)

۴۲۔ جب آپؐ اعداء کی طرف چلتے ہیں تو آپ شیر ہوتے ہیں اور جب حملہ کرتے ہیں تو آپ چوپائی ہوا ہوتے ہیں۔ (مطلب چاروں طرف سے حملہ کرتے ہیں)

۴۳۔ آپ جاہل و نادان کے ساتھ خاطر مدارات کر کے اپنے حلم کو بڑھاتے ہیں یہاں تک وہ جُہلا آپ کی خوش اخلاقی سے تنگ آجاتے ہیں۔

۴۴۔ ہر نفس میں آپ کے حملوں سے خوف ہے۔ اور ہر نفس میں آپ کی سخاوت سے امید ہے۔

۴۵۔ رائے اس کے سامنے اگر سیف بندی نہ کھینچی گئی ہو تو مثل اس شمشیر کے ہے کہ اس کے ساتھ آرا نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ رائے اور شمشیر ہُندّ کا نکلنا آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اور یہ صفت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی ہے۔

۴۶۔ اے نبیٔ اُمّی! علم میں از روئے مرتبہ آپ کے لیے یہ بات کافی ہے کہ آپ کے سامنے علماء بھی مطیع و خوار ہو گئے۔

۴۷۔ معرفتِ کردگار کے لیے قرآن مجید بہت بڑی علامت ہے۔ وہ قرآن شریف کہ اس میں طالب معجزات کے لیے کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔

۴۸۔ اگر لُغوِیین (اہل لغت) مجتمع ہو جائیں اور بُلَغاء اور فصحاء خطاب کے لیے آگے آئیں تو بیان (بلاغت) کا امتیاز قرآن مجید (یا نبیٔ امی) کو حاصل ہو گا۔

۴۹۔ نزولِ قرآن کے بعد توریت و انجیل منسوخ ہو گئیں۔ حالانکہ وہ روشن اور آفتاب ہیں۔

۵۰۔ جب دانائے حجاز آیا تو عکاظ خالی ہو گیا اور غار حراء آباد ہوا۔

۵۱۔ وحی نے اہل لسان و نطق کو عیب ناک کر دیا۔ وہ وحی کہ جس کی فصاحت کے سامنے بلغاء قاصر ہیں۔

۵۲۔ ان لوگوں (اہل زبان یعنی عرب) نے حسد کیا۔ اور کہا کہ آپؐ شاعر یا ساحر ہیں۔

اور حاسد تو مذاق اڑایا ہی کرتے ہیں۔

۵۳۔ (غار) حرا، نے ہادیٔ کریم (رسول صلعم) اور ہدایت (قرآن) کے ذریعہ وہ چیز پالی جس کو طور سینا، سرداری سے بھی حاصل نہ کرسکا۔

۵۴۔ ہوگئی شان گویا کہ آپ اپنی بزرگی سے قائم مقام ایک امت (گروہ) کے معلوم ہوتے ہیں۔ اور حمار بوجہ اپنے آدمی کے جنگل معلوم ہوتا ہے۔
(اگرچہ وہ چھوٹا ہے اور حضورؐ کو ایک امت کہا)۔

۵۵۔ حرا کی تاریکیوں میں آپ کی طرف فوز و کامرانی کی وحی کی گئی۔ پے در پے۔ کہ اس وحی سے اس کی تاریکیاں روشن ہوئیں۔

۵۶۔ آپ کا دین ایسا دین ہے کہ اس کی بنیاد کو، آیت در آیت سورتیں اور انوار حقیقت مضبوط کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آیات قرآنی اس دین کو مضبوط کرتی ہیں۔

۵۷۔ اس دین کی بنیاد حق ہے اور کیونکر نہ ہو؟ اللہ جل جلالہ اس کے معمار ہیں۔

۵۸۔ آپ کا کلام عقول کے لیے گھاٹ ہے یعنی عقلیں اس سے سیراب ہوتی ہیں اور اس (گھاٹ) کا پانی علم اور قیمتی حکم ہیں۔

۵۹۔ وہ کلام۔ قرآن کا رنگ اور اس کے تقدس کی مہک ہے۔ اس کی سورتوں سے اور "ر" ہے۔ یعنی سرّ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا کلام قرآن کے اسرار کی شرح کرتا ہے۔

۶۰۔ اسی کلام کے بڑے (تناور) درخت اور عقل کے چشمے سے فصاحت جاری ہوئی اور اسی کلام سے انشاء پھوٹی۔

۶۱۔ اس کلام کے سمندر میں پیراکوں کے لیے ادب حیات اور علم حیات پر لنگر ڈالنا ہے۔ یعنی وہ (لوگ) اس بحر سے ادب اور علم حاصل کرتے ہیں۔

۶۲۔ قرآن کی مے پر زمانے گذر گئے مگر وہ فنا نہ ہوئی اور نہ اس کے پینے والے فنا ہوئے۔

۶۳ - اے ابنِ عبداللہ! آپ کے ذریعہ ایک آسان شریعت حق کے ساتھ قائم ہوئی۔ جو اور تمام ہدایت کی ملتوں سے روشن ہے۔

۶۴ - اس ملت کی بنیاد توحید پر رکھی گئی اور وہی حق ہے۔ سُقراط اور قدیم لوگوں نے اسی حقیقت (توحید) کی آواز دی۔

۶۵ - سُقراط نے اس حقیقت کی وجہ سے زہر کو مثل شہد سمجھا۔ اس کے بعد اسی حقیقت (حق) کی وجہ سے پے در پے دوسرے شہید ہوئے۔

۶۶ - اسی حقیقت یعنی نور توحید کے ساتھ مصر کے کاہن اور صاحب معرفت یا زمانے کے منجّمین (ستارہ شناس) گامزن ہوئے۔

۶۷ - ملکہ ایزیس (آلہۂ مصر سے ہے) جب مُوَحِّد ہوئی تو اشیاء نے اپنے امور کا انتظام لے لیا۔ یعنی اس کا نظم و نسق درست ہو گیا۔

۶۸ - جب آپ نے دین قبول کرنے کی دعوت دی تو عاقل نے لبّیک کہا۔ اور جو جاہل تھے وہ آپ کی آواز سے بہرے ہو گئے۔

۶۹ - ان جاہلوں نے اپنے توہمات سے نکلنے سے انکار کر دیا۔ اور لوگ توہمات میں گرفتار ہوتے ہیں۔

۷۰ - بعض لوگ ذکاوت و ذہانت میں مثل نہروں کے ہوتے ہیں اور بعض پتھر۔ اور انھیں میں سے بعض آزاد طبع ہوتے ہیں اور بعض اوہام کے غلام۔

۷۱ - ارسطو نے جماعت کی بیماری (افتراق) کی دوا نہیں بتائی۔ یہاں تک کہ آپؐ آ گئے (اور آپ اس بیماری کی دوا مساوات لے کر آئے)

۷۲ - پس آپ اپنے بعد دنیا کے لیے ایسی حکومت قائم کر گئے جس میں اونچ نیچ کا امتیاز نہیں۔

۷۳ - اس حکومت میں مخلوق کے اوپر صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اس حکومت کے تحت سب لوگ آپس میں برابر ہیں۔

۷۴۔ اگر کمیونسٹ اپنے دعوؤں اور قانون میں غلو نہ کریں، کیونکہ وہ لوگ عورتوں کو بھی شامل کرتے ہیں، تو آپ ان کے امام ہیں۔

نوٹ: کمیونسٹ ہر چیز میں اشتراک ملکیت کا تصور رکھتے ہیں۔

۷۵۔ آپ نے مرض کا علاج اطمینان سے کیا۔ لیکن ان لوگوں (کمیونسٹوں) نے ابتدائی درجوں کو چھوڑ کر یعنی چھلانگ مار کر علاج کیا۔ بعض ادویہ سے زیادہ مفید بیماری ہی ہوتی ہے۔

۷۶۔ فی سبیل اللہ جہاد کرنا آپ کے نزدیک شریعت ہے۔ قاتل زہر یعنی باطل سے لڑائی لڑنا دوا ہے۔

۷۷۔ آپ کے نزدیک احسان کرنا، انسان کا فرض اور ذمہ ہے۔ احسان کر کے، اس کو جتا دینے سے احسان (باقی) نہیں رہتا اور نہ وہ عطیہ، عطیہ ہے جس کو بعد میں جتلا دیا جائے۔

۷۸۔ آپ نے مالداروں سے فقراء کا انصاف کیا یعنی ان پر زکوٰۃ فرض کی۔ پس تمام لوگ حقوق الحیات میں برابر ہیں۔

۷۹۔ پس اگر کوئی انسان کسی مذہب کو اختیار کرے تو فقراء اور مساکین آپ ہی کے دین کو قبول کریں گے۔

۸۰۔ اے وہ کہ جو لے جائے گئے باعتبار شرف کے اس مرتبہ کی طرف کہ اس کو سوچ اور جوزاء (برج کا نام) بھی نہیں پا سکتے۔

(معراج کی طرف اشارہ ہے)

۸۱۔ وہ لوگ (قوم) سوال کرتے ہیں (حالانکہ آپ پاک جسم ہیں) کہ آپ کو معراج جسم کے ساتھ ہوئی یا روح کے ساتھ؟

۸۲۔ آپ کو معراج، جسم و روح کے ساتھ ہوئی اس حال میں کہ وہ دونوں پاک ہیں۔ یہی قول جمہور علماء کا ہے) روحانیت اور حسن و خوبی میں نور ہیں۔

۸۳ - آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے۔ (کہ اس نے آپ کو اتنا بڑا مرتبہ دیا) اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اور جو مناسب سمجھتا ہے، کرتا ہے۔

۸۴ - آپ تمام عالم کی چھپی ہوئی چیزوں پر چھا گئے۔ (یعنی آپ نے ان کا مشاہدہ کیا) جب آپ نے ایک آسمان کی سیر کرلی تو پھر دوسرے آسمان پر چلے گئے۔

۸۵ - ہر آسمان میں اس کے نور کے کنارے بمنزلے نون (ن) کے ہیں اور آپ بمنزلۂ چمک دار نقطے کے ہیں۔ یعنی جب آپ آسمان پر چڑھے تو گویا وہ نون کا دائرہ ـ ن ہے اور آپ نقطہ۔

۸۶ - آپ اس آسمان میں جمال ہیں اور آپ ہی جلوہ گاہ (اور اگر فاعل کا صیغہ پڑھا جائے تو ترجمہ ہوگا کہ آپ جمال کے دیکھنے والے ہیں) اور آپ ہی ہاتھ، آپ ہی آئینہ اور آپ ہی حسینہ ہیں یعنی سب کچھ آپ ہیں۔

نوٹ: حدیث شریف میں ہے اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی وہ میرا نور یعنی میرا حسن و جمال ہے۔

۸۷ - اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہِ قدس سے آپ کے لیے سامانِ ضیافت مہیا کیا۔ وہ سامان ضیافت کہ کسی بلندی نے اس سے تجاوز نہیں کیا۔ یعنی ایسی ضیافت کسی نے نہیں کی۔

۸۸ - عرش آپ کے پاؤں کے نیچے چوکھٹ اور پائے ہے (چونکہ آپ اس پر چڑھے جیسا کہ دہلیز پر قدم) اور جبرئیل کے بازو آپ کے لیے فرش ہیں۔

۸۹ - اور تمام انبیاء عرش کے نیچے ہیں۔ ان کو اس پر چڑھنے کی اجازت نہیں یہ بات بعید ہے کہ ماسوا آپ کے وہ عرش کسی اور کے لیے ملاقات کی جگہ بنے۔ کیونکہ یہ خاص کر آپ کے ساتھ تھا۔

۹۰ - گھوڑوں کی جماعت اسے ناپسند کرتی ہے کہ احمدؐ کے سوا کوئی اور ان کا حمایت و حفاظت کرنے والا ہو۔ اور جب ان کا (محمدؐ) نام لیا جاتا ہے تو

وہ تبختر کرنے والا (اترانا) اور متکبر ہو جاتے ہیں (خوشی سے)

۹۱- آپ سواروں کے شیخ ہیں اور وہ سوار ان کے (محمدؐ) کے مرتبے کو جانتے ہیں (اگر حرب ان شیر سواروں کو نبرد آزمائی کی دعوت دے یعنی اگر لڑائی ہو تو وہ سوار آپ کے مرتبہ کو لڑائی میں، جانتے ہیں)

۹۲ - اور جب آپ درپے ہوتے ہیں واسطے دھاروں کے تو آپ شمشیر ہندی ہیں اور جب نیزوں کے درپے ہوتے ہیں تو آپ گندم گوں سنانِ سدید ہیں یعنی جب آپ تلواروں سے مقابلہ کرتے ہیں تو آپ ان کے مقابلے میں سیفِ ہندی ہیں۔ اور جب نیزوں سے مقابل ہوتے ہیں تو گندم گون سیدھا نیزہ ہیں۔

۹۳- اور جب اپنی کمان سے تیر پھینکتے ہیں تو ان کا داہنا ہاتھ بمنزلۂ تقدیر کے ہے۔ اور وہ کہ داہنا پھینکتا ہے وہ قضائے الٰہی ہے۔ یعنی ہاتھ تقدیر ہے اور جو پھینکا ہے یعنی تیر وہ قضائے الٰہی (موت) ہے۔

۹۴- ہر حق کے دعویٰ کرنے والے کے لیے ان کی (محمدؐ) تلوار کی ہمت ہے۔ یعنی ان داعیٔ حق کو آپ کی شمشیر سے ہمت حاصل ہے۔ پس ان کی سیوف کے لیے پہاڑوں میں گذرنا ہے۔

۹۵ - وہ (محمدؐ) زخمی کو پانی پلانے والے ہیں۔ قیدیوں کو کھانا کھلانے والے ہیں اور آپ وہ ہیں کہ ان کے گھوڑوں کے کھُروں سے کسی خاندان کے بچے ہوئے لوگ یا اعضا کچلے جانے سے بے خوف ہوئے (رقت قلب اور مہربانی کو بیان کیا ہے)

۹۶ - اگر لوگوں میں شجاعت کے ساتھ مہربانی اور سخاوت کی دو صفتیں نہ ہوں تو وہ شجاعت، شجاعت نہیں بلکہ سنگ دلی اور قساوت ہے۔

اور آپ (محمدؐ) کے اندر یہ دونوں چیزیں ہیں۔

۹۷۔ اور حرب قوموں کا شرف ہے۔ (کیونکہ لڑائیوں سے قوم معزز ہوتی ہے)
پس اگر وہ لوگ (قوم) ظلم کریں تو شرف اس چیز سے کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں،
بری ہے۔ یعنی پھر وہ شرف، شرف نہیں رہے گا۔ بلکہ وہ باطل ہو جائے گا۔

۹۸۔ اور قوی لڑائی کو باعتبار تکبر کے برانگیختہ کرتا ہے۔ لیکن اس کی مصیبت کے
نیچے ضعیف لوگ پس جاتے ہیں۔

۹۹۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت سے مکرم غزوات ہیں کہ اس
لڑائی لڑنے میں حق تعالیٰ کی رضا تھی یا وہ اعلائے کلمۃ الحق کے لڑے گئے۔

۱۰۰۔ ان غزوات میں اللہ کے لشکر کے لیے شدت و مصیبت تھی مگر ماورائے
شدت، عالمین کے لیے راحت تھی۔

۱۰۱۔ ان اصحاب رسول پاکؐ نے ضلالت و گمراہی کو ایسی ضرب لگائی کہ وہ ختم ہو گئی
پس اوپر جہالت و ضلالت کے خاک ہے یعنی محو ہونا ہے۔

۱۰۲۔ ان اصحاب رسولؐ نے سلامتی کی بنیاد حرب پر قائم کی۔ کیونکہ بسا اوقات
دنیا میں، خون کی حفاظت خونریزی سے ہوتی ہے۔
(یعنی ظالموں کے مارنے سے)

۱۰۳۔ حق، اللہ تعالیٰ کی آبرو ہے۔ نفوس میں سے ہر غیرت مند اس حق یا آبرو
کے لیے محفوظ چراگاہ یعنی حفاظت ہے اور پورا کرنا ہے۔

۱۰۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی قوم یعنی بنو ہاشم میں سے سوائے ایک
بچے (حضرت علیؓ) اور عورت (حضرت خدیجۃ الکبریٰ) کے کوئی نہیں تھا۔ یعنی آپ
کی رفعت نسب کی وجہ سے نہیں بلکہ باعتبار نبوت کے ہے۔

۱۰۵۔ پس آپ نے دعوت اسلام دی تو آپ کی آواز پر قبائل میں سے ایک گروہِ ضعیف،
قلیل الافراد، اور لاغر نے لبیک کہی۔

۱۰۶۔ اور اگر حق و ایمان کسی چادر میں ڈالے جائیں تو اس کی قوت گونگے لشکر کے

برابر ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک نفس ان دونوں چیزوں (حق و قوت ایمانی) کا حاصل ہو تو وہ قائم مقام ایک بھاری لشکر کے ہوتا ہے۔

۱۰۷ - اس گروہ (صحابۂ رسولؐ) نے شرک کی بنیاد کو اکھاڑ دیا۔ پس وہ ویران وتباہ حال ہے۔ اور اصنام کا استیصال کر دیا۔ پس وہ ہوا کے ذرات یا غبار کی گرد ہیں۔

۱۰۸ - وہ لوگ (گروہِ رسولؐ) جب زمین پر چلتے ہیں تو ان کی ہیبت سے زمین آنکھ نیچی کر لیتی ہے۔ اور وہ زمین کی نعمتوں کے سامنے آنکھ میچ لیتے ہیں۔

۱۰۹ - یہاں تک کہ جب زمین کے اطراف اس گروہ کے مفتوح ہوئے تو آرام و آسائش، عیش وعشرت نے ان سرکش نہیں بنایا۔

۱۱۰ - اے وہ کہ جس کو تنہا عزتِ شفاعت حاصل ہے۔ اور وہ پاک اور خود اس کو کسی کی شفاعت کی ضرورت نہیں۔

۱۱۱ - عرش قیامت آپ اس کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے یعنی آپ کے ہاتھ میں پرچم ہوگا۔ (آپ سردار ہوں گے) اور حوضِ کوثر۔ آپ اس کے سامنے، دینے والے ہوں گے۔ (ساقیٔ کوثر)

قرآن مجید کا ارشاد ہے اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ ہم نے آپ کو صاحب کوثر بنایا۔

۱۱۲ - اور آپ نیک اعمال کرنے والوں کو سیراب کریں گے، پلائیں گے۔ ان کا ثواب اور نیک اعمال ذخیرہ ہوتے ہیں اور جزا دیئے جاتے ہیں۔ یعنی بیکار نہیں جاتے۔

۱۱۳ - کیا ان مراتب کے لیے آپ نے دنیا میں بھوکا ہونا پسند کیا تھا۔ اور کیا انہی کے حصول کے لیے آپ پر پرانے ہونے سے چادر پھٹی۔ مطلب یہ ہے کہ کیا آپ نے دنیا میں تکالیف انہیں مراتب کے حصول کے لیے اٹھائی تھیں؟

۱۱۴ - اے رسول پاکؐ! آپ کی مدح میں اشعار و قصائد کی دلہنیں لایا ہوں۔ کہ غلام بنا لیا ہے ان کو آپ کے عشق نے اور مشتاق یا آرزومند کیا ہے ان کو آپ کے حلوے

نے۔

۱۱۵۔ وہ (دلہنیں اشعار کی) خوبصورت ہیں۔اگر آپ ازراہ کرم ان کو قبول فرمائیں تو ان کا مہر صرف آپ کا شفاعت فرما دینا ہے۔

۱۱۶۔ آپ وہ ہیں کہ مخلوق کو آپ کے دین نے منظم کیا۔تو پھر آپ کی مدح وستائش میں شعراء کیا نظم کہیں اور کیا لکھیں؟
کیوں کہ آپ کے فضائل معتدبہ ہیں۔

۱۱۷۔ آپ کے باب عالی پر مدح کرنے والا، ملتجی اور دعا کرنے والے کی صورت میں آتا ہے۔کیونکہ بعض مدائح، عجز وانکساری اور دعا کے لیے بھی ہوتی ہیں۔

۱۱۸۔ میں آپ سے اپنی کمزور قوم کے بارے میں اس سبب سے کہ اس پر مصیبت کا وقت پڑا ہے۔آپ ہی پر نگاہِ امید جماتی ہے۔

۱۱۹۔ کیا حضورؐ نے جان لیا کہ آپ کی قوم کے نفوس ہوئی وہوس کے متبع ہو گئے ہیں اور ان کے قلوب علم وذکر سے کورے ہیں۔

۱۲۰۔ کیا حضورؐ کو اس کا علم ہو گیا ہے کہ آپ کی قوم منتشر ہو گئی ہے۔پس نہیں جمع کیا ان کے نفوس کو کسی معتمد علیہ نے اور نہ جمع ہوئی قلوب میں محبت۔مطلب یہ ہے کہ ان کا کوئی رہبر نہیں جو ان کی رہنمائی کرے (یعنی ان کا کسی پر اعتماد نہیں) اور نہ قلوب میں باہمی اخوت ومودت کا جذبہ باقی ہے۔

۱۲۱۔ وہ لوگ ہو گئے ہیں کہ عیش باطل نے ان کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔اور غلامی میں عیش، قوم کے لیے مصیبت ہے۔(یعنی جب غلامی میں عیش ہو تو آزادی کی کوشش کون کرے گا)

۱۲۲۔ ان لوگوں نے آپ کی شریعت پر ظلم کیا۔وہ شریعت کہ ہم نے اس کی بدولت وہ چیز پائی کہ روم (اٹلی) میں وہاں کے پوپوں (پاپائے اعظم ویٹیکن اٹلی میں رہتا ہے) نے اس چیز کو نہیں پایا۔

۱۲۳- وہ شریعت کہ اس کی روشنی میں تمدن رائج ہوا۔ اور اس شریعت سے وابستہ ہو کر نیک لوگوں نے دین و دنیا میں ہدایت و راحت پائی۔

۱۲۴- اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت نازل کرے جب تک حُدیٰ کہنے والا رات کی تاریکیوں کا مصاحب رہے۔ اور جب تک قوی اونٹنی جنگل کی مشتاق رہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ آپ پر رحمت نازل ہو۔

۱۲۵- آپ سخی آل کا رضوان (داروغۂ جنت) یا رضائے الٰہی، ان کے بالاخانوں میں جو ہمیشہ رہنے والی جنت میں ہیں، استقبال کرے۔ یعنی آپ کی سخاوت و سماحت کرنے والی اولاد کو رضائے الٰہی حاصل رہے۔

۱۲۶- بہترین وسیلوں والا وہ شخص ہے۔ جو آپ کی سخی اولاد کا وسیلہ حاصل کرے کہ بہترین وسیلہ آپ کی اولاد (اطہار) کا وسیلہ ہے۔ اس لیے میرے لیے حضرت فاطمۃ الزہراء کا وسیلہ کافی ہے۔ (ملحوظ رہے کہ اللہ سے دعا کے وقت وسیلہ بھی دیا جاتا ہے)۔

—:——————:—

عنوان نظم ۳

اِنتِہارُ الطُّلَبا،
طلبہ کی خودکشی

۱ - نوجوان، اپنے زمانوں میں سے ایام شباب میں (اللہ اس کو معاف فرمائے) کیا گلاب کے پھول سے اس نے ٹھوکر کھائی؟ یعنی کوئی تو پتھر سے کھاتا ہے اس نے پھول جیسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔

۲ - انھوں نے عنفوان شباب کے سینے کی طرف تیر کو سیدھا کیا اور اپنی اٹھتی جوانی کے روشن اطراف میں تیر پھینکا۔

۳ - اس نے تیر اس ہاتھ سے پھینکا جو نہ تو شر یعنی برائی کو سمجھتا ہے اور نہیں لائق ہے مگر گیندوں III سے کھیلنے کے۔

۴ - وہ ہاتھ زہر اور رسّی کے لیے پھیلا اور نہیں دراز ہوا ساغر و کمان کے لیے کہ شکار کرتا۔

۵ - اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے کیا ضرر دیتی اس کو یہ بات اگر وہ لذت عیش سے اپنی حاجت پوری کر لیتا۔ یعنی زندگی کے ایام شباب سے لطف اندوز ہوتا۔

۶ - اس بچے کے لڑکپن کے دنوں اور راتوں نے صبح و شام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا یعنی اس سے کوئی تمتع نہیں کیا۔

۷ - وہ عنفوان شباب کا زمانہ کہ بوڑھا اس زمانے کی ایک ساعت بھر یاد کو یاد دوبارہ مشاہدے کی تمنا کرتا ہے۔

۸ ۔ جنت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو عنفوان سے مشابہ ہو۔کیونکہ یہ سائے کی طرح ہلکی اور جلد ختم ہونے والا اور خوشبو کی طرح کم ہونے والا ہے۔

۹ ۔ پس جنت کا شباب زیادہ قائم رہنے والا ہے۔اور دنیا کا عنفوان شباب نایاب اور مختصر۔

۱۰ ۔ ہر روز کسی نہ کسی نوجوان کے بارے میں یہ خبر سنی جاتی ہے کہ وہ زندگی سے ملول ہوگیا اور جو کسی چیز سے ملول ہوگا وہ اس کو چھوڑے گا (یعنی خودکشی کرے گا)

۱۱ ۔ اس نوجوان نے دنیا سے شب باشی کرنے سے کراہت کی۔
حالانکہ اس نے منگنی کی تھی۔پیام دیا تھا۔ ہدیہ دیا تھا اور مہر دیا تھا۔

۱۲۔ اس نوجوان نے اپنے نفس کو شادی کے دن اس دنیا سے کھولا یعنی خودکشی کرلی۔اللہ تعالیٰ اس دولھا پر رحم فرمائے جو جوان مرجائے۔

۱۳۔ وہ نوجوان زندگی سے تنگدل ہوگیا۔پس وہ مایوسی کے کنارے سے گرا۔ وہ بری گرنے کی جگہ ہے۔

۱۴۔ (رَاحِلاً حال ضمیر ہوئی سے) وہ گرا، اس حال میں کہ آرزوؤں کی عمروں میں تھا۔

۱۵۔ وہ زندگی کے میدان سے فرار حاصل کرنے والا تھا۔حالانکہ وہ اس دنیا کے گہرے پانی (شدائد و مصائب) اور تالابوں سے قریب نہیں ہوا تھا۔
یعنی اس نے ابھی کوئی زیادہ مصائب نہیں دیکھے تھے۔

۱۶۔ میں دنیا کو مزاحمت کی جگہ پاتا ہوں۔اس مزاحمت کی جگہ میں وہ شخص بہادر ہے جو صبر کرے۔

۱۷۔ بہت سے کمزور دل، کہ اس میں کمزوری تھی۔بزدلی سے مرگئے۔اور خوف کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔

۱۸۔ لوگوں نے اس خودکشی کرنے والے کی ملامت کی۔اور وہ لوگ (ملامت کرنے والے) کس قدر ظالم ہیں؟ اور کم ہیں وہ لوگ جنھوں نے چشم پوشی کی اور ان کو ملامت

کرنے سے معذور رکھا۔

۱۹۔ (شاعر مُتَہَوِّر خودکشی کرنے والے نوجوان سے مخاطب ہوکر کہتا ہے)
اے کفن پوش! اور اے گڑھے میں پڑے ہوئے! تجھ کو اللہ نے معقول عذر عطا کیا تھا۔ (عذر یہ تھا کہ تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا میں کیا کروں)

۲۰۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ تقدیر کا بچھڑا ہوا ہے۔ اور زمانۂ قدیم سے لوگوں نے تقدیر پر ظلم کیا ہے۔ یعنی بُرے کام خود کرتے ہیں اور تقدیر پر ڈالتے ہیں کہ ایسا ہی لکھا تھا۔ (اس شعر میں قدیماً ظرف مقدم ہے)

۲۱۔ اور طب کہتی ہے کہ یہ جنوں کی وجہ سے ہے اور میں نے لوگوں میں عقل کو نادر دیکھا یا پایا۔

۲۲۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کو جفا نے گھبرا دیا (یا ڈرا دیا) جو پتھر سے زیادہ شقی القلب باپ کی طرف سے تھی۔

۲۳۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کو امتحان نے ڈرا دیا تھا۔ وہ امتحان جس کو عقلمند استاد نے علم کی شدت اور سختی سے مشکل کر دیا تھا۔
(یہ پرچہ مشکل بنایا تھا)

۲۴۔ نہیں دیکھتا ہوں (اسباب انتحار کو جن کی وجہ سے بہت سے لڑکوں نے خودکشی کرلی) مگر نظامِ فاسد۔ کہ اس نظام نے علم کو پارہ پارہ کر دیا اور بہت سے خاندان کو ہلاک کر دیا۔

۲۵۔ اس نظام فاسد نے لڑکوں کی قربانی سے خاندان تباہ کر دیے۔ اور ان کی قربانیاں (خودکشی) کس طرح زیادہ ہیں۔

۲۶۔ اس کراہت کرنے والے نے اپنی شادابیٔ عمر میں کوئی (خوشی) نہیں دیکھی۔ اور نہ زندگی میں اس چیز کو دیکھا کہ جس نے اس کو خوش کیا ہو۔ زندگی کا ہلکا حصہ وہ ہے جو رنج پہنچائے اور خوش کرے۔

یعنی ادنیٰ درجہ زندگی وہ ہے کہ اس میں خوشی وغم دونوں ہوں۔

۲۷۔ وہ لڑکا زندگی کے انبوہ غم اور فکر وافکار کے صحرا میں اترا۔

۲۸۔ اور ایسے دنوں میں آیا کہ اس میں خوشحالی نہیں۔ اور ایسی راتوں میں اترا کہ اس میں افسانہ وقصہ گوئی نہیں۔

۲۹۔ وہ ایسے درسوں میں شریک ہوا تھا جس کا حل استاد نے آسان نہیں کیا تھا کہ اگر وہ تشریح درس کرتا تو سحر بیانی کرتا یعنی سمجھ میں آجاتا۔

۳۰۔ یا اس نوجوان کو سوتیلی ماں، بیماری کی کلفت کی طرح تکلیف دیتی تھی۔ وہ سوتیلی ماں کہ جس کا دیکھنا ہی بیماری ہے۔ یعنی جس کو دیکھ کر ہی بچہ بیمار پڑ جاتا ہے۔ (اس کے خوف سے خودکشی کی)

۳۱۔ اس کو اس مشقت سے دوچار ہونا پڑتا تھا جو بنو علات (جن کا باپ ایک مائیں مختلف) کے کینہ وشر سے لپٹی ہوئی تھی۔ یعنی سوتیلے بھائیوں سے اس کو تکلیف پہنچی تھی اس لیے خودکشی کی۔

۳۲۔ وہ سب ایسے (منسوب کئے ہوئے) بھائی کہ ان کو ایک ماں کی (رحم) نے جمع نہیں کیا۔ اس لیے ان میں سے بعض، بعض کے لیے دھوکے کی چال چلتے ہیں۔

۳۳۔ ان کے والدین پر محبت کے فرشتے نے پردے کو نہیں ہلایا اور نہ ان کے پھلوں (اولاد) میں برکت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میں اتحاد واتفاق، اخوت و مودت کا مادہ نہیں۔

نوٹ: (اَوْ) بمعنی (و) کے ہوتا ہے جب معطوف علیہ منفی ہو۔

۳۴۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو محبت سے پیدا کیا اور ملک کی بنیاد بھی اسی محبت پر رکھی۔ اور اس کو تعمیر کیا۔ یعنی اللہ نے محبت کے ساتھ پیدا کیا۔ اور یہاں وہ مفقود ہے۔

۳۵۔ اے بہترین نسلو! (نوجوانو) ذرا ٹھہرو۔ (انتظار سے یا یہ کہ تم میری بات سنو جو

میں تم سے کہتا ہوں) کہ نوجوانی میں تمہارا قتل نفس گمراہی اور خسارہ ہے۔

۳۶۔ اگر تم جھوٹی مایوسی (جو فیل ہونے سے پیدا ہوئی) کی نافرمانی کرتے تو یہ تنگ دل نفس، شباب میں قتل نہ کیا جاتا۔

۳۷۔ اس تنگ دل سے دنیا میں ناامیدی و مایوسی کو دور رکھ۔ کیونکہ اس کو حوادث زمانہ کی کوئی خبر نہیں۔ یعنی ناتجربہ کار ہے۔

۳۸۔ اے خودکشی کرنے والو! تم اپنے پر کیوں ظلم کرتے ہو۔ بڑھاپے میں اولاد کے گم ہو جانے کا صدمہ شدید مضرت رساں ہوتا ہے۔

نوٹ: (فیم) حرف استفہام۔ حرف جر کی وجہ سے "ما" کا الف گر گیا۔

۳۹۔ اور تم ان شہروں سے کیوں کراہت کرتے ہو جو ہمیشہ تمہارے اوپر مہربانی کرتے رہے اور کیوں تم شدائد و مصائب سے ڈرتے ہو کہ کہیں کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔

۴۰۔ جس طرح سرسبز و شاداب کھیتی پر آفات ارضی آتی ہیں۔ اسی طرح ملک کے مصائب نوجوان ہیں۔ یعنی جیسا کہ سبز کھیتی کے جل جانے یا اجڑنے سے زمین کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی طرح نوجوانوں کی خودکشی سے ملک کو۔

۴۱۔ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اگر وہ خودکشی سے تاخیر (اعراض) کرتا اور انتظار کرتا تو (نہ معلوم) وہ کیا رتبہ پاتا۔

۴۲۔ بہت سے جوان ایسے ہیں کہ جنھوں نے سختیاں جھیلیں۔ اور وہ جوان ہو کر بہتر ثابت ہوئے پھر انہوں نے خیر کو پھیلایا (یعنی بچپن تکالیف میں گذارا فیل ہونے کا صدمہ برداشت کیا۔ لیکن جوان ہو کر بلند مرتبہ کو پہنچے۔)

۴۳۔ بہت سے بچے ایسے ہیں کہ دنیا نے ان کو حقیر سمجھا۔ لیکن وہ اسی دنیا میں عزت و شرف میں ہونہار ہوئے اور ان کو بلند مراتب ملے۔

۴۴۔ اور بہت سے بلند مراتب ایسے ہیں کہ ان کو ان کے باپ نے سردار نہیں بنایا۔ دیکھو سورج کا باپ اور چاند کا دادا کون ہے؟

۴۵۔ آسمان گردش میں ہے۔ اور دنیا ہمیشہ سعد و نحس نہیں رہی۔ مطلب ایک حالت پر قائم نہیں۔

۴۶۔ قلب کو شباب کی لذتوں کے ساتھ آرام و راحت دو۔ اور اس سے لطف اندوز ہو۔ کیونکہ وہ کدورتوں کی جولانگاہ نہیں۔ یعنی اس کے جھیلنے کے لیے بڑھاپا کافی ہے۔

۴۷۔ تم علم نافع (قرآن) حاصل کرو۔ اور اسی سے شفا چاہو۔ اور بزرگوں کی سیرتوں میں گم شدہ چیز۔ علم نافع کو تلاش کرو۔

نوٹ: حدیث میں کہ علم مومن کی گم شدہ میراث ہے۔

۴۸۔ تم علم نافع کے دروازے کو کھٹکھٹاؤ۔ اور اس سے شفا حاصل کرو۔ یعنی تجربہ حاصل کرو۔ (کیونکہ) بسا اوقات مردہ نے زندہ کو علم سکھایا ہے۔

۴۹۔ اور اس بات کو غنیمت سمجھو کہ اللہ نے تمہارے لیے معانی کو مقبوض کیا۔ (یعنی غیر محسوس چیز عقل کے ذریعہ)۔

۵۰۔ علم، علم کے لیے پڑھو۔ ڈگریوں اور دوسرے مقاصد کے لیے نہیں۔

۵۱۔ بہت سے نوجوان درس میں گمنام تھے۔ وہ بحر علم اور استاد زمانہ ہوئے۔

۵۲۔ اور بہت سے درس میں کوشش کرنے والے یعنی محنت سے پڑھنے والے، ایسے گمنام ہو گئے۔ کہ وہ نہ غائب میں ہیں اور نہ حاضر میں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں۔

۵۳۔ قاتل نفس، اگرچہ وہ نفس اس لڑکے کا ہو، اس نے اللہ کو ناراض کیا اور نہ اس سے مخلوق راضی ہوئی۔

۵۴۔ میدان زندگی اللہ کے قبضے میں ہے (لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ زمین

وآسمان کی سلطنت اللہ کی ہے۔ القرآن)۔ اُس میدان میں وُرود و صُدور، اللہ کی اجازت سے ہے۔ یعنی اللہ کے اذن سے انسان پیدا ہوتا ہے اور اسی کے حکم سے مرتا ہے۔

ورود: پانی پر آنا۔ صدور: پانی پی کر لوٹنا۔

۵۵۔ نہیں مرتا ہے نفس مگر اللہ کے حکم سے۔ اللہ نے موت کو اس نفس پر مامور اور غالب کیا ہے۔

۵۶۔ درحقیقت نوجوان، میدان جنگ میں جان قربان کرتا ہے۔ جب لشکر باہم مختلط اور گتھم گتھا ہو جائیں۔

۵۷۔ پس وہاں (عرصۂ جنگ میں) اجر و فخر یکساں ہے۔ جو زندہ رہتا ہے اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ اور جو مر جاتا ہے اس کو ثواب ملتا ہے۔ ع

جی جائے تو غازی ہے مر جائے، شہادت ہے

نوٹ: قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم سمجھتے نہیں ہو۔

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
پرنسپل جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ

سوانحی ادب اور قرآن

سوانح نگاری یا تذکرہ نویسی کا تعلق اصلاً تاریخ و سیر سے ہے نہ کہ ادب سے لیکن یہی عمل جب کسی ادیب موہوب کے ہاتھوں انجام پاتا ہے تو وہ ادبی شہ پارے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

جو تذکرہ ادبی شہ پارے کی شکل اختیار کرلیتا ہے، حقیقت میں وہی پائیدار اور لافانی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی کے اندر وہ قوت ہوتی ہے جو غافل انسانوں کو جھنجھوڑتی، انھیں اپنے مقصد تخلیق کا شعور عطا کرتی، انھیں انسانی عظمت کے گوناگوں پہلوؤں سے آشنا کرتی اور انھیں کچھ بننے اور کچھ کرنے کے لیے بے چین کردیتی ہے۔

لیکن جو تذکرہ اس وصف سے خالی ہوتا ہے اسے کبھی خلود یا دوام حاصل نہیں ہوتا وہ بس طاق نسیاں یا طاق غفلت کی زینت بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ بس اس لیے رہ جاتا ہے کہ اسے کسی لائبریری میں محفوظ کردیا جائے، اور کبھی اس کے ہیرو کے سلسلے میں کچھ شخصی معلومات حاصل کرنی ہو تو اسے الٹ پلٹ لیا جائے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دنیائے تذکرہ نویسی میں بھی ادب کی حیثیت مسلم ہے۔ ایک کامیاب سوانح یا معیاری تذکرہ وہی قرار دیا جاسکتا ہے جو ادبی محاسن سے آراستہ اور ادبی اقدار کا آئینہ دار ہو۔ اور جو اپنے اندر اتنی کشش اور جاذبیت رکھتا ہو کہ وہ پڑھنے والے کی رگ و پے میں سرایت کرجائے۔ اور اس کی شریانوں میں خون بن کر دوڑنے لگے۔

کسی تذکرے کے ادبی محاسن کیا کیا ہوتے ہیں؟ یا وہ کیا چیزیں ہوتی ہیں جو اس کے اندر جان ڈال دیتی، اس کی قوت تاثیر میں اضافہ کرتی اور اسے ایک لافانی کارنامہ بنا دیتی ہیں۔

اس لحاظ سے جب ہم قرآن پاک پر غور کرتے ہیں تو نمایاں طور پر پانچ چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلی چیز جو اس ضمن میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس تذکرے کا ہیرو یا وہ شخصیت جو اس تذکرے کا موضوع ہے وہ ایک جاندار شخصیت ہو۔ اس کی زندگی عظیم کارناموں سے مالا مال ہو۔ وہ ایسی زندگی ہو جو دوسروں کے لیے مشعل راہ اور قابل اتباع ہو۔ سننے والوں کو اسکی زندگی سے ایک نئی زندگی اور نئی توانائی حاصل ہوتی ہو۔

اس طرح کی کسی شخصیت کا اگر تذکرہ لکھا جائے گا تو وہ اپنے اندر ایک طرح کی کشش اور جاذبیت رکھتا ہوگا۔ وہ خوابیدہ روحوں کو بیدار کرے گا اور سرد جذبات کو دہکا کر شعلہ و شرر میں تبدیل کر دے گا۔

مثال کے طور پر جلیل القدر انبیاء کی سیرتیں ہیں یا انسانیت کے ان دوسرے محسنین کے تذکرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں انسانیت کو راہ نجات دکھانے اور انھیں فلاح و کامرانی سے ہمکنار کرنے کے لیے قربان کر دیں، ان لوگوں کے تذکرے لکھے جائیں تو لازماً ان کے اندر زندگی کی حرارت اور زندگی کی توانائی ہوگی۔

قرآن پاک کے مطالعے سے یہی چیز ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس نے سیکڑوں ہزاروں انبیاء میں سے صرف انھیں انبیاء کے تفصیلی تذکرے بیان کیے ہیں جن کی زندگیاں بعد کی نسلوں کو زندگی کی دولت سے مالا مال کر سکتی تھیں۔

ورسلا قد قصصناهم عليك من قبل ورسلا لم نقصصهم عليك وكلم الله موسى تكليما۔

یہاں یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن پاک نے اولوالعزم انبیاء و رسل کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے لوگوں کے بھی تفصیلی تذکرے کیے ہیں اور بطور قدوہ اور اسوہ

انھیں پیش کیا ہے جو نبوت و رسالت کے بلند منصب پر فائز نہ تھے۔ مثال کے طور پر حضرت لقمان ہیں حضرت مریم ہیں۔

بہت سے رسولوں اور نبیوں کا ذکر نہ کر کے ان غیر رسولوں کے تفصیلی تذکرے کرنا ہماری اسی بات کی تصدیق کرتا ہے۔

(۲) دوسری چیز جو اس ضمن میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ تذکرہ رطب و یابس یا ضروری اور غیر ضروری باتوں پر مشتمل نہ ہو، اس میں جو باتیں پیش کی گئی ہوں وہ بالکل صحیح صحیح اور مطابق واقعہ ہوں۔

کوئی بھی سوانح یا کوئی بھی تذکرہ اگر اپنے اندر یہ وصف نہ رکھتا ہو، مثال کے طور پر تذکرہ نگار نے عقیدت میں غلو کی وجہ سے یا کچھ دوسرے اسباب کے زیر اثر اس میں رنگ آمیزی کر دی ہو، یا اس میں کچھ خلاف واقعہ باتیں ملا دی ہوں تو چاہے کتنے ہی بلند ادبی اسلوب میں یہ باتیں ملائی گئی ہوں، اور چاہے کتنے ہی سحر آفریں ادبی پیرائے میں یہ رنگ آمیزی کی گئی ہو، وہ تذکرہ اپنی ادبی حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔ غیر محسوس طور پر اس کے اندر تصنع اور آورد کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک عموماً جب کسی قوم یا گروہ یا فرد کا تذکرہ کرتا ہے، تو اس بات کی بھی صراحت کر دیتا ہے کہ یہ جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں یا تمہیں سنا رہے ہیں یہ بالکل صحیح صحیح اور مطابق واقعہ ہے۔

۱۔ نحن نقص علیك نبأهم بالحق انهم فتية آمنوا بربهم وزدناهم هدى۔

۲۔ واتل علیهم نبأ ابنی آدم بالحق۔

یہاں ان دونوں مواقع پر (بالحق) کی صراحت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں یہ دونوں آیتیں محض بطور مثال پیش کی گئیں ورنہ یہ (بالحق) کی صراحت قرآن پاک میں جگہ جگہ ملتی ہے۔

(۳) تیسری چیز جو اس ضمن میں بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ کوئی بھی سوانح لکھی جائے تو اس کا مقصد نام و نمود کی ہوس یا کوئی نسلی، قومی، گروہی عصبیت نہ ہو، بلکہ اس کا محرک

بس یہ ہو کہ آنے والی نسلوں کی اصلاح و تربیت کا سامان مہیا کیا جائے۔ ان کے سامنے علم و تقویٰ اور اخلاق و کردار کا کوئی دلآویز مثالی نمونہ پیش کیا جائے۔ اس طرح ان کی قوت کار کو مہمیز لگائی جائے۔ اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے۔ قرآن پاک کی اس آیت سے ہمیں اسی بات کا اشارہ ملتا ہے:۔

ویسألونک عن ذی القرنین قل سأتلو علیکم منه ذکرا۔

یعنی کسی کی سرگزشت یا کسی کے حالات اس لیے بیان کیے جائیں کہ اس سے لوگوں کو تذکر حاصل ہو۔ وہ اس سے عبرت پذیر ہوں۔

چنانچہ واقعاتی دنیا میں یہ چیز بہت ہی واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ وہ سوانح عمریاں جو ادنیٰ مقاصد کے پیش نظر لکھی جاتی ہیں وہ لوگوں میں بار نہیں پاتیں، وہ اس صلاحیت سے محروم ہوتی ہیں کہ طبیعتوں کو اپنی طرف کھینچ سکیں یا پڑھنے والے کے ذہن و دماغ پر اپنا کوئی نقش چھوڑ سکیں۔

۴۔ چوتھی چیز جو اس ضمن میں خاصی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ تذکرہ نگار ایک نفیس ادبی ذوق کا حامل ہو۔ ایک ادیب اگر صحیح معنوں میں ادبی ذوق رکھتا ہے تو ظاہر ہے اس کے قلم سے جو چیز بھی نکلے گی اس کے اندر ادبی شان ہوگی۔ اس کا انداز تحریر اور اس کا پیرایۂ بیان اس کے اندر جان ڈال دے گا۔

کوئی تو وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو جس کا بہت بڑا حصّہ انبیاء کرام اور اقوام و ملل کے تذکروں پر مشتمل ہے، فصاحت و بلاغت کا شاہکار بنایا، اور زبان و ادب کے لحاظ سے اسے وہ خصوصیات اور وہ بلندیاں عطا کیں جو ہر ایک کی دسترس سے باہر تھیں۔ اور اس کے اندر وہ شیرینی و دلکشی رکھی کہ جس نے بھی ایک بار سن لیا، اس کا گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا، کٹّر سے کٹّر دشمنوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی ساری عداوتوں کے باوجود کشاں کشاں اس کی طرف آتے اور چھپ چھپ کر اسے سنتے اور اس سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

پھر نہ صرف یہ کہ قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ نے زبان و ادب کا شاہکار بنایا بلکہ اس کے لانے والے کو بھی افصح العرب بنایا۔

۵۔ پانچویں چیز جو اس ضمن میں بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ تذکرہ نگار کے پیش نظر یہ بات نہ ہو کہ وہ کسی شخصیت کی زندگی کی تمام تفصیلات جمع کر دے۔ اس کے برعکس وہ بس انہی پہلوؤں کو اجاگر کرے جنھوں نے براہ راست اسے متأثر کیا ہو یا جو اپنے اندر زندگی کا کوئی پیغام رکھتے ہوں۔

قرآن پاک کے انداز بیان میں یہ چیز بہت ہی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ مختلف قوموں اور مختلف شخصیتوں کے تذکرے بیان کرتا ہے مگر غیر ضروری تفصیلات میں جانے کے بجائے بس انہی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جن کا موقع و محل متقاضی ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر ضروری باتوں کے جھرمٹ میں ضروری باتیں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح گھاسوں میں دھان کا پودا دب کر رہ جاتا ہے۔

وہ بنی اسرائیل کی تاریخ بیان کرتا ہے اس طور سے کہ اہم اہم واقعات کی طرف اشارہ کر دیتا ہے اور صدیوں میں پھیلی ہوئی تاریخ کو چند صفحات میں سمیٹ دیتا ہے۔

اسی طرح وہ دوسری بہت سی اقوام کی تاریخیں بیان کرتا ہے، اور ان کے سلسلے میں بھی اسی ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے۔

وہ انبیاء و رسل کے تذکرے بیان کرتا ہے۔ ان کی دعوتی زندگی اور دعوتی جد و جہد پر روشنی ڈالتا ہے مگر اس طور سے کہ چند سطروں یا چند صفحوں سے زیادہ جگہ نہیں گھیرتا۔

انبیاء کرام میں سب سے لمبی سرگزشت یا سوانح جو اس نے بیان کی ہے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے اور یہ سرگزشت بھی سو آیات سے آگے نہیں بڑھتی۔ مگر پیش کرنے کا انداز ایسا اچھوتا اور انوکھا ہے کہ اس ایجاز و اختصار کے باوجود قاری یا سامع کو تشنگی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ان کی زندگی۔ عظیم کارناموں سے مالا مال زندگی کی پوری ریل اس کی نظروں کے سامنے سے اس طرح گھوم جاتی ہے کہ

وہ اپنے آپ کو ایجابی کیفیات سے سرشار اور روحانی بلندیوں سے ہمکنار محسوس کرتا ہے۔

ان تمام پہلوؤں کو اگر سامنے رکھا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اگرچہ ہمارے ہاں سوانح عمریاں اور تذکرے بہت لکھے گئے ہیں، اتنے لکھے گئے ہیں کہ ان کے اعداد و شمار تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اور اگر ان میں عربی تراجم اور عربی تذکرے بھی شامل کر لیے جائیں تو پھر تو بڑی بڑی لائبریریاں اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرنے لگیں گی۔ لیکن اس کے باوجود شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تاریخ و تراجم اور سوانح کے اس بحر ذخار میں بہت ہی تھوڑا لٹریچر ایسا نکلے گا جس کی ادبی حیثیت تسلیم کی جا سکے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وہ تاریخ و سیرت یا سوانح کے موضوع پر ہوتے ہوئے بھی ادب کا شاہکار ہے۔ اور ادبی محاسن سے مالا مال ہے۔ ورنہ عام طور سے جو بات نظر آئے گی وہ یہی کہ اس بحر ذخار کو مجرد سیرت یا تاریخ کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اسے ایسا ادبی لٹریچر نہیں شمار کیا جا سکتا جو قوموں کے لیے انقلاب کی راہ ہموار کرتا اور انھیں رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ جو ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا، خوابیدہ روحوں کو بیدار کرتا اور سرد عزائم کو شعلۂ آتش میں تبدیل کر دیتا ہے۔

عربی کے مایہ ناز ادیب الاستاذ سید قطب اپنی گراں قدر کتاب "النقد الادبی" میں الترجمہ والسیرۃ کے عنوان سے سیرت و تراجم پر عربی زبان میں جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی وضاحت فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں ترجمہ یا سیرت نگاری کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اور ایک معیاری سیرت یا معیاری ترجمہ کا کیا مطلب ہوا کرتا ہے۔ پھر وہ فرماتے ہیں:۔

ومن هذا البيان يبدو لنا أن مكان التراجم بمعناها الاصطلاحي الكامل لا يزال ناقصا في المكتبة العربية۔ (النقد الادبی ص ۱۰۸)

اس وضاحت سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ کامل اصطلاحی معنوں میں تراجم کا خانہ عربی لائبریری یا عربی لٹریچر میں ہنوز خالی پڑا ہوا ہے۔

جب عربی تراجم کے سلسلے میں استاذ سید قطب کی یہ رائے ہے تو پھر اردو تراجم اور اردو

تذکروں کے باب میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

ضروری ہے کہ اس پہلو سے بھی ہم قرآن پاک کا گہرا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ تاریخ و سیرت اور سوانح نگاری کے باب میں وہ ہمیں کیا رہنمائی دیتا ہے۔ اور تذکرہ نویسی کا کیسا بلند معیار فراہم کرتا ہے۔

رؤف خیر
حیدرآباد

ملفوظات و مواعظ ادب کے آئینے میں

(ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط کے حوالے سے)

فن کار جب کوئی خط کھینچتا ہے تو اس میں بھی معنویت کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے دنیا کی کوئی شئے بے کار نہیں بنائی گئی رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ تو قلم کو کیسے الا بلا لکھنا زیب دے سکتا ہے

میرے خیال میں قلم سے کسی نے بھرپور استفادہ کیا ہے تو وہ ہیں ڈپٹی نذیر احمد خاں کبھی "چند پند" کے نام سے نوخیز ذہنوں کو اخلاقِ کریمانہ سکھائے تو کبھی مرآۃ العروس کے ذریعے حسنِ صورت و حسنِ سیرت کی تعلیم دی، ابن الوقت کو زمانے کے ساتھ چلنے کا انجام دکھایا تو کبھی توبۃ النصوح کی ترغیب دی۔ کبھی الحقوق والفرائض گنائے تو کبھی تعزیراتِ ہند کے نکات سمجھائے کبھی بارہ تیرہ برس کے بیٹے کو بھی خطوط لکھے تو دنیا بھر کی اونچ نیچ بتادی۔ حتیٰ کہ قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ تک کر ڈالا۔

ڈپٹی نذیر احمد بھرپور زندگی جینے کے عادی تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کے فرزند میاں بشیر بھی انہی کی طرح ایک کامیاب انسان ثابت ہوں۔ وہ سرکاری غلامی کی وجہ سے مختلف ۱۳ تبادلوں پسماندہ مقامات پر زندگی گزارنے پر مجبور تھے اسی واسطے وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا کسی اچھے مقام پر مستقلاً رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کرے۔ ابتدائی تعلیم تو خود ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے بیٹے کو دی وہ خود اردو اور عربی کے مسلم الثبوت ادیب تھے انہوں نے اپنی تمام زبان دانی اپنے بیٹے میں منتقل کرنے کی کوشش بھی کی۔ اچھی خاصی عربی

جب وہ اپنے بچے کو سکھا چکے تو چاہتے تھے کہ اب وہ انگریزی تعلیم سے بھی کما حقہٗ آشنا ہو جائے۔ اسی غرض سے انہوں نے میاں بشیر کو دہلی کے ایک مدرسے میں ساتویں کلاس میں شریک کروا دیا۔ ایک طرف پدری شفقت تھی تو دوسری طرف سرکاری ملازمت ڈپٹی نذیر احمد خاں نے مسلسل خطوط کے ذریعے اپنے بیٹے کو جو ہدایات دیں وہ دلچسپ، کارآمد اور سبق آموز ہیں بیٹے کو یہ احساس تھا کہ یہ خطوط کسی معمولی آدمی کے نہیں ہیں۔ انہوں نے وہ خطوط سنبھال کر رکھے اور اپنے قریبی دوست عبدالغفور کو بھی دکھائے۔ یہی وہ مولوی عبدالغفور شہباز بہاری ہیں جو بعد میں میاں بشیر کے ہم زلف بھی ہوئے جنھوں نے ان خطوط کو سب سے پہلے ۱۸۸۷ء میں "مواعظِ حسنہ" کے نام سے قومی پریس لکھنؤ سے شائع کیا اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۳۳۱ھ (م-۱۹۱۲ء) چوتھا ایڈیشن ۱۳۳۷ھ) ۱۹ء اور پانچواں ایڈیشن ۱۳۳۹ھ) ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا نصیحت فرجام نامہ و پیام المقلب بہ "مواعظ حسنہ"، مجموعۂ مکتوبات جناب شمس العلماء مولوی حافظ محمد نذیر احمد خاں صاحب مرحوم ایل ایل ڈی او۔ یل، سابق ڈپٹی کلکٹر اور ممبر بورڈ آف ریونیو حیدر آباد دکن سرکار عالی نظام جس کو مولوی سید محمد عبدالغفور صاحب شہباز مرحوم پروفیسر اورنگ آباد کالج اور ڈائرکٹر تعلیمات ریاستِ بھوپال نے حسبِ اجازت مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرتب فرمایا اور جو پانچویں بار ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء دلی پرنٹنگ پریس دہلی سے شائع ہوا۔

مواعظ حسنہ کے پہلے ایڈیشن پر مولوی سید محمد خاں صاحب بہادر ڈپٹی مجسٹریٹ عظیم آباد اور شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے جو ریویو ماہ اگست ۱۸۸۷ء میں لکھے تھے وہ بھی بطور تقریظات اس پانچویں ایڈیشن میں شامل ہیں ان کے علاوہ ایک دیباچہ اور بارہ اشعار پر مشتمل ایک منظوم تقریظ بھی جو خود عبدالغفور شہباز کا نتیجۂ فکر ہے شاملِ کتاب ہے۔ بطور تتمہ میاں بشیر نے صفحات آخر میں لکھا کہ یہ پانچواں ایڈیشن فروری ۱۹۲۱ء میں ان کی اپنی نگرانی میں دو ہزار کی تعداد میں

چھپوایا گیا ہے۔ خاتمۃ الطبع کے عنوان سے چند سطور میاں بشیر نے اپنے اور اپنے شفیق والد نذیر احمد خاں کے تعلق سے جو لکھے تھے ان پر شعبان المعظم ۱۳۳۷ھ مطابق مئی ۱۹۱۹ء کی تاریخ درج ہے گویا یہ کلماتِ خیر چوتھے ایڈیشن میں بھی شامل تھے۔ میاں بشیر فرماتے ہیں۔

"میرے والد ماجد خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے صاحبِ تصانیفِ کثیر و مفیدہ ہیں جن کی کتابوں نے ہندوستان کے اِس سرے سے اس سرے تک اس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے کہ جس کی نظیر ملنا محال ہے ... "مواعظِ حسنہ" ایک مجموعہ ہے ان خطوں کا جو زمانِ تعلیم میں میرے شفیق باپ نے نہایت دل سوزی سے مجھے لکھے تھے جن کے فقرے بلکہ لفظ لفظ سے محبت اور شفقت ٹپکتی ہے ... یہ وہی خط ہیں جنھوں نے مجھے راہِ راست بتائی میرے قدموں کو ڈگمگانے نہ دیا اور میرے کیرکٹر کی ایک مستحکم بنیاد قائم کی...

یہ خط کبھی اس غرض سے نہیں لکھے گئے تھے کہ پبلک میں لائے جائیں گے۔ بالکل پرائیویٹ نیچر کے تھے اور اسی وجہ سے قلم برداشتہ لکھے گئے تھے ... یہ کتاب (مکتوبات) نوعمر لڑکوں کے لیے حصول علم، تہذیب و اخلاقِ حسنہ کا بہترین ذریعہ ہے۔"

ڈپٹی نذیر احمد کے ان خطوط میں زندگی کی مختلف کیفیات و نفسیات پر ان کے اپنے خیالات و احساسات کا اظہار بڑے ہی دل نشیں انداز میں پایا جاتا ہے۔ ان کی ناولوں میں کہانی یا ماجرائیت محض ذیلی حیثیت رکھتی ہے اصل مقصد تو ان کا اصلاحِ معاشرہ ہی تھا جس میں وہ کامیاب رہے اسی طرح ان کے خطوط میں خیر و عافیت کی مطلوبی ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور اخبار بینی کے فوائد، دولت دنیا کی اہمیت، نفس کشی (self Denial)، شخصی حکومت میں مظالم کی روداد، یونانی و انگریزی

طریقۂ علاج کے اثرات، انگریزی زبان کی خوبیاں اور خرابیاں، بے پردگی کی برائی، لے پالک کی فضول خرچی کی حقیقت، اس دور کے بی اے اور ایم اے پاس حضرات کی قابلیت پر چوٹ، سود اور پرامیسری نوٹ کے جواز سے لے کر ہر معاملے میں مشرق و مغرب کے سوچنے کے انداز پر بھرپور اور مدلل بحث بھی موجود ہے۔ کہیں کہیں تو لگتا ہے کہ مولوی نذیر احمد نے بھی ابوالکلام آزاد سے بہت پہلے، خطوط کے نام پر اپنی ہمہ دانی کا "غبارِ خاطر" نکالا ہے۔ بعض خطوط پدرانہ و مربیانہ القاب سے شروع ہوتے ہیں اور تاریخ ارقام و مقام کے ساتھ ختم ہوتے ہیں مگر بیشتر خطوط بے القاب اور بغیر تاریخ کے بھی پائے جاتے ہیں بہت ممکن ہے مرتبین خطوط نے تاریخ و مقام کو غیر اہم جان کر اندراج کرنا مناسب نہیں سمجھا اور صرف مواد اور سوادِ خط کو اہمیت دی۔ اس تالیف کے آخری حصے میں خطوط کے بجائے بعض عنوانات پر مختصر ترین انشائیے ESSAYS شامل ہیں جیسے عادت، خودداری، فرائض انسانی وغیرہ۔

اتنی بات طے ہے کہ مولوی نذیر احمد خاں نے ان خطوط میں اپنے بیٹے میاں بشیر کے حوالے سے نئی نسل کو مخاطب کیا جس طرح انہوں نے "چند پند" اور "مرآۃ العروس" وغیرہ لکھی۔

میاں بشیر کو تحصیل علم کے لیے دہلی چھوڑ کر وہ اپنی تحصیل نگر پہنچے اور پہلا خط ۵ر جنوری ۱۸۷۶ء کو وہیں سے لکھتے ہوئے بار بار اصرار کرتے ہیں کہ وہ انگریزی زبان میں مہارت تامہ حاصل کریں۔ لکھتے ہیں:

> "بشیر خدا کے لیے اب پورا پورا شوق کرو۔ دو تین برس کی محنت ہے... علم تو سب طرح کے ہیں اور طالب علم کو لازم ہے کہ سب کی طرف برابر توجہ کرے لیکن سب پر مقدم ادب ہے جس کو انگریزی میں LITERATURE لٹریچر کہتے ہیں یعنی زبان دانی۔ کمالِ زبان دانی یہ ہے کہ تم کو اہل زبان کی سی قدرت حاصل ہو اس کی تدبیر یہ ہے کہ زبان دانوں

کی عبارتیں یاد ہوں جس طرح کے خیال اور مضمون کو جس پیرائے میں اہل زبان نے ادا کیا ہے اس کی تقلید اور اس کی نقل کرنی چاہیے۔ غرض زبان دانی کیلئے یادداشت شرط ہے محاورات، امثال و حکایات اور لغت اور صلوں کا استعمال جن کو تم پری پوزیشن PREPOSTION کہتے ہو سب پیش نظر رہیں جس تحقیق سے تم مجھ سے عربی پڑھتے تھے کہ ہر ہر لفظ کا مادہ اور ماخذ، صیغہ و ترکیب، کوئی بات چھوٹنے نہیں پاتی تھی یہی تحقیق فارسی اور انگریزی کل زبانوں میں ہے...

زبان دانی کی استعداد بے شک کتابوں کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے مگر اہل زبان سے گفتگو کرنا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے اسی واسطے میں نے تم کو مدرسے میں چھوڑا ہے۔ جہاں تک ہو سکے بری بھلی غلط صحیح ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنی چاہیے... تمہارے ماسٹر ہندوستانی یا انگریزی جو ہوں ان سے اردو میں ایک لفظ مت کہو... ادب اور انکسار کافی ذریعہ لوگوں سے تعارف پیدا کرنے کا ہے۔ اگرچہ تم ابھی اجنبی ہو لیکن جب لوگ دیکھیں گے کہ تم پڑھنے کا شوق رکھتے ہو، امتحان تمہارے اچھے ہوتے ہیں اور استادوں کا ادب تم کو ملحوظ رہتا ہے کسی سے لڑتے جھگڑتے نہیں اور نالائق لڑکوں سے الگ تھلگ رہتے ہو تو ماسٹر لوگ خود بخود تم پر مہربانی کرنے لگیں گے... روز کا کام روز کرنا ضروری ہے غافل لڑکے سبق جمع کرتے جاتے ہیں اور امتحان کے زمانے میں انبارِ مصیبت ہو جاتا ہے۔

اب تم کو اپنا انتظام خود کرنا پڑے گا اس کو سمجھ لو کہ لوگوں پر ہمارے حقوق کچھ نہیں اور ایسے نفوسِ قدسی جو دوسروں کو بے وجہ منفعت پہنچائیں کم ہیں پس اگر کوئی بے اعتنائی کرے تو افسردہ خاطر نہ ہونا چاہیئے۔

خوشامد اور ملن ساری سے اپنا کام نکالنا ہوگا۔" (خط ۱۵ر جنوری ۱۸۷۶ء)

وہ دور چونکہ انگریز عملداری کا تھا اور خود ڈپٹی نذیر احمد انگریزی حکومت میں محکمۂ تعلیمات سے وابستہ تھے اور انگریزی کی اہمیت کے بڑے قائل تھے اس لیے چاہتے تھے کہ میاں بشیر اہلِ زبان جیسی انگریزی سیکھ جائیں تاکہ وہ خود کو انگریزوں کی نگاہوں میں سبک محسوس نہ کریں۔ ابتدائی خطوط میں ڈپٹی نذیر احمد نے انگریزی زبان کے سیکھنے پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ کتابوں سے بھرا ایک صندوق اپنے فرزند کو بھیجتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

"اس ایک صندوق میں اتنی کتابیں ہیں کہ آدمی نظر تحقیق سے ان پر عبور حاصل کرلے تو عالم ہو جائے مگر رکھ چھوڑنے کو تو کتاب اور پتھر برابر ہے کمثل الحمار یحمل اسفارا... ہم سبقوں میں پیچھے رہنا بڑی بے غیرتی کی بات ہے... کسی طرح انگریزی بول چال اور عبارتِ انگریزی کے لکھنے میں یعنی انگریزی کمپوزیشن میں ترقی ہو... یہ ایک مشہور بات ہے کہ آدمی جس شہر میں رہے وہاں کے طبیب اور کوتوال سے دوستی پیدا کرے تم بھی اس بات کا خیال رکھو۔" (۸ر جنوری ۱۸۷۶ء مطابق عید الاضحیٰ مقام تحصیل سکندرپور)

ایک اور خط میں انگریزی پر اصرار کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علم اور لطفِ زبان کی جستجو میں ہم دوسری زبانوں کے حاجت مند ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نری اردو سے کام نہیں چلتا اور چار و ناچار دوسری زبان سیکھنی پڑتی ہے اب دوسری زبان کون سی اختیار کی جائے جس کے ذریعے سے علم حاصل ہو اور بولی کا مزہ ملے۔ سو برخوردار وہ زبان انگریزی ہے کلام الملک ملک الکلام۔ انگریزوں کی تلاش و محنت اس درجے کی ہے کہ کسی قوم نے اس صفت میں ان کی ہم سری نہیں کی۔

اب انگریزی کا یہ حال ہے کہ گنجینۂ علوم ہے۔ یونانی، عربی، سنسکرت اور لیٹن وغیرہ میں جو ذخیرہ تھے انگریزوں نے سب اپنی زبان میں جمع کر لیے ہیں... اب یہ عجیب بات دیکھی جاتی ہے کہ اصلی زبان میں ان علوم کا پتہ نہیں مثلاً جبر و مقابلہ فی الاصل عربی میں تھا اس کا نام الجبرا اس کا گواہ ہے انگریزوں میں کوڑیوں جبر و مقابلے ہیں۔ عربی میں مجھ کو آج تک کوئی رسالہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا مصر و روم میں بھی ہوں گے تو اب اصلی کتابیں معدوم و مفقود۔ اس سے قطع نظر انگریزی، زبانِ حکام وقت ہے اگر اس میں علوم بھی نہ ہوتے تو اس کا زبان حکام وقت ہونا کافی تھا کیونکہ اس صورت میں وہ ذریعہ رسائی ہے غرض جس جس پہلو سے دیکھا جاتا ہے سب سے مقدم انگریزی اس کے بعد عربی۔ اس لیے کہ وہ کلاسیکل ہے۔ فصاحت و بلاغت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ عربی شعار اسلام ہے۔ میرے نزدیک جو مسلمان عربی نہیں جانتا وہ نام کا مسلمان ہے۔"

(خط مورخہ ۲۱ مارچ ۱۸۷۶ء)

انگریزی زبان کی اتنی زبردست وکالت کرنے والے ڈپٹی نذیر احمد اپنے بیٹے میاں بشیر کے اچھی خاصی انگریزی سیکھ لینے کے بعد اس کی برائیاں بیان کرتے ہوئے ایک خط میں مغربی ماحول اور مغربی طرز فکر و انداز رہائش پر کڑی تنقید بھی کرتے ہیں۔ (اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے):

"تم مجھ سے انگریزی تعلیم کی بہت مدح سنتے رہے ہو اس لیے کہ تمھیں انگریزی پڑھوانی منظور تھی اب کہ تم نے اتنی انگریزی پڑھ لی جتنی کوئین ایرس وکٹوریہ کی رعایا میں سے ہر بھلے آدمی کو ضرور ہے تو لو اب اس کی برائیاں بھی سنو کیونکہ ہر چیز میں حسن و قبح دونوں کے

محال ہوتے ہیں ...

یہ میری اکیلے کی رائے نہیں ہے بلکہ عام لوگوں کی اور خود انگریز بھی اس کے شاکی ہیں کہ ہندوستانی انگریزی پڑھ کر مغرور، گستاخ اور خود پسند ہو جاتے ہیں ... اپنا تو مقولہ یہ ہے کہ فارسی لٹریچر نے ہماری تہذیب کو بالکل برباد کر دیا تھا اب اردو پر انگریزی رنگ آتا چلا جا رہا ہے۔ زبان مبالغے اور ابتذال کے عیوب سے بہت پاک ہو گئی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ سیدھی اور صاف بات میں لوگوں کو مزہ ملنے لگا ہے۔۔ انگریزی خواں کل نہیں تو اکثر اپنی ہی سوسائٹی کو نظرِ حقارت سے دیکھنے لگتے ہیں ...

ہم ہی میں کے بگڑے ہوئے مسلمان جن پر انگریزی کی سنوار ہے اور جو انگریزوں سے بڑھ کر پردے کی برائیوں کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں (ان میں سے) ایک تو ہمارے منھ پر کہہ دے کہ اس نے کبھی کسی پردہ دار عورت کو پردے کی سختی کا شاکی پایا ہے ... مجھکو حقیقت میں ہنسی آتی ہے کہ پردے کی وجہ سے مسلمانوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ عورتوں کی کچھ قدر نہیں کرتے اور میں کہتا ہوں کہ پردہ ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ جیسا اپنی عورتوں کو ہم عزیز رکھتے ہیں دنیا میں کوئی قوم نہ رکھتی ہوگی ... رواج پردہ کی موقوفی کا میں سخت مخالف ہوں ..."

(خط نمبر ۱۰۶ صفحہ ۱۴۵)

ڈپٹی نذیر احمد کے برعکس عبدالحلیم شرر نے پردہ کی سخت گیری کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا وہ مضمون جب اکبر الٰہ آبادی کی نظر سے گزرا تو وہ سیدھے عبدالحلیم شرر کے گھر پہنچے اور بغیر آواز دیئے گھر میں گھسنے لگے جب شرر نے احتجاج کیا تو اکبر نے پوچھا کہ کیا دوسروں کو بے پردگی کا مشورہ دینے والے کی گھر والیاں اب بھی پردہ کرتی

ہیں؟ — بگڑے ہوئے مسلمانوں پر انگریزی کی سنوار والی پھبتی ان کی فکر کی غماز ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد انگریزی سوسائٹی کے بہت قریب رہے لیکن انہوں نے اپنی مشرقی بلکہ اسلامی روایات کا مرتے دم تک لحاظ رکھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ناول "ابن الوقت" میں بھی حجتہ الاسلام کے کردار کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کا دلائل و براہین کے ساتھ دفاع کروایا۔ وہ مغربی طرز معاشرت کے خلاف ضرور تھے مگر مغربی تعلیم اور انگریزوں کے خلاف نہیں تھے۔ سیاسی اعتبار سے وہ انگریزوں کی سوجھ بوجھ اور طرز حکومت کے قائل تھے مگر مذہب کے معاملے میں وہ ان سے مصالحت کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

توبتہ النصوح میں بھی ڈپٹی نذیر احمد نے کلیم اور ظاہر دار بیگ کے کرداروں کے حوالے سے سخن سازی اور ریاکاری کی پول کھول کر رکھ دی۔

ناول "ایامیٰ" میں ڈپٹی نذیر احمد نے ہندوستانی بیوگان کی کس مپرسی اور بدحالی کا نقشہ کھینچ کر ان کا گھر بسانے کے جتن کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

اسی طرح اپنے ناول "رویائے صادقہ" میں مادہ پرستانہ ذہنیت کی نفی اور تعلیم جدید سے متاثر ذہن کو صحیح رخ پر ڈالنے کی کوشش ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا یہی اصلاحی نقطۂ نظر ان کے بیٹے کے نام خطوط میں بھی جگہ جگہ بولتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ نمود و نمائش کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ لامذہبیت کو بھی برا سمجھتے تھے چنانچہ اک خط میں (جس پر تاریخ درج نہیں) وہ لکھتے ہیں:

"ہم تو ہندوستانیوں ہی کو ملامت کرتے تھے کہ ان کو دولت کی نگہداشت کا سلیقہ نہیں اور ان کا بہت روپیہ نمود و نمائش میں ضائع ہوتا ہے۔ انگریزوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ہندوستانیوں پر بھی سبقت لیگئے ہیں ہندوستانی تو پھر بھی زیوروں اور باسنوں کے پیرائے میں اپنی دولت کا ایک معقول حصہ پس انداز کرتے ہیں۔ ان (انگریزوں) کے یہاں کاٹھ، کانچ اور گلٹ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا اور قلعی تو اس وقت کھلتی ہے

کہ جب کسی کی بدلی ہوتی ہے اور اسباب نیلام کیا جاتا ہے . . .

انگریزی سوسائٹی کا آخری نقصان دی لاسٹ دوناٹ دی لیسٹ لا مذہبی ہے... انگریزی تعلیم سے (وہ بھی ادھوری) ہماری ملک کے انگریزی خواں آزاد باڈی لامذہب ہوتے چلے جاتے ہیں . . . یہ زمانہ لامذہبی کے شیوع کا ہے۔ بہت تھوڑے سر انگریزی تقلید کے مالیخولیا سے خالی ہیں میں نے تم کو اپنی سمجھ کے مطابق آگاہ کر دیا ہے۔

وما علینا الا البلاغ۔ فقط"

(خط ۱۰۶ صفحہ ۱۵۷)

کاٹھ، کانچ اور گلٹ کے ساز و سامان رکھنے والوں کی قلعی کھل جانے کی بات بہت مزہ دیتی ہے۔ اور بہت تھوڑے سر انگریزی تقلید کے مالیخولیا سے خالی ہیں کا معنیٰ خیز اشارہ خطابی سروں کی طرف بھی ہے۔

ادب کی یہ بڑی بدقسمتی رہی ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسے اساتذہ ادب پڑھانے پر مامور ہوتے ہیں جن کا ادب سے واجبی واجبی سا تعلق ہوتا ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جو ادب میں دستگاہ رکھتے ہیں وہ غیر ادبی مصروفیات کو روزی روٹی کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں یہ صورت حال آج ہی کی نہیں بلکہ سو ڈیڑھ سو سال پہلے بھی تھی۔ ایک خط میں ڈپٹی نذیر احمد ایسے ہی تعلیم یافتہ افراد کا خاکہ اڑاتے ہیں:

"آج کل کے بی۔ اے، ایم۔ اے، بات صاف تو یہ ہے کہ ہملوگوں کی نظروں میں مطلق نہیں جچتے۔ محاورہ الفاظ اور تعلقاتِ سابق و لاحق اور عبارت کے اطراف و جوانب اور مضمون کے مالہٗ و ماعلیہ پر کبھی ان کی نظر کو احاطہ کرتے نہ دیکھا پس ان کی مثال اس غوطہ زن کی سی ہے جس میں قعر دریا تک پہنچنے کا دم نہیں۔ ڈبکیاں لگاتا ہے اور دُرِ مطلب کو نہیں پاتا۔" (خط نمبر ۹۳ بے تاریخ و بے مقام صفحہ ۱۳۶)

ڈپٹی نذیر احمد سرسید کے بڑے معتقد اور ہم نوا تھے لیکن وہ ان کی "مذہبی نیچریت" کو خراج پیش نہیں کرتے وہ اپنی دانست میں سرسید سے یکسر مختلف تھے اور ایک خط میں وہ سرسید کے معتقدات کے متعلق کھل کر تنقید کرتے ہوئے میاں بشیر کو لکھتے ہیں:

"سید احمد خاں صاحب کی شان ایسی ارفع و اعلا ہے کہ ما و شما کو ان کی نسبت کسی رائے کا ظاہر کرنا داخلِ شوخ چشمی ہے جس طرح کا برتاؤ میں نے سید احمد خاں صاحب کے ساتھ رکھا ہے تم کو اس سے میری رائے کا مستنبط کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔۔۔ اس وقت تک سید احمد خاں صاحب کے اخبار یا لکچر یا مواعظ یا تحریرات کا ایک پرچہ کبھی مول نہیں لیا یعنی مجھ کو ان کے معتقدات باسرہا تسلیم نہیں۔ سید احمد خاں صاحب کی تفسیر[1] ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا میرے نزدیک وہ تفسیر دیوانِ حافظ کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے چونتر ڈون سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتابِ تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں صاحب نے منطوقِ آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کیے (اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے) قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے، اور ان معانی کا ماننا مشکل مجھ کو مکرنا پڑا۔ ہاں ہاں میں نے کہا تھا کہ یہ معنی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا نہ جبریل حامی وحی کا نہ رسولِ خدا کا نہ قرآن کے کاتب و مدوّن کا نہ اصحاب کا نہ تابعین کا نہ تبع تابعین کا نہ جمہورِ مسلمین کا مگر میں نے تم کو بار بار منع نہیں کیا کہ مذہب کے گورکھ دھندے کو سلجھانے کا ابھی تمہارا وقت نہیں۔ محکمات کیا کم ہیں کہ آدمی متشابہات کی تاویل میں لاحاصل بھٹکتا پھرے۔" (خط ۹۹ صفحہ ۱۴۰)

[1] تبیین الکلام کی طرف اشارہ ہے۔

مختصر یہ کہ مکتوبات جو ادب کا بہر حال اک حصہ ہوتے ہیں نجی نوعیت کے ہوتے ہوئے بھی مکتوب نگار کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ غالب حالی، سرسید، شبلی اقبال کے خطوط جس طرح اک ادبی شان بھی رکھتے ہیں وہیں مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط بھی نرا "غبار خاطر" نہیں اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کے یہ خطوط اپنے بارہ تیرہ برس کے ساتویں کلاس میں زیر تعلیم بیٹے کو ضرور لکھے گئے ہیں لیکن ان کی ادب آموزی ان کو ادب کا درجہ بھی دیتی ہے۔ قدیم و جدید کتاب کا فرق سمجھاتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں:

"کتاب زمانۂ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے جس قدر پرانی اسی قدر ہم لوگوں میں معتبر و مستند۔ برخلاف انگریزی کے کہ سو برس کی کتاب مثل تقویم پارینہ سلسلۂ درس سے خارج۔ اسی سے ظاہر کہ کسی علم میں ہم نے ترقی نہیں کی۔ کی ہوتی تو عظام رمیم کو کیوں پڑے چچوڑتے" (خط ۹۲ ص ۱۳۶)

ڈپٹی نذیر احمد کے یہ خطوط پڑھنے سننے کے بعد آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ ایک سو بیس سال پہلے لکھے ہوئے خطوط آج کے دور پر بھی کس قدر منطبق ہوتے ہیں یہ عظام رمیم نہیں بلکہ عظیم ہیں۔ ان بوڑھی ہڈیوں میں بڑا کس بل ہے۔

شفیع مشہدی

سوال

نمودِ صبح تیری رنگِ شام بھی تیرے
نسیم تیری، صبا کے خرام بھی تیرے
یہ خم بھی تیرا، صراحی بھی جام بھی تیرے
سمندروں سے گھرے تشنہ کام بھی تیرے
جہاں پناہ بھی عالی مقام بھی تیرے
نبی رسول علیہ السّلام بھی تیرے

سبھی ہیں تیرے تو ہنگامہ کو بہ کو کیوں ہے
ہر ایک سمت یہ منظر لہو لہو کیوں ہے
تو چاک دامنِ ادراک ہی رفو کر دے
نہیں تو میرے جگر کو لہو لہو کر دے

ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھٹکلی

غزل

شیخِ حرم کو ہے روا گرمیٔ قیل و قال بھی
دشتِ جنوں میں چاہیئے جوشِ رمِ غزال بھی

کاش عیاں ہو تجھ پہ یہ نکتۂ پُر جمال بھی
معدنِ انبساط ہے قرب بھی انفصال بھی

لیل و نہار کا تضاد دعوتِ فکر و غور ہے
دفترِ معرفت مجھے گردشِ ماہ و سال بھی

اِس کے بغیر شاعری کاوشِ انحطاط ہے
شعر و سخن کی شرط ہے تزکیۂ خیال بھی

مجھ کو بہت عزیز ہیں زیست کے مختلف یہ رنگ
کرب بھی انبساط بھی زخم بھی اندمال بھی

گردشِ آفتاب ہے دفترِ موعظت مجھے
آئینۂ عروج بھی آئینۂ زوال بھی

جُنبشِ چشمِ پُر فسوں دستِ صنم تراش ہے
نقش گرِ جلال بھی نقش گرِ جمال بھی

قوّت و ضعف کا تضاد مانعِ زندگی نہیں
دشت و جبل میں سُرخرو شیر بھی ہے شغال بھی

فطرتِ کج کلاہ کا خوب تضادِ طبع ہے
روکشِ آفتاب بھی ذرّۂ پائمال بھی

ڈاکٹر احمد عبدالحی
صدر مجلس استقبالیہ

خطبۂ استقبالیہ

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے چودھویں سالانہ مذاکرہ علمی بہ عنوان اسلامی "نشأۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ" کے موقع سے بتاریخ ۳ اکتوبر ۱۹۹۷ء بمقام خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹھا گیا۔ گورنر بہار محترم قدوائی صاحب بھی اس موقع پر موجود تھے۔

الحمد للہ رب العالمین و بہ نستعین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد صدر محترم!

علماء کرام! دانشوران ملک وملت، بالغ نظر ادباء وشعراء عظام!

دبستان عظیم آباد کے اہم ادبی مرکز میں آپ کا استقبال کرتے ہوئے جو کیف وسرور، مسرت وانبساط ہم محسوس کر رہے ہیں اسے الفاظ کا جامہ پہنانا ہمارے لیے بڑا مشکل اور دشوار امر ہے ہم کیفیات کی وسعت کو الفاظ کی تنگنائی میں نہیں سمو پا رہے ہیں اور شاید ایسا ممکن بھی نہیں ہے، عظیم آباد کی اس تاریخی سرزمین پر آپ کا آنا مبارک ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ادب اسلامی کا جو کارواں ہندوستان میں ۱۹۸۱ء سے رواں دواں ہوا ہے۔ یہ سمینار اس میں نئے باب کا اضافہ کرے گا، فکر ونظر کے نئے گوشے سامنے لائے گا۔ مخرب اخلاق اور لادینی لٹریچر کے اس دور میں ادیبوں اور شاعروں کو نئے منازل سے روشناس کرائے گا، نیز ادب میں مذہبی حیثیت کو فروغ دینے اور اسلامی نشأۃ ثانیہ پر کام کرنے والے ادباء

شعراء کو تیز گام کرنے کے لیے نئے طریقوں اور راستوں کی جستجو میں کامیاب ہوگا۔

حضرات! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اردو زبان و ادب میں بہار کی خدمات ہمیشہ وقیع رہی ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ عظیم آباد کا شمار بھی ایک دبستان کے طور پر کیا جاتا ہے۔ راسخ، شاد علامہ فضل حق، بیدل، امداد امام اثر قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، سید حسن، عطا کاکوی، وہاب اشرفی، رضا نقوی واہی، سید حسن عسکری کلیم الدین احمد، محسن عظیم آبادی، شفیع مشہدی، مولوی سمیر احمد، عبدالصمد وغیرہ کا نام ہندوستان کے گنے چنے ادیبوں میں لیا جاتا ہے جنھوں نے شعر و ادب تحقیق و تنقید میں نمایاں خدمات انجام دیئے ہیں۔ بہار کے جن ادباء و شعراء نے ادب کو اسلامی رجحانات کے تابع کر کے اس سے اسلامی نشأۃ ثانیہ کا کام لیا۔ ان میں مرحومین میں مولانا ظہیر الدین شوقی نیموی، ملا محب اللہ بہاری، سید سلیمان ندوی، مناظر احسن گیلانی، مسعود عالم ندوی، شاہ سلیمان پھلواروی، ابوالحسن فرد پھلواروی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن وغیرہ، اور زندوں میں مشہور محقق اور ناقد ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، ڈاکٹر کلیم عاجز، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر احمد سجاد، مجاہد الاسلام قاسمی ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔

اردو صحافت میں امارت شرعیہ کے ترجمان "نقیب" اور مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے ترجمان "الہدیٰ" امارت اہلحدیث کے ترجمان "دعوت صادق" پٹنہ، جامعہ رحمانی کا "صحیفہ" خانقاہ مجیبیہ کا "المجیب" اپنے آغاز سفر سے مانگ رحیل کا کام کر رہا ہے، اور یقینی طور پر اس نے اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لیے کام کرنے والوں کو نئی جہت اور نئے سمتوں سے روشناس کرایا ہے۔ اداروں میں امارت شرعیہ پھلواری شریف خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، اور امارت اہلحدیث صادق پور نے اسلامی ادب کے لیے فضا ہموار کرنے، اسلام کی ترویج و اشاعت، صالح قدروں کے فروغ اور باطل

طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کی ایسی مثال قائم کی ہے جو ہندوستان کے بعض بعض صوبوں میں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ خاص کر امارت شرعیہ پھلواری شریف نے مولانا سجاد کی بدولت ایک امیر کے تحت زندگی گزارنے کا جو مزاج ملت کو دیا ہے۔ وہ حد درجہ قابل قدر ہے۔ ناممکن ہے کہ بہار کے تذکرہ میں حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کا تذکرہ نہ آئے جن کا روحانی فیض یہاں کی خانقاہوں اور مختلف سلسلوں کے ذریعہ جاری ہے۔

مہمانان کرام! ادب اسلامی اور اس کے متعلقات پر عالمگیر شہرت کے حامل ادارہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری میں بھی سمینار و سمپوزیم کے توسط سے خاصہ کام ہوا ہے۔ عربی اور فارسی کے مخطوطوں اور خصوصی انتظام و انصرام کے لیے مشہور اس ادارہ کو مختلف علوم و فنون کے گراں قدر قلمی نسخوں کی وجہ سے پوری دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ ان دنوں اس ادارہ کی سربراہی عزت مآب ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی کے سپرد ہے۔ اور انتظامی ذمہ داری جناب حبیب الرحمان چیغانی کے سپرد ہے۔ جن کو ان موضوعات سے خاص دلچسپی ہے اور جن کا بیش قیمت تعاون اس سمینار کے انعقاد میں مجلس استقبالیہ اور رابطہ ادب اسلامی کو ملا ہے۔

دانشوران ملک و ملت!

عرصہ سے ادب، ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے اصولوں پر گردش کرتا رہا ہے۔ ادب برائے ادب نے سماج کو جنسی انارکی، رومانی ادب، سوقیانہ اشعار، گل و بلبل کی داستان، طلسم ہوشربا، لیلیٰ مجنوں کے قصے، شیریں فرہاد کے واقعات، اور وقت گزاری کے لیے سستا ادب فراہم کیا ہے۔ ادب برائے زندگی کے اصول میں بظاہر بڑی دلکشی ہے۔ لیکن اس کے بطن سے جو چیز برآمد ہوئی ہے وہ کبھی کبھی خدا بیزار زندگی ہے۔ روٹی، روزی کا مسئلہ اور ایک ناقد کے بقول وہ ایک بنیا کا ایک روزنامچہ بھی ہے۔ ظاہر ہے اسلام کسی ایسی ادبی تحریک کا ساتھ

نہیں دے سکتا۔ جو انسان کو خدا بیزار بناتا ہو اور جو صرف معاشی تگ و دو اور سیاسی منظر پس منظر کے گرد چکر لگاتا ہو ان دونوں نظریوں کے مقابل اسلامی ادب ہے۔ جو ادب برائے زندگی کو وسیع کینوس فراہم کرتا ہے جس میں ۔ ادب کو مقصد نہیں وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اسلامی مفاہیم و تصورات، اصول و اقدار کی رعایت کی جاتی ہے، ایسا ادب دلوں کو گرماتا، روح کو تڑپاتا، جذبات کو برانگیختہ کر کے انسانی دردمندی پیدا کرتا ہے، وہ ایک طرف زندگی کی ضروریات اعلیٰ اخلاقی اقدار، اسلامی افکار وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے دوسری طرف اس میں فنی حسن ہوتا ہے پختگی ہوتی ہے، فن کی نزاکتوں کا احساس ہوتا ہے اور وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ایک اچھے ادبی شہ پارے کی خصوصیات ہوتی ہے۔

اس وجہ سے ہر وہ مضمون جو اسلامی موضوعات پر لکھا گیا ہو اسے اسلامی ادب نہیں قرار دیا جا سکتا، ممکن ہے کتاب سیرت کے موضوع پر ہو اشعار نعتیہ ہوں حمد و منقبت ہوں، مگر وہ فن کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے ادب اسلامی کے زمرے میں داخل نہ کیے جا سکتے ہوں۔

حضرات! اسلامی ادب کوئی تخیل نہیں واقعہ ہے، اور اس پر بہت کچھ لکھا جا تا رہا ہے۔ اور اب ان لوگوں نے بھی اسے تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے جن کے حلق سے اسلامی ادب کی ترکیب نیچے نہیں اترتی تھی۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے، لیکن ہمیں رابطہ ادب اسلامی کے مقاصد کو پانے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ابھی ہم نے صرف ادب اسلامی کے فروغ اور اس کے قدیم خدوخال کو نمایاں کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے کسی قدر نقد ادب کے اسلامی اصول کی تدوین پر بھی کام ہوا ہے، لیکن ابھی جدید ادبی فنون خاص طور سے افسانہ، ڈرامہ، ناول اور سوانحی ادب کے ادبی معیار کے لیے مفصل نظام کی ترتیب اور ان تمام فنون کو بامقصد اسلامی ادب کے تابع کرنا باقی ہے۔ اسلامی ادب کی نمائندہ قابل قدر اور دلکش ادبی تخلیقات اور نگارشات کی جمع و تدوین کا کام بھی ابھی ہونا ہے۔ غیر اسلامی اور باطل ادبی تحریکات کے مقابلہ اور ان کے عیوب و نقائص اور خطرات سے آگاہ کرنا بھی ہے جس سے مستقبل قریب میں اسلامی ادب کی تحریک اور زور

پکڑے گی اور اس سے اسلامی اقدار کے فروغ میں مدد ملے گی۔ اخیر میں ہم مقامی طور پر جن اداروں کے ذریعہ اس سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ فلیم، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ۔ امارت شرعیہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ورلڈ اسکول اور انٹرنیشنل اسکول کے ذمہ داران اور مجلس استقبالیہ کے دیگر ممبران کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جن کی شب و روز کی جہد مسلسل تعاون اور رضا کارانہ محنتوں سے اس سیمینار کی ساری تیاریاں مکمل ہوئیں۔ اور ہم آپ حضرات کا استقبال کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ہمیں احساس ہے کہ اپنی بہترین صلاحیتیں لگانے کے باوجود آپ حضرات کی ضیافت کا معقول اور مناسب بندوبست نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں ہم مجلس استقبالیہ کی طرف سے اپنی ساری کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کے لیے معذرت خواہ ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہم جس عظیم مقصد کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس کے پیش نظر چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور ہلکی پھلکی تکالیف کو نظر انداز کر کے آپ حضرات ہمیں مشکور فرمائیں گے۔ ہم آپ کی فراخدلی سے پُر امید ہیں کہ آپ کی نگاہ ہمارے حوصلوں اور جذبوں کی طرف ہو گی۔ کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کی طرف نہیں۔

ان ہی چند جملوں پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں اور ایک بار پھر آپ حضرات کا دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ اھلاً وسھلاً مرحبا۔ شکریہ

(رابطہ ادب اسلامی ہند کا ۱۴واں سیمینار)

اسلامی بیداری میں ادب کا حصّہ

مقام:- عظیم آباد پٹنہ از ۳ تا ۵ اکتوبر ۱۹۹۷ء

رپورٹ از: ـــــ سکریٹری رابطہ ادب اسلامی عالمی

حضرات! ادب، آدمی کے احساسات و تصوّرات کو ایسے الفاظ و عبارت میں پیش کرنے کا نام ہے جو ان احساسات و تصوّرات کو ان کی فطری کیفیت و حرارت کے ساتھ منتقل کر سکتے ہوں، یہ منتقلی ان کی کیفیت و حرارت کے جتنی مطابق ہوتی ہے، اتنا ہی اس کو کامیاب سمجھا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کے احساسات اور تصوّرات کی گرمی اور کیفیت بڑی حد تک ان کے پس منظر کے واقعات اور حوادث سے تعلّق رکھتی ہے، یہ احساسات و تصوّرات عام طور پر تکلیف دہ حالات و معاملات میں تیز اور اشر انگیز بن جاتے ہیں، اور اسی طرح قلبی راحت، ذہنی لطف و لذّت اور دل پسند حالات پس منظر میں ہوں تو ان کے ادب میں ان کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

ہندوستان اور پورے عالم اسلام کے گزشتہ دو سو برس مسلمانوں کے لیے بڑی شکستگی اور کرب کے گذرے ہیں، ہندوستان اور عالم اسلام کے چپہ چپہ میں یورپ کی استعماری طاقتوں نے سیاسی ظلم و حق تلفی اور عسکری زور دستی سے کام لیا، ہندوستان میں عسکری سطح پر سلطان ٹیپو شہیدؒ کی شہادت سے مسلمانوں کے دلوں پر جو زخم لگا وہ مندمل تو کیا ہوتا اس کے برعکس یہ ہوا کہ اس کے صرف نصف صدی کے بعد ہی ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے مسلمانوں کی کمر توڑ دی، جذبۂ آزادی

اور اسلام نوازی کے حاملین کو جس طرح چن چن کر قتل کیا گیا۔ اس کا بیان بھی روح فرسا ہے، لیکن غیرت مند اور باہمت افراد نے جد وجہد میں کوتاہی نہیں کی، حضرت سید احمد شہیدؒ کے ماننے والوں کی جد وجہد اس سلسلہ میں ممتاز مقام رکھتی ہے، انھوں نے یہ جد وجہد صرف عملی میدان ہی میں نہیں، علمی میدان میں بھی کی، اور اس سے بھی ایک ادب وجود میں آیا۔ اس وقت کے تکلیف دہ واقعات نے ان حضرات کے علاوہ دیگر تمام حساس مسلمانوں کے دلوں کو چھلنی کیا، ان میں جو ادبا اور شعراء تھے، ان کے دلوں میں جذبات کرب والم ابھرے، اور ان کی نثر ونظم میں ڈھلے، انگریزوں کا کوڑا مسلمانوں کے سروں پر منڈلا رہا تھا، اس میں خوف واحتیاط کے ساتھ جتنا کہا جا سکتا تھا، وہ سلیقہ سے کہا جانے لگا، ہم کو اس کے اثرات علامہ شبلیؒ کی تحریر کردہ کتابوں کی مختلف عبارتوں میں اور ان کی قومی نظموں میں، اور اکبر الہ آبادی کے شعری طنزیات اور نظموں میں، اور مولانا حالی کی عظمت اسلام، پھر زوال وبربادی کی مؤثر شاعرانہ تصویر کشی میں ملتے ہیں، جن سے دکھے دلوں کی تسکین ہوتی تھی، اور حوصلہ کو مہمیز لگتی تھی، عظمت اسلام کے تذکروں سے نوجوانوں کا خون بڑھتا تھا، یہ اسلامی ادب کا ایک قابل قدر حصہ بنا، جس نے اسلامی عظمت کی تجدید کا جذبہ پیدا کیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ صرف ہندوستان کے مسلمان ہی سامراج کے ظلم وجبر دستی کا شکار نہ تھے بلکہ ممالک اسلامیہ کے نشانِ عزت، خلافت عثمانیہ ترکی بھی مغرب کی سامراجی سازشوں کا شکار بنی ہوئی تھی، جو بالآخر ختم کردی گئی، اس کے ختم ہونے کا اثر ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات پر بے انتہا پڑا۔ اور اس کے نتیجہ میں زبردست خلافت تحریک شروع ہوگئی، مغربی سامراج نے صرف اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ اس کے اہل علم وادب اپنے اپنے وسائل سے اسلام اور مسلمانوں کو مختلف انسانی خرابیوں سے متہم کرنے میں لگ گئے، ان میں سے اسلامی علوم وفنون کا علم رکھنے والے اسلامی تاریخ، سیرت نبوی، اسلامی شریعت میں سے ایسے ایسے اجزاء تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگے جن کی غلط تشریح کے ذریعہ وہ اسلامی ثقاہت وشرافت کو مشکوک وداغدار بنانے کا کام لیتے، چنانچہ مغربی درس گاہوں میں پڑھنے والے اور مغربی اہل قلم کی پیش کردہ اسلامی علوم وثقافت کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے نوجوان

سخت خلجان میں پڑنے لگے، ایک طرف مغربی اہل قلم کی تحقیقی امانت و دیانت کا پروپیگنڈا ان کے سامنے تھا، دوسری طرف ان کے قلم سے اسلام و مسلمانوں کی بے توقیری ہو رہی تھی، یہ وہ سب اسباب تھے جنھوں نے اہل غیرت مسلمانوں کے قلموں اور زبانوں میں جوش پیدا کر دیا۔ جو اہل تصنیف کی تصنیفات میں اور اہل ادب کے ادبوں میں جھلکنے لگا علامہ شبلی، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر کی نظموں اور نثری پیکروں میں ان کے جذبات ملّی اور احساسات اسلامی کے نمونے ملنے لگے، پھر مولانا ابوالکلام آزاد۔ عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا احمد سعید دہلوی کی تقریروں میں اس کی جھلک نمایاں ہوئی، دوسری طرف دعوتی و کلامی لٹریچر، شگفتہ و دل آویز انداز میں ظہور میں آنے لگا، جس کا سلسلہ تا حال قائم ہے، اس نے اور دیگر اقسام کی ادبی کوششوں نے بہت سے مسلمان نوجوانوں کو شک و دین بیزاری سے بچا لیا، اور بہت سے نوجوانوں کے دلوں میں جذبہ و ولولہ پیدا کر دیا۔

برصغیر کے یہ اہل تحریر و تقریر اپنی مذکورہ بالا کوشش عموماً اردو میں پیش کرتے تھے، جو برصغیر کے مسلمانوں کی مشترک زبان رہی ہے، لیکن عالم اسلام کے دوسرے خطوں میں ایسی کوشش اپنی اپنی زبانوں میں کی گئی، عرب دنیا میں ان کوششوں کا آغاز اسلامی عظمت کی بحالی کے مشہور داعی جمال الدین افغانی سے ہوا۔ اس میں ان کے خاص رفیق کار و شاگرد مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا ہوئے، شام میں عبدالرحمٰن کواکبی، عبداللہ ندیم اور ان کے علاوہ مصر و شام کے متعدد خالص ادب کے فاضلوں نے بھی اس سلسلہ میں حصہ لیا، ان میں خاص طور پر مصر کے مصطفےٰ صادق الرافعی، مصطفےٰ لطفی منفلوطی اور ان کے بعد متعدد ادبا اس فہرست میں نمایاں ہیں، شام و عراق کے متعدد سیاسی رہنماؤں کا بھی اس میدان عمل میں حصہ رہا، پھر اس کام میں زیادہ تیزی شیخ حسن البناؒ کی جدوجہد سے آئی، اور خود ان کے متعدد فاضل رفقاء کے ذریعہ بڑا کام ہوا، مغرب اقصیٰ میں عبدالحمید بادیس اور محمد البشیر الابراہیمی اس سلسلہ کے اہم اشخاص ہیں، ترکی میں شعراء اور ادبا کے زمرہ سے محمد عاکف اور مصلحین سماجی کارکنوں میں شیخ سعید نورسی قابل ذکر ہیں۔

عالم اسلام کے دوسرے خطوں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کی عظمت کو بحال کرنے کے تقاضہ وضرورت کے احساس نے اہل ادب واہل قلم کو متحرک کیا، اور ان کے ادب نے قابلِ ذکر خدمت انجام دی۔

مذکورہ بالا ادبی کاوشوں کا تعارف اس عہد میں ادب اسلامی کی اصطلاح سے نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ اس دور میں ادب کی سرپرستی اور خدمت کرنے والے تمام لوگ اسلام پسند اور اسلامی قدروں پر یقین رکھنے والے تھے، لیکن بتدریج مغربی تعلیم وثقافت کے اثر سے مذہب پسندی کو زوال آنا شروع ہوگیا، اور مذہب کے بارے میں تشکیک اور مادّہ پرستی الحادی شکل میں اور خاص طور پر ادب کے علمبرداروں میں پھیل گئی، پھر کمیونسٹوں کے اثر ورسوخ کے بڑھنے سے ادب کو مذہب کے بالمقابل بنادیا گیا، اسلامی قدروں کو ادب کے لیے ایک غیر اور بیرونی خصوصیات کا سمجھ لیا گیا، ایسی صورت میں اسلامی قدروں پر یقین رکھنے والوں کو ادب کے لیے بھی تحریک آزادی چلانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اس طرح ادب اسلامی کی اصطلاح وجود میں آئی۔ یہ ادب کو اسلامی شناخت دلانے کا کام تھا، اس پر باقاعدہ اور وسیع دائرہ میں توجہ دینے کے لیے ہی رابطۂ ادب اسلامی عالمی کا قیام عمل میں آیا، ہمارے رابطہ ادب اسلامی نے اپنے میدان عمل کو موضوعات اور زمینی رقبے کے اعتبار سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر بنانے کی کوشش کی ہے، اور الحمدللہ وہ اس سلسلہ میں کامیابی سے دور نہیں ہے، اس میدانِ عمل میں کام رابطہ کے قیام سے پہلے سے ہی ہو رہا تھا، جس میں جماعت اسلامی کے لوگوں کا بھی قابل قدر حصّہ ہے، خاص طور پر خالص ادب کے میدان میں ان کا کام قابل ستائش ہے۔

حضرات! ہمارے ادب اسلامی کے کام کا سلسلہ ندوۃ العلماء کے مقاصد اور لائحہ عمل سے ملتا ہے، اور یہ ندوۃ العلماء کے پروگرام کے ہی مطابق تھا کہ آج سے ۱۶ سال قبل ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اسلامی رجحان کی رعایت اور اس کی روح کی پابندی رکھنے والے ادب کی ضرورت اور ذخیرۂ ادب میں اس کے نمونوں کی تلاش اور اس میں اضافے کی ضرورت کے موضوع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی صدارت میں عالمی اجتماع منعقد ہوا، اور اس میں نہ صرف

ہندوستان بلکہ عالم عربی اور عالم غیر عربی کے نمائندوں نے معتد بہ تعداد میں شرکت کی، اور اپنے خیالات کا اظہار کیا، یہ اجتماع برگ و بار لایا اور اس کی بازگشت اولاً جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں سنی گئی اور اجتماع ہوا۔ پھر جامعہ امام محمد بن سعود میں اس کو مذاکرۂ علمی کا موضوع بنایا گیا، دوسری طرف خود ندوۃ العلماء کے اجتماع کی قرار داد کے ذریعہ ادب اسلامی کے مقصد کی تقویت کے لیے ایک سکریٹریٹ قائم ہوا، جس نے پانچ سال کے اندر ادب اسلامی کے موضوع پر دو سیمینار منعقد کیے، پھر تیسرے سیمینار میں باقاعدہ عالمی انجمن برائے ادب اسلامی کے قیام کا اقدام کیا، اس کے لیے عرب یونیورسٹیوں کے متعدد اسلامی الفکر ادبا نے اپنی ایک نشست مکہ مکرمہ میں منعقد کی، اور اس میں اس کا فیصلہ کیا، اور ندوۃ العلماء ہی میں اس کا صدر دفتر اور ندوۃ العلماء کے مؤقر ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہی کو اس انجمن کا صدر بنانا طے کیا، اور یہ طے کیا کہ ندوۃ العلماء میں جہاں سے یہ آواز اٹھی ہے وہیں دوبارہ عالمی اجتماع کر کے اس فیصلہ کی توثیق کر دی جائے۔ اور اس توثیق کے بعد کام کا آغاز کر دیا جائے، چنانچہ ۱۹۸۶ء میں یہ اجتماع منعقد ہوا، اور رابطہ ادب اسلامی کے نام سے انجمن قائم ہو گئی، جس کے صدر مولانا مدظلہ منتخب ہوئے، اور صدر دفتر ندوۃ العلماء میں قائم ہو گیا، کام کی علاقائی وسعت کے پیش نظر انجمن کو دو بازوؤں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک بازو بلاد عربیہ مشرق میں واقع ممالک کا جس کا علاقائی دفتر بھی ندوۃ العلماء ہی میں رکھا گیا، دوسرا بازو عرب ممالک کا بنا، جس کا علاقائی دفتر ریاض میں رکھا گیا، دونوں دفتروں کے تحت ملکی سطح پر شاخیں قائم کی گئیں، رابطہ ادب اسلامی عالمی کے مشرقی بازو کے تحت کئی ملکوں میں ملکی سطح کے دفاتر بھی قائم ہو چکے ہیں جو اپنے اپنے ملک کے دائرے میں ادب اسلامی کی تقویت اور فروغ کے لیے کام انجام دے رہے ہیں ان میں قابل ذکر ملیشیا، انڈونیشیا، بنگلہ دیش اور پاکستان کے ملک ہیں ان میں سے ہر ایک میں ارکان کی کمیٹی اور صدر و ناظم ہیں، اور ان مراکز کا کام علمی و ادبی کوششیں کرنا اور تحریری اور صحافتی دائرے میں ادب اسلامی کے کام کے لیے کام کرنا ہے جو الحمد للہ اچھے ڈھنگ سے انجام دیا جا رہا ہے۔

سال رواں ہندوستان کی وسعت کے پیش نظر یہاں بھی ملکی دائرے میں کام کرنے کیلئے

دہلی میں باقاعدہ مرکز قائم کردیا گیا ہے جس کے مدیر پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی سابق صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی اور ان کے نائب پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی اور دوسرے نائب ثقافتی و علمی کاموں کے لیے ڈاکٹر محسن عثمانی ریڈر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی مقرر ہوئے ہیں اس مرکز نے بھی قیام کے بعد سے ادب اسلامی کے فروغ کے لیے کام شروع کردیا ہے، کئی علمی ادبی نشستیں کی ہیں جن میں مقتدر ادباء و اساتذہ نے شرکت کی۔ اس طرح آج سے ۱۶ سال قبل اٹھنے والی آواز دنیا کے مختلف علاقوں میں بتدریج عملی شکل میں پھیل گئی، والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

عرب بازو کے دفتر نے اپنے علاقے میں متعدد سیمینار منعقد کئے، اور ادب اسلامی کے مزاج و روح کے حامل ادب کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا، اسی کے ساتھ ہمارے مشرقی بازو کے دفتر نے بھی متعدد مؤتمر سیمینار منعقد کیے جن کا اوسط فی سال ایک سیمینار رہا، چنانچہ یہ اس کا ۴۱ واں سیمینار ہے جو پٹنہ میں منعقد ہو رہا ہے۔

رابطہ ادب اسلامی اپنے ان سیمیناروں کو ایک طرح سے بین الاقوامی سطح سے کرتا ہے۔ اس میں ایشیا سے افریقہ تک مختلف ملکوں سے ادب اسلامی کا احساس رکھنے والوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اور ان میں سے ایک قابلِ لحاظ تعداد، الحمدللہ اس میں شرکت کرتی ہے، جن میں باہری ملکوں کے متعدد فضلاء اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کے مشرقی شعبوں کے اساتذہ اور صدور شعبہ اور اسلامی درس گاہوں اور علمی اداروں کے ارکان و صدور بھی ایک تعداد میں شرکت کرتے ہیں، ہر سیمینار میں نئے قسم کا موضوع اختیار کیا جاتا ہے، جیسا کہ پٹنہ کے اس سیمینار میں "اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ" اختیار کیا گیا ہے، نشأۃ ثانیہ سے ہماری مراد مغرب کے تمدنی و سیاسی غلبہ کے اس عہد میں مسلمانوں کی علمی و تمدنی پس ماندگی اور انحطاط کو دور کرنے کی کوششوں سے ہے۔ لہٰذا اس عہد میں ادب کی راہ سے جو کوششیں ہوئی ہیں وہ ہمارے موضوع بحث میں آتی ہیں۔

حضرات! رابطہ ادب اسلامی کے عربی ممالک کے بازو کے تحت جو سیمینار منعقد ہوئے

وہ قاہرہ میں، استنبول میں، مدینہ منورہ میں، ریاض میں، عمان اردن میں، مراکش میں، برطانیہ میں اور دیگر مقامات پر ہوئے، اور انھوں نے الادب الاسلامی کے نام سے ایک موقر علمی ادبی مجلہ بھی نکالا جو تین سال سے سہ ماہی مدت پر برابر نکل رہا ہے۔

ہمارے مشرقی بازو کے سیمینار لکھنؤ، جے پور، حیدرآباد، اورنگ آباد، بھوپال، بنارس، اعظم گڑھ، رائے بریلی اور چٹاگانگ (بنگلہ دیش) میں منعقد ہوئے۔ اور اسی ماہ کے آخر میں لاہور پاکستان میں منعقد ہونے جارہا ہے، اور آج پٹنہ میں ہو رہا ہے، اور صحافتی دائرہ میں اس نے شروع کے چار سال تک، ایک عربی ماہانہ ضمیمہ نکالا، اور اب تین سال سے ایک موقر علمی و ادبی سہ ماہی مجلّہ "کاروان ادب" کے نام سے نکال رہا ہے، اس میں علمی ادبی مضامین کے ساتھ ہر شمارہ میں کسی نہ کسی ایک سیمینار کے منتخب مقالات شائع کیے جاتے ہیں، آج سے قبل تک رابطہ کے ۱۳ سیمینار ہو چکے ہیں اور مجلّہ کے تیرہ شمارے بھی ہو گئے ہیں، اور آج سے شروع ہونے والا سیمینار اس سلسلہ کا ۱۴واں سیمینار ہے، جس کے استقبال وضیافت کی ذمہ داری اس شہر کی مقتدر و سربرآوردہ اور محبوب شخصیت ڈاکٹر احمد عبدالحی اور ان کے مخلص رفقا نے قبول کی ہے، ان کی رہنمائی میں اس شہر کے کئی مسلم ادارے اس فریضے کو انجام دے رہے ہیں، ان میں خاص طور سے شمس الہدیٰ کا ادارہ، خدابخش لائبریری، ادارہ فلیم قابل ذکر ہیں۔ ہم ان کے بہت مشکور ہیں۔

حضرات! پٹنہ کی مختلف ملّی اور قومی خصوصیات کی بنا پر اس کی شہرت عرصہ سے قائم ہے اس شہرت میں ادب کا بھی حصّہ ہے، اردو زبان کے مراکز میں سے عظیم آباد ایک بڑا مرکز رہا ہے یہاں کے اہل علم ادب کا ذوق رکھتے ہیں اور اس کی قدردانی میں شہرت رکھتے ہیں، ادب میں اسلامی کا تصوّر ان کے لیے کوئی اجنبی نہیں، اس کے علاوہ یہاں امارت شرعیہ جیسا موقر اور دینی ضرورتوں کو انجام دینے والا ادارہ ہے، خدابخش کی عظیم القدر لائبریری ہے، شمس الہدیٰ کے مدارس کا مرکز بھی ہے، خانقاہ مجیبیہ اور مرکز اہل حدیث جیسے گہوارۂ علم و دین ہیں، اور یہیں صادق پور کا وہ مقام ہے جس نے اسلامی فکر و عمل کی شاندار مثالیں پیش کیں۔ یہاں علم کی سرپرستی کرنے والا ایک

نیا ادارہ فلیم ہے، جس کے کارگزار ممتاز اہل قلم ہیں اور سربراہ ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب ہیں۔

ان روشن گوشوں کے درمیان ہمارا یہ سیمینار شروع ہو رہا ہے، ہم اپنی مسرّت کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہمارا یہ سیمینار اچھے نتائج پیدا کرے۔ اور ہم کو فکر انگیز اور مفید مقالوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے، اور رابطہ ادب اسلامی کے سنگ میلوں میں یہ ایک شاندار سنگِ میل ثابت ہو۔

محمد رابع حسنی ندوی

ابتدائیہ

رابطہ ادب اسلامی کا سال گذشتہ کا مذاکرۂ علمی گہوارۂ علم و ادب عظیم آباد و اطراف عظیم آباد (پٹنہ) میں منعقد کیا جانا طے ہوا تھا، یہ اس علاقہ میں رابطہ کا پہلا مذاکرۂ علمی تھا، اہالیان پٹنہ و بہار نے اس مذاکرۂ علمی کی میزبانی کی ذمہ داری لی تھی اور اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی نبھایا۔

یہ مذاکرۂ علمی ۳ - ۵ / اکتوبر ۱۹۹۷ء کو "اسلامی نشاۃ ثانیہ میں ادب کا حصّہ" کے موضوع پر منعقد ہوا، اس میں ہندستان کے ممتاز اہل بحث و تحقیق ادیبوں نے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کئے، مقالات کی تعداد ۴۰ سے اوپر تھی، ان میں کاروان ادب کے صفحات کی گنجائش کے پیش نظر ہم صرف چند ہی مقالات کا انتخاب اس شمارہ میں دے رہے ہیں، امید ہے کہ ان سے مذاکرۂ علمی کے تمام مقالوں کی نمائندگی ہو جائے گی، بقیہ مقالات انشاءاللہ آئندہ شماروں میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

کاروان ادب ایک منفرد معیاری ادبی مجلہ ہے، صرف اس لیے نہیں کہ یہ خالص اسلامی ادب کے موضوع پر ہے، اور اس کا مقصد صالح اور بامقصد ادب کی آبیاری کرنا اور اس کو فروغ و ترقی دینا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر شمارہ میں کسی ایک موضوع پر بہت سے وقیع مضامین یکجا مل جاتے ہیں، جس سے درس و تحقیق و تصنیف کے کارپردازوں کو بہت مدد مل سکتی ہے اس طرح اس کا ہر شمارہ آئندہ علمی کام کرنے والوں کے لیے ایک معتبر علمی و ادبی سرچشمہ اور سرمۂ چشم کشا ثابت ہوگا۔

اسلامی نشأۃ ثانیہ کے موضوع پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے، اس کے آثار و نتائج سے انکار ممکن نہیں ہے، لیکن ادبی حیثیت سے اس کا جائزہ غالباً بہت کم لیا گیا ہے اور جو کام ہوا بھی ہے تو وہ متفرق ہے، کہیں یکجا نہیں ملتا۔ اس حیثیت سے بھی کاروان ادب کی اور خاص طور سے اس تازہ شمارہ کی بڑی اہمیت ہے۔

امید ہے کہ ہمارے قارئین کو مقالات پسند آئیں گے اور وہ ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مفید و مقبول بنائے۔ آمین

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

اسلامی بیداری میں ادب کا حصّہ

خطبۂ صدارت رابطہ ادبِ اسلامی، پٹنہ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النّبیین محمّد وآلہ وصحبہ أجمعین۔

ادب کی بڑی خاصیت وقوت یہ ہے کہ وہ رجحانات ومیلانات اور عمل، طرزِ فکر اخلاق اور انقلاب کے محرکات پیدا کرتا ہے اس لیے وہ بہت مفید بھی ہوسکتا ہے اور بہت مضر بھی، وہ بڑی تعمیری طاقت بھی ہے اور تخریبی بھی، اس لیے اس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس کو تعمیر کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور تخریب کے لیے بھی، اور ان دونوں کے مظاہر ہر دور میں دیکھنے میں آتے ہیں، وہ معاشروں کی تخلیق بھی کرسکتا ہے اور حکومتوں کی تعمیر وتاسیس بھی، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ اس کو صحیح رُخ پر لگایا جائے، اس کو تخریب، انتشارِ خیال، لذّت اندوزی اور نفس پروری کا ذریعہ بننے کے بجائے خیر پسندی، صلاح وتقویٰ، ضبطِ نفس اور صحیح رہنمائی کا آلہ اور ہتھیار بنایا جائے۔

ادب واخلاق اشیاء کے نام یا معانی ومقاصد کے نام بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان ناموں کے انتخاب میں قوموں کی نفسیات، ثقافتوں اور زبانوں کی نفسیات کی جھلک

نظر آتی ہے، یہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دینے کی بات نہیں ہوا کرتی بلکہ اس میں بڑے وسیع معانی پوشیدہ ہوا کرتے ہیں، ان ہی اسماء یا اصطلاحات میں سے ایک لفظ "ادب" بھی ہے اور میں کم و بیش مغرب یا مشرق کی جتنی زبانیں جانتا ہوں اور جن میں مجھے بھی کچھ کام کرنے کا موقع ملا ہے ان میں سے کسی میں بھی مکتب خیال، نازک اور پاکیزہ احساسات وجذبات اور ایمان وعقیدہ کی تعبیر کے لیے ادب جیسا کوئی لفظ نہیں ملا، جسے عربوں نے اختیار کیا ہے، ادب کا لفظ ہمیشہ اخلاق کے مفہوم سے وابستہ رہا ہے اور جب تک عربی زبان زندہ رہے گی یہ وابستگی باقی رہے گی، ادب اخلاق حسنہ کے مفہوم سے الگ ہو ہی نہیں سکتا، حدیث شریف میں ہے أَدَّبَنِي رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي (میرے رب نے مجھے ادب سکھلایا اور اچھی طرح سکھلایا) ادب واخلاق کا تعلق ہمیشہ رہا ہے اور اسے باقی رہنا چاہیئے، اخلاق حسنہ، اچھی صفات، بلند کردار، عمل واخلاق کا جمال، یہ اس لفظ کی فطرت میں داخل ہیں اور یہ میں بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں، ہمیں اس فطرت کی اور ادب واخلاق کی اس وابستگی کی حفاظت کرنی چاہیئے، جس طرح ہم کو اپنے عقائد اور اپنے شعائر عزیز ہیں اسی طرح ہمیں اس تعلق اور وابستگی کو بھی عزیز رکھنا چاہیئے، تاریخ کے کسی دور میں یا مثقف دنیا کے کسی خطہ وعلاقہ میں اس باہمی ربط کا انقطاع نہ درست سمجھا گیا ہے اور نہ مناسب ہے، نہ جائز، آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ آج کے دور میں ادب خیر وشر اور اصلاح وافساد دونوں کا بڑا اہم اور مؤثر ذریعہ بن گیا ہے شر وفساد کا کام اس سے بہت زیادہ لیا جا رہا ہے اور اس سے خیر وصلاح کا کام بھی لیا جا سکتا ہے، ہمارا آج کا دور ادب کا دور ہے اور برصغیر ہند اور یورپ وامریکا کی یونیورسٹیوں سے قریبی تعلق کی بنا پر مجھے اس کے مشاہدہ اور تجربہ کا موقع ملتا رہا ہے کہ آج کا ادب اکثر وبیشتر تخریبی (DESTRUCTIVE) کردار ادا کر رہا ہے، اصول واقدار اور مسلّمات کے شکست وریخت کا کام کر رہا ہے، ادب کے راستہ سے ہر قسم کا فساد بڑی آسانی سے پھیلایا جا رہا ہے، اس کو روکنے اور مقابلہ کرنے کی شدید ضرورت ہے، یہ وقت کا

اہم ترین تقاضا ہے تاکہ لٹریچر کی اس وسیع دنیا میں دین اور دینی اقدار پر مبنی لٹریچر کے تحفظ کی ضمانت حاصل کی جاسکے، اور اسلامی بیداری اور دعوت اسلامی کے کاز کو تقویت دی جاسکے۔

ادب ناقابل تسخیر طاقت ہے ادب کی طاقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ادب ایک آلہ ہے تعمیر کا بھی اور تخریب کا بھی، وہ ذہنوں کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے اور اس میں ایسی جادوگری ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی طاقت رکھی ہے کہ وہ بڑے بڑے فضلاء اور ذہین لوگوں کو اس طرح مسحور کر لیتا ہے کہ ان کو جس راستہ پر ڈال دیا جائے اور چلایا جائے وہ اس راستہ پر چل پڑتے ہیں آپ اگر دنیا کے انقلابات کی تاریخ پڑھیں گے اسلام کی تجدید و اصلاح کی تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس قوت بیانیہ سے، زبان کی فصاحت و بلاغت سے، اور قلم کی طاقت سے کتنا بڑا کام لیا گیا ہے۔

انقلاب فرانس دنیا کی تاریخ میں ضرب المثل ہے، اس انقلاب کے پیچھے آپ کو کچھ اہل قلم نظر آئیں گے، کچھ ادباء نظر آئیں گے جنھوں نے ذہنوں کو تیار کیا، جمہوریت کے لیے آزادی کے لیے اور بغاوت کے لیے، اور پھر ان کا اتنا اثر پڑا کہ ایک ایسی نسل تیار ہوگئی جو برداشت نہیں کر سکتی تھی اس وقت کے حالات کو، فرانس میں موجود استبداد کو، جمود کو اور تقدیس کو جو دین کے نام سے وہاں مسلط تھی، جو وہاں کی روایات تھیں اور ان کا جو اثر تھا وہ سب ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے، ان کتابوں کے ادبی شہ پاروں نے، شاعری نے جو اس دور میں پیدا ہوئی اور یہاں تک کہ ناول نگاری نے اور قصہ کہانی کی کتابوں نے ایک انقلاب برپا کر دیا، اور اس نے فرانس کو ایک ایسے مرحلہ پر پہنچا دیا کہ وہ اس انقلاب کے لیے نہ صرف تیار تھا بلکہ بے چین تھا اور کوئی استبدادی طاقت، کوئی منطق اور دین کے نام سے کوئی دعوت اور کوئی تقدیس ان کو روک نہیں سکتی تھی یہاں تک کہ وہ لاوا کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا اور پورا فرانس بہہ گیا، اس انقلاب سے فرانس کا اثر پورے یورپ پر پڑا۔

یہاں تک کہ آج تک ذہنوں پر قائم ہے۔

یہ تو سیاسی اور عوامی انقلابات کا ذکر ہے خود آپ اسلام کی تاریخ میں دیکھیں گے کہ (اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کہتا ہوں) ہمیشہ زبان نے اور قلم کی طاقت نے تجدید اور اصلاحی تحریکوں کا ساتھ دیا ہے، اور یہ ان کا سب سے بڑا ہتھیار رہا ہے اور جہاد کا سب سے بڑا آلہ رہا ہے، اور وہ حضرات جنھوں نے حالات میں تبدیلی پیدا کر دی، ایک نظام کو ختم کر کے ضروری نظام کو جاری کر دیا اور ذہنوں میں نئی نئی بیداری پیدا کر دی، وہ وہ لوگ تھے جنھوں نے قوت بیانیہ سے اور قلم کی طاقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اس میں مشکل سے کوئی استثنا آپ کو ملے گا، آپ اوپر دیکھیں سیدنا علی مرتضیٰؓ کتنے بڑے ادیب و خطیب تھے کہ عربی ادب میں اس وقت سے اب تک وہ معیاری شخصیت ہیں، پھر اس کے بعد آپ دیکھیں تو حضرت حسن بصریؒ، حضرت سماکؒ، اور دوسرے داعی حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ آج تک ان کے خطبے پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرج رہے ہیں اور بجلیاں کڑک رہی ہیں اور کوند رہی ہیں اور ایک شخص ہے جو گرز چلا رہا ہے اور اس سے باطل کے سارے طلسم ٹوٹتے چلے جا رہے ہیں پھر یہاں آپ ہندوستان میں دیکھئے، حضرت مخدوم بہاریؒ کے مکتوبات دیکھئے، صرف فارسی ادب نہیں، صرف اسلامی ادب نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں (اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے) کہ عالمی ادب میں، بین الاقوامی ادب میں اس کا ایک پایہ ہے اور باوجود اس کے کہ اس کے مقاصد دینی تھے اور اس کی زبان دینی تھی، لیکن ادب کے ایسے نمونے ہیں جس کی مثال مغربی زبانوں میں ملنی مشکل ہے، آج بھی ان کے اندر وہ طاقت ہے کہ پڑھنے والا ہل جاتا ہے، دل و دماغ متأثر ہوتا ہے، اور وہ چیزیں دل میں پیوست ہو جاتی ہیں، پھر حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے مکتوبات پڑھئے جو اسلام کی کمزوری اور ہندوستان میں اس کے لیے جو آزمائش تھی (دور اکبری میں) اس پر اس طرح آنسو بہائے ہیں کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ انکے خطوط میں کیا طاقت ہے، آج بھی ان میں کتنی حرارت موجود ہے

اور حرارت کے ساتھ کتنی رقت انگیزی ان میں موجود ہے۔

ادب کی قدر و قیمت ادب کی راہ سے جو چیز مثبت یا منفی ایجابی یا سلبی تعمیری یا تخریبی داخل کی جاسکتی ہے وہ دوسرے ذرائع سے جو بہت زیادہ بھاری بھر کم ضرورت سے زائد سنجیدہ، محنت طلب اور دقیق علوم ہیں، ان کے ذریعہ داخل نہیں کی جاسکتی، ایک شعر پڑھ دیجیے، ایک فقرہ چست کر دیجیے ایک ادیب کی چند سطریں پڑھ دیجیے، جو اس کا اثر ہوگا وہ کسی معقولات کے عالم اور فلسفہ کی کتاب کا نہیں ہوسکتا، اس لیے ہماری نگاہ میں بڑی قدر و قیمت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ادب کی راہ سے بھٹکے ہوئے ذہنوں کو سنبھالا، ان کو اسلام کی طرف مائل کیا اور جو بغاوت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا، بھٹکے ہوئے نوجوانوں میں، اور ان کے عقائد میں جو تزلزل آرہا تھا، ان کے ذہنوں میں جو انتشار پیدا ہو رہا تھا، جو تشکک پیدا ہو رہا تھا، اور جس کی سربراہی افسوس ہے کہ ہمارے ممالک عربیہ اور خاص طور پر مصر کے بعض ادیبوں نے کی، (میں نام لینا نہیں چاہتا ان کا معاملہ اب اللہ کے ساتھ ہے) لیکن مصر میں بعض لوگوں نے گویا بیڑا اٹھایا اس کا، اور چونکہ مصر کا اثر تمام عرب ملکوں پر ایسا پڑتا تھا جیسا کہ ایران کا اثر مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ہندوستان پر اور اس کے بعد ولایت کا اثر انگریزوں کے دور حکومت میں پڑتا تھا، اور لفظ ولایت ہی بتاتا ہے کہ کس احترام سے یہ لفظ نکلتا تھا، تو جس طرح انگلینڈ و یورپ کا اثر پڑتا تھا اسی طرح کا اثر تمام ممالک عربیہ پر مصر کا پڑتا تھا، اچھے اچھے لوگ مصر کی طرف جو چیز منسوب کی جائے اس کا نام لیتے ہی اور کسی مصری کتاب کا نام لیتے ہی وہ گویا بالکل مسحور ہو جاتے اور احتراماً خاموش ہو جاتے اور اس کا جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا تھا ان مصری ادیبوں سے سارا عالم عربی متأثر ہو رہا تھا اور تمام عرب نوجوانوں پر ان کا جادو چلنے لگا تھا۔

ادب کا حقیقی اور فطری رُخ ادب، ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسانی کی

زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہدی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اس کو قبول کرے، لیکن اب اس دور میں یہ شرط کردی گئی ہے کہ جب تک آدمی ترقی پسندی کی باتیں نہ کرتا ہو، جب تک قدیم چیز کا مذاق نہ اڑاتا ہو جب تک مذہبی صحیفوں پر کوئی چھینٹ نہ ڈال دیتا ہو، اس وقت تک وہ ادب نہیں، میں صاف کہتا ہوں اور دبستانِ ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ادب کی سب سے پہلی زیارت جو نصیب ہوئی وہ آسمانی صحیفوں میں نصیب ہوئی، ادب تھا کہاں؟ جب خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لیے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کو زبان دی اور ان پر معانی کے ساتھ الفاظ وارد کیے، تو معلوم ہوا کہ ادب اسے کہتے ہیں، پھر قرآن مجید نے آکر تو اس پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی۔ نزل به الروح الأمین ٥ علیٰ قلبك لتكون من المنذرین ٥ بلسانٍ عربي مبین ٥ ادب کا پایہ کتنا بلند ہے کہ خدا نے اپنی کتاب کی تعریف ادب کے لفظ کے ساتھ فرمائی، یعنی یہ کہ وہ معجزہ ہے اور "لسان عربی مبین" میں ہے۔

جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے تو یہاں کی ادبی تحریکات اور یہاں کی ادبی زندگی میں علماء نے بڑھ چڑھ کر اور بنیادی حصہ لیا، چنانچہ سب کہتے ہیں کہ قصر ادب کے چار ستون ہیں، مولوی محمد حسین آزاد دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی، آپ دیکھیں گے چاروں اسی تعلیم کے پروردہ تھے، مدرسہ کے پڑھے ہوئے اور علماء کے شاگرد تھے۔ جہاں تک مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کا تعلق ہے تو وہ مستند عالم تھے، ایک قرآن کے مفسر ہیں تو دوسرے سیرت نگار اور ایسے ہی خواجہ الطاف حسین حالی پورے طور پر دینی حلقہ کے آدمی تھے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ حقیقی اور فطری ادیب ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کے اندر مذہبی حقائق پر کچھ ایمان نہ ہو اور دل کے اندر کچھ درد نہ ہو، کیا بات ہے کہ مولانا جلال الدین

رومی، شیخ سعدی، مولانا جامی، قدسی اور ہندوستان میں میر، درد اور مرزا مظہر جانِ جاناں اور اخیر میں جگر کے پایہ کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا، یہ سب اسی قدیم تعلیم کے پروردہ تھے اور مذہبی حقائق پر ایمان رکھتے تھے، کچھ کمزوریاں ہوں تو وہ الگ بات ہے، پھر اس کے بعد آخر میں اقبال کے پایہ کا شاعر کون ہے؟

از دل خیزد بر دل ریزد

ادب و انشاد کے سلسلہ میں عام مؤرخ و نقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام و بقائے دوام کے لیے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیت، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لیے اس کی بے چینی اور بے قراری ہے، ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لیے مضطرب و بے قرار ہو جب قدرت کی طرف سے ذوقِ سلیم بھی عطا ہو، الفاظ و اسالیب بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی عطا ہو، اور اس کی تحریر میں علم و ادب عقل و استدلال اور حسنِ بیان کے ساتھ سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہو، تو اس کی تحریر میں ایسا اثر اور ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی و زندگی اور اس کی تاثیر اور قوت تسخیر قائم رہتی ہے۔

تقریر و تحریر کو بہتر و کامیاب بنانے کے لیے جتنی صفات اور صلاحیتیں اور بلاغت کے اصول و قوانین ضروری ہیں، ناقدین ادب نے ان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ہر عہد میں ان پر بحث ہوتی رہی ہے، لیکن بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہوا ہے کہ ان صفاتی صلاحیتوں میں ایک بڑا مؤثر اور ناقابل فراموش عنصر یا عامل (FACTOR) صاحب کلام کا اخلاص اور دردمندی ہے، ادب و انشاد کے ذخیرہ کا اگر ایک نئے اور زیادہ حقیقت پسندانہ اور گہرے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کو دو قسموں پر تقسیم کرنا بے جا نہ ہوگا، ایک وہ تحریریں یا

اظہار خیال جو اندرونی تقاضے اور داعیہ اور کسی طاقتور عقیدہ یا یقین کے ماتحت وجود میں آئیں اور ان سے مقصود کسی فرمائش یا حکم کی تعمیل، کوئی دنیوی منفعت یا کسی صاحب اقتدار یا صاحب ثروت انسان کی رضامندی نہیں تھی، بلکہ وہ خود اپنے ضمیر یا عقیدہ کے فرمان کی تکمیل تھی، جس میں اہلِ حکومت اور اہلِ ثروت کے فرمان سے زیادہ قوت ہوتی ہے اور جس سے سرتابی کرنا کسی صاحب ضمیر انسان کے بس میں نہیں ہے۔

دوسری وہ تحریریں ہیں جو کسی فرمائش کی تعمیل یا کسی دنیوی منفعت کے حصول یا کسی بالاتر انسان کے حکم کی تعمیل میں ہوں، ادب کی ان دو قسموں میں زمین و آسمان کا فرق ملے گا پہلا ادب "ہر کہ از دل خیزد بر دل ریزد" کا مصداق ہے، وہ طویل عرصہ تک زندہ رہتا ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس کا موضوع دینی و اخلاقی ہے تو اس کا قلب و اخلاق پر گہرا اور انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے، ہزاروں آدمیوں کے دل میں اس کے پڑھنے سے اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس کے برخلاف دوسری قسم کا ادب داد تحسین، عارضی سرور و خوش وقتی کے سوا روح و قلب پر اپنا کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتا، اس کی زندگی اور عمر محدود، اور مختصر ہوتی ہے، پہلے ادب میں بے ساختگی اور بے تکلفی ہوتی ہے، دوسرے ادب میں صنعت اور اہتمام، ادب کی بارگاہ میں بے ادبی نہ ہو تو ان دونوں قسموں میں وہی فرق ہے جو ایک تمثیلی حکایت میں بیان کیا گیا ہے، کسی نے ایک شکاری کتے سے پوچھا کہ ہرن بھاگنے میں تم سے کیوں بڑھ جاتا ہے اور تم اس کو کیوں پکڑ نہیں لیتے؟ اس نے جواب دیا اس لیے کہ وہ اپنے لیے دوڑتا ہے اور میں اپنے آقا کے لیے۔

ناقدین ادب نے وقت ماحول، فضا اور طبیعت کے فراغ کو ادب و شاعری کے لیے بہت زیادہ سازگار و معاون تسلیم کیا ہے، اور بہت سے ادیبوں شاعروں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ لب جو، کنارِ دریا، گوشۂ چمن، فصل بہار، نسیم سحر، صبح کا سہانا وقت ان کی شاعری اور ان کے ادب کے لیے محرک بن جاتا ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ ایسے مقام کی تلاش اور ایسے وقت کے انتظار میں رہتے ہیں، اس طرح یہ حقیقت

تسلیم کرلی گئی کہ روح کی لطافت اور دماغ کا سکون ادبیات کے لیے بہت معاون ہے۔

بعض اہل دل کے کلام میں غیر معمولی حلاوت وقوت ہے، وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی اور اندرونی کیفیت و سرمستی کا نتیجہ ہے اور اس کے لیے وہ کسی خارجی مدد، مقام اور وقت کے محتاج نہیں ہوتے، ان کی خوشی و سرمستی کا سرچشمہ اور ان کی دولت کا خزانہ ان کے دل میں ہوتا ہے، خواجہ میر دردؔ نے جو خود صاحبِ دل اور صاحب درد تھے، اس پورے گروہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے ؎

جائیے کس واسطے اے درد میخانہ کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانہ کے بیچ

غرض اس باطنی کیفیت، یقین و مشاہدہ، دعوت کے غلبہ، اہل عصر اور اہل تعلق کو حقائق سے آگاہ کرنے اور منزل مقصود پر پہنچانے کے لیے اخلاص، دردمندی، روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی اور اس سب کے ساتھ ذوق سلیم اور زبان پر قدرت ادیب کو ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔

آخر میں اس مقالہ کو علاّمہ اقبالؒ کے ان اشعار پر ختم کیا جاتا ہے، جن سے بہتر ادب کی تعریف، اس کے مقام، اس کے اصلاحی و انقلابی کردار کو کم سے کم راقم کے علم و مطالعہ میں، اسلامی دنیا کی زبانوں میں سے کسی زبان میں نہیں بیان کیا گیا، وہ فرماتے ہیں۔

اے اہلِ نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں، وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

اسلامی بیداری میں علامہ شبلی نعمانیؒ کا حصہ

"الفاروق" کے تناظر میں

علامہ شبلی نعمانیؒ برصغیر ہند و پاک کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے، ان کی اہم ترین خصوصیات میں ملت اسلامیہ کی موجودہ پسماندگی سے بے چینی، ملت کے شاندار ماضی کی یاد اور اس کی بحالی کے لیے کچھ نہ کچھ کر ڈالنے کا جذبہ، اور زمانہ کے قدیم و جدید کے درمیان ایک متوازن ربط پیدا کرنے کی خواہش موجزن تھی، جس کو انھوں نے اپنے مؤثر اور بلیغ شعر و نثر میں ظاہر کیا۔

ان کی ساری تصنیفات اور ساری منظومات اس کی آئینہ دار ہیں وہ ایک طرف علم و ہنر کے میدان میں یورپ کی ترقی اور طاقت و سیاست میں اس کی برتری کو اس کی پوری آن بان کی حالت میں دیکھ رہے تھے، اور دوسری طرف وہ مشرق کی تمدنی بے بضاعتی اور علمی کم مائگی اور سیاست و طاقت میں پسماندگی کو دیکھ رہے تھے، پھر اس پر مستزاد یوروپین اہل علم کی ان علمی کاوشوں کو بھی دیکھ رہے تھے، جو اسلام اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کو بگاڑ کر پیش کرنے کو اپنا وطیرہ بنائے ہوئے تھیں، ان حالات کے صحیح احساس و شعور نے علامہ کو ایک طرف مسلمانوں کو چشم بصیرت وا کرنے کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے لیے انھوں نے اپنی ادبی و علمی صلاحیتوں کو صرف کرنے پر آمادہ کیا، اور یہی احساس و شعور تھا جس نے ان کو علی گڑھ سے نکل کر ندوہ کی تحریک کو اپنا نصب العین بنا لینے اور اس کے لیے اپنے وقت کو صرف کرنے پر لگا دیا، تاکہ مسلمانوں کے لیے جامع تعلیم کی ایک ایسی صورت بن سکے جس سے مسلمانوں کے ماضی کے اعلیٰ سرمایہ علمی کے

ساتھ جدید علمی ترقی کی صلاحیت کے آدمی تیار ہو سکیں۔

علامہ شبلی نے مسلمانوں کے جامع تعلیمی منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے جس فکرمندی اور عملی کاوش سے کام لیا اس نے اس میدان کار میں خاصا اثر پیدا کیا، اور فائدہ پہونچایا، اور اس راہ میں ان کے متعدد غیر معمولی صلاحیت کے شاگرد تیار ہوئے جنھوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور کام انجام دیا۔

دوسری طرف علامہ نے اپنی تصنیفات اور منظومات سے علم قدیم وعلم جدید کے حلقوں کو بھی قیمتی سرمایہ مہیا کیا، خاص طور پر تاریخ کے راستہ سے انھوں نے مسلمانوں کے ماضی کی سربلندی اور ان علوم میں ان کی جدّت ومہارت کا تعارف کرایا، اور اس طریقہ سے مسلمانوں میں مغرب کی ترقی وتفوق کو دیکھ دیکھ کر جو احساس کمتری اور پست ہمتی پیدا ہو رہی تھی اس کا خاصہ ازالہ کیا۔ انھوں نے مغربی مصنفین کی تحریروں کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کی گئی تھیں یا کی جا رہی تھیں ان کا عالمانہ طریقہ سے ابطال کیا، کتب خانہ اسکندریہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی علم دوستی کو جو مجروح کیا گیا تھا اس کی حقیقت واشگاف کی، ان باتوں کا یہ غیر معمولی اثر پڑا کہ کالج میں پڑھنے والے مسلم طلباء کے پژمردہ دلوں میں جان پڑ گئی، اور وہ مولانا کے مضمون کے حوالہ سے فخر کرتے کہ اسلام اور مسلمانوں پر مغربی مستشرقین کا الزام جھوٹا ہے اور اس کا جھوٹ اس علمی تحقیق سے ثابت ہے۔

علامہ مرحوم نے المامون لکھ کر مسلمانوں کی سیاسی وتمدّنی وعلمی عظمت وترقی کو نمایاں کیا اور الفاروق لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں اپنے شاندار ماضی پر فخر کرنے اور حوصلہ مندی کے جذبات پیدا کرنے کا کام لیا۔ علامہ کے عظیم شاگرد مولانا سید سلیمان ندویؒ حیات شبلی میں لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف انگریز مؤرخوں نے سیاسی اغراض کی خاطر ہندوؤں پر عالمگیر کے مفروضہ مظالم کی یہ تشہیر کی کہ خود مسلمانوں کو بھی اس کا یقین آگیا، اور پھر ہندوؤں میں جدوناتھ سرکار جیسے محقق پیدا ہو گئے جنھوں نے عالمگیر کو اس بنا پر کہ وہ اکبر کے بعد ہندوستان میں

اسلامی سلطنت کے تخیل کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا، ہر الزام کا مورد بنایا، اس وقت سارے ہندوستان میں صرف مولانا شبلی ہی کا قلم تھا جو نیام سے باہر آیا اور تمام اعتراضات کے مفصل جوابات دیے۔ اب تک اس باب میں ان کی کتاب "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" بے مثال تصنیف ہے اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اسی طرح مسلمان بادشاہوں کے علمی و تمدنی کارناموں کو پوری آب و تاب سے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی سے جمع کیا، اور ان کو شائع کیا، اسلامی کتب خانے اسلامی شفاخانے، ہندوستان پر اسلامی حکومت کے اثرات تزک جہانگیری وغیرہ، اسی قسم کے مضامین ہیں، یہ کہنا بہت آسان ہے، اور ایک حد تک سچ بھی ہے، یہ سلاطین مسلمان ضرور تھے، مگر اسلام یا اسلامی طرز حکومت کے تمام ترنمائندے نہ تھے، اس لیے ان پر اعتراضات کرنے سے اصل اسلام پر زد نہیں پڑتی، لیکن اسلام کے ۱۳۶۱ برسوں کے اندر مسلمان بادشاہوں اور اسلامی حکومتوں نے اپنے مسلمان ہونے کا کوئی پاک اثر اگر ظاہر نہیں کیا تو اسلام کی بے تاثیری کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔

اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر کے لیے انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات مبارکہ کا انتخاب کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تلاش و محنت اور اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے عہد حال کے اقتضاء کے مطابق یہ تصویر ایسی عمدہ کھینچی کہ دیکھنے والوں کی زبان سے بے ساختہ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ نکل گیا، انھوں نے دنیا کی تاریخوں کو چیلنج دیا کہ اس شبیہ مبارک کی مثال اگر اس کے مرقع میں ہے تو پیش کرے۔

آج کل کی سیاسی و اقتصادی تحریکات کے انقلابی دور میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام کا سیاسی و اقتصادی نظام کیا ہے، ڈھونڈھنے والے ڈھونڈھ رہے ہیں اور لکھنے والے لکھ رہے ہیں لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کام کا مسالہ ان کو کہاں سے ہاتھ آرہا ہے؟ الفاروق سے! اس سے یہ معلوم ہوگا کہ ان کی دوربیں نگاہ نے اس ضرورت کا پہلے ہی احساس کر لیا تھا۔

الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خاکہ تو ہماری قدیم کتابوں میں بحمد للہ

پوری طرح موجود ہی ہے، مصنف نے اس گوشہ کو اجاگر کیا ہے جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا اور جس کی ضرورت ان کے عہد میں بہت شدید تھی، چنانچہ یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ الفاروق نے کتنے گرتوں کو تھام لیا ، اور کتنے دلوں میں اسلام کی صداقت کا بیج بو دیا، اسی طرح اس میں بعض اغلاط کا وجود اور بعض جوابی نظریوں کی کمزوری بھی مصنف کی بشریت کی حامل ہے۔ والعصمۃ للہ وحدہٗ۔

تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو پرواز یورپ نے قائم کیا ہے اور یورپ کے مستشرقین جس وسعت نظر، جستجو اور نادر کتابوں کے مطالعہ اور نامعلوم گوشوں سے اہم نتائج کی تلاش کرتے ہیں مولانا نے اپنی اس تصنیف اور دوسری تصانیف اور اپنے تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا جن کی مدح وستائش کا اعتراف خود یورپ کے مستشرقین نے علی الاعلان کیا، اور اس طرح اسلام کی سربلندی کا جھنڈا جس کو وہ جھکا دینا چاہتے تھے، مولانا کے دست و بازو نے اس کو علی حالہ بلند رکھا اور اس کے لیے وہ ساری دنیائے اسلام کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

عیسائی مدت سے کوشاں ہیں کہ وہ قرآن حکیم کو محرّف ثابت کر سکیں، اس کیلئے وہ طرح طرح کی تدلیس اور دسیسہ کاری کیا کرتے ہیں، جس سال انھوں نے وفات پائی ہے اسی سال اپریل ۱۹۱۴ء میں لندن سے ایک غلغلہ بلند ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر منگانا نے لائبریری کے ایک گوشہ میں قرآن پاک کا ایک ایسا پرانا قلمی نسخہ پایا ہے جو موجودہ قرآن سے بہت مختلف ہے، ڈاکٹر منگانا نے اس کی پوری تشہیر کی، چنانچہ ۲۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو ٹائمز آف لندن نے اس پر ایک آرٹیکل لکھا اور بڑے دعویٰ سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان کے مقابلہ کے لیے بھی مولانا ہی کا قلم میدان میں آیا اور متعدد مضامین میں اس کا جواب دیا اور اس تحقیق کا سارا تار و پود بکھیر دیا۔

اس زمانہ میں علماء جو کچھ لکھتے تھے وہ عربی یا فارسی میں، مولانا نے بھی علی گڑھ آنے سے پہلے تک اسکات المعتدی عربی میں لکھی، فارسی نامے بڑی کوشش سے لکھتے تھے، صرف ایک رسالہ قرأۃ فاتحہ خلف الامام، کے رد میں اردو میں لکھا، مگر اس کو اپنے نام سے نہیں چھپوایا، لیکن جس طرح ہمارے علماء کرام نے زمانہ کی زبان بدلنے کے ساتھ عربی کی جگہ مفید عام تالیفات فارسی میں شروع کر دیں، اور پھر فارسی کا چلن بدلنے پر حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر

صاحب دہلوی و حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ نے اُردو میں تالیف شروع کی، مولانا نے بھی عربی اور فارسی کو چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ فرمائی اور اس زبان کو جس کی نسبت بطور معذرت سیرۃ النعمان میں یوں فرماتے ہیں ع "حرف بہ اُردو زدن آئین نبود"، اپنی نکتہ سنجیوں اور خوش بیانیوں سے یہ عروج بخشا کہ علمائے زمانہ کے لیے اس میں لکھنا پڑھنا مطلق عار نہ رہا اور بیشمار کتابیں ان کے قلم سے اس زبان میں تالیف پائیں، اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ اس میں بعض علماء اسلام نے بھی کتابیں لکھیں جو اپنی ہدایت وافادیت اور مضامین کی بلندی وندرت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں، مگر بیان کے اشکال، تعبیر کی دقت، علمی وفنی اصطلاحات کی کثرت، اور فلسفیانہ طرز بیان کے تتبع کے سبب سے عوام تو عوام بہت سے خواص کے دسترس سے بھی وہ باہر ہیں، مولانا نے اپنے لیے بیان کی سہولت، عبارت کی روانی، ترتیب کی خوبی، عام فہم الفاظ کے انتخاب اور تشبیہ واستعارہ کی عمدگی سے وہ طرز نکالا کہ ان کی کتابیں ادب وانشاء کا اعلیٰ نمونہ قرار پائیں، اور تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ، حضرات علماء کو بھی بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا، اور اب تو وہ علمی ومذہبی علوم کی ٹکسالی زبان بن گئی ہے۔

اس موضوع پر ایک اور رُخ سے نظر کیجیے، اس وقت حضرات علماء جس قسم کے مضامین پر رسائل تالیف فرما رہے تھے، وہ دو تین موضوعوں سے باہر تھے، تصوّف وفقہ کے اخلاقی مسائل کی تحقیق یا فرق باطلہ کی تردید، مولانا نے جب اس میدان میں قدم رکھا، اس محدود رقبہ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا، تاریخی فقہی، تمدنی، ادبی علمی فلسفی، سیاسی، غرض ہر نوع سخن میں وہ گلباری کی کہ ساری زمین قسم قسم کے پھولوں سے پر بہار ہو گئی اور اب اس کی تقلید میں علماء کی تحریریں اور تالیفیں بحمد للہ اپنی وسعت روز بروز بڑھا رہی ہیں۔

اس موضوع کا ایک اور گوشہ بھی پردہ کشائی کا محتاج ہے، علمائے کرام کا بڑا مشغلہ اس عہد میں مناظرہ تھا، اور اس وقت کا علم کلام گویا یہی طرز سخنوری تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تالیفات کے لیے اس کو جہ کو اختیار نہیں کیا، مگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ساری عمر اسی مولویانہ مناظرہ ہی میں گذر گئی اس وقت خصوصیت کے ساتھ چار فریقوں میں مناظرے جاری تھے، حنفی اور اہل حدیث، سنّی اور شیعہ مسلمان اور عیسائی مسلمان اور آریہ، اب ذرا مولانا کی

تالیفات پر نظر ڈالئے بقول انہی کے

گرچہ سرد برگ سخن دیگر ست
شمع ہمان ست دلگن دیگر ست

انھوں نے مناظرہ کی بدنما شکل کو بدل دیا اور احقاق حق اور ازہاق باطل کے لیے زمانہ کے مطابق ایک اور دلنشیں شکل پیدا کردی، ان کی سب سے پہلی کتاب سیرۃ النعمان کا موضوع کیا حنفی اور اہل حدیث کا مناظرہ نہیں ؟ ان کی دوسری کتاب الفاروق کیا شیعہ سنّی مباحث کا فیصلہ نہیں؟ ان کی باقی کلامی وتاریخی کتابیں عیسائی مشنریوں اور مستشرقوں اور ہندو معترضوں کے جواب میں ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ قدیم مناظرانہ قیل وقال کا طریق، حریفانہ تعصبات، جوابی الزامات، بدنما طعن وطنز، سوء تعبیر اور ناسزا سب وشتم سے اتنا بدنما ہوگیا تھا کہ اس نے تاثیر وتأثر اور قبول حق کی ساری صلاحیت اپنے اندر سے کھودی تھی، حالانکہ احقاق حق اور ازہاقِ باطل ہمیشہ سے اہل حق کا شیوہ رہا ہے، اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا، اس لیے مولانا کی ژرف نگاہی نے لڑائی کے میدان کو نہیں، بلکہ جنگ کے نقشہ کو بدل دیا، انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ردِّ الزام اور ردِّ جواب کے بجائے اپنے ہی دعووں کو ایسے دلنشیں، دلچسپ اور محققانہ طریق استدلال سے بیان کیا جائے کہ بیان کی ندرت، طریق تعبیر کی سنجیدگی اور دلائل کی قوت خصم کو جواب کے قابل ہی نہ رکھے، چنانچہ سیرۃ النعمان اور الفاروق اور الجزیہ وغیرہ کے جوابات میں جواب دینے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ پر رہیں، اور ان سے بڑا فیض پہنچا اور علماء نے بھی اس پرواز پر کتابیں لکھنی شروع کردیں، جو مفید حال ہیں۔"

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے عہد میں جو متعدد مشکلات، شکوک وشبہات، پست ہمتی اور اعتراضات کا عہد تھا، انگریزوں کی سخت گیر اور معاندانہ نگرانی وحکومت تھی، اور مسلمانوں کی شکست خوردگی اور بدحالی تھی، بڑی ہمت سے کام لیا اور ایسا بلند تخیل اپنایا اور اس کے لیے اپنی ذہنی اور علمی توانائیاں صرف کیں، جو صرف دوررس ہی نہ تھیں بلکہ نتیجہ خیز تھیں، آج ندوۃ العلماء کے تعلیمی تخیل اور نظام میں، دارالمصنفین کے تیار کردہ اہم تاریخی اور کلامی سرمایہ علمی میں اور ان

تصنیفات میں جو خود علامہ نے تیار کیں، اور ان کے عظیم شاگردوں نے اسی نہج پر تیار کیں، علامہ کے تخیل کے عمل دخل کو دیکھا جا سکتا ہے، وہ بلاشبہ برصغیر میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کے ایک بڑے کارپرداز اور قائد تھے جن کے ذریعہ اسی عہد سے اسلامی بیداری کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

اسلامی بیداری میں

علامہ سید سلیمان ندوی کا حصہ

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحریروں اور ادبیات کا اسلامی نشأۃ ثانیہ میں جو حصہ رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے لیکن سیمینار میں اتفاق سے ان کے سلسلہ میں کوئی مضمون نہیں آسکا تھا۔ ضرورت تھی کہ اس خلا کو خالی نہ چھوڑا جائے لہذا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کے ایک شائع شدہ مضمون سے ایک اقتباس لیا جارہا ہے جو اس شمارہ کے لیے اختیار کردہ سیمیناری موضوع سے ہم آہنگ ہے۔ حضرت مولانا کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے بجائے نیا مضمون تحریر کروانے کے ان کے پرانے مضمون سے اقتباس لینے پر ہی اکتفا کی جارہی ہے۔ انشاء اللہ مذکورہ موضوع پر مذاکرہ علمی کا اعادہ ہوا تو مستقل مضمون کی فکر کی جائے گی۔ (ادارہ)

عام طور پر لوگ سید صاحب کو مؤرخ کی حیثیت سے جانتے ہیں خصوصاً علماء کے قدیم حلقے میں ان کا تعارف عام طور پر اسی نسبت سے ہوتا ہے، لیکن سید صاحب کی علمی مجلسوں میں بیٹھ کر مجھے شدت سے اس کا احساس ہوا کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے۔ میں نے "پرانے چراغ" حصہ اوّل میں سید صاحب کے تذکرہ میں لکھا ہے، اور آج بھی اسی مقام پر ہوں کہ

"میں نے معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن اور علوم قرآنیہ کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا، علم کلام اور عقائد پر سید صاحب کی نظر بہت وسیع و عمیق تھی، اور ان کو علم کلام کو سلف کے اصول اور کتاب و سنت کی روشنی میں اور عصر حاضر کے ذہن اور روح کے مطابق پیش کرنے کا خاص ملکہ تھا اور یہ غالباً

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی طویل صحبت، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابوں کے مطالعہ اور "سیرۃ النبیؐ" کی تالیف کے سلسلے میں طویل غور و فکر کا نتیجہ تھا۔"

علی گڑھ کے عزیز فضلا و محبوب دوستوں اور وائس چانسلروں سے معذرت کے ساتھ ایک تاریخی حقیقت کے طور پر اس میں اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ اس میں اس کو بھی دخل تھا کہ سیّد صاحب نے سر سید مرحوم اور ان کے عہد کا (جو بہت قریب تھا) پیدا کیا ہوا وہ مذہبی اور کلامی لٹریچر بغور پڑھا تھا، جس میں جدید فلسفہ، نوخیز اور کمسن سائنس اور مغرب کی حاکم و فاتح تہذیب کے ملے جلے رد عمل نے ایک ایسا جوابی انداز پیدا کر دیا تھا، جس کی بنیاد معذرت اور تاویل پر تھی، سید صاحب کی سلیم طبع، خاندانی ماحول دار العلوم ندوۃ العلماء کے کامل الفن اساتذہ اور راسخ العلم علماء سے تلمذ، سائنس کے صبح و شام بدلتے ہوئے نظریات، مغربی تہذیب کی عبرتناک ناکامی اور اس کے زوال کے کھلے ہوئے نشانات پہلی جنگ عظیم کی ہلاکت خیزی اور جہاں سوزی، یورپ کے سفر میں مغربی تہذیب و معاشرت کے براہ راست مشاہدہ اور تجربہ نے اس طلسم کو پاش پاش کر دیا تھا، جس کے اسیر و نخچیر انیسویں صدی کے اخیر کے اچھے اچھے دماغ رہے ہیں۔ پھر توفیق الٰہی اور کتاب و سنّت کے براہ راست مطالعہ اور سیرت کے اشتغال نے ذات نبوی کی عظمت اور اسلامی عقائد و حقائق کی صداقت و حقانیت اور علمیت و معقولیت پر نیا ایمان اور نیا اعتماد بخشا جو سیرۃ النبی کے چوتھے اور پانچویں حصّے میں تفصیل کے ساتھ اور رسالہ "اہل سنّت والجماعت" (جو بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کا مصداق ہے) اجمال کے ساتھ صاف نظر آتا ہے۔

جہاں تک سید صاحب کے ایک عظیم مؤرخ ہونے کا تعلق ہے وہ بلا شبہ اپنے عہد کے عظیم ترین مؤرخوں اور محققوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں، ان کی کتاب "خیام" اور اس کے بعد "عرب و ہند کے تعلقات" "عربوں کی جہاز رانی"، علمی تحقیق، وسعت مطالعہ، دقت نظر، قوت محاکمہ، تفاہل مطالعہ اور علمی تلاش میں صبر و تحمل کا اعلیٰ نمونہ ہیں، جہاں تک "خیام" کا تعلق ہے کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی محققانہ کتاب نہیں ہے علامہ اقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو لکھا تھا:۔

"عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔"

ان کی یہ تاریخی تصنیفات بڑے سے بڑے مصنف و محقق کی ساری عمر کی کمائی اور سرمایۂ افتخار بن سکتی ہیں، ان کے اس امتیاز و تفرد کے اظہار کے لیے علامہ اقبال کے الفاظ سے بہتر الفاظ نہیں لائے جا سکتے ہیں کہ "ہندوستان میں علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد، سید سلیمان ندوی کے سوا کون ہے؟"

"ارض القرآن" ان کے ابتدائی عہد کی تصنیفات میں سے ہے لیکن وہ ابھی تک اردو میں آخری چیز اور اس موضوع پر سب سے بڑا ماخذ ہے، ان کے کاموں کو دیکھ کر کسی نکتہ رس کا یہ جملہ یاد آتا ہے کہ مشرق میں "ایک آدمی" اکثر وہ کام کرتا ہے جو مغرب میں "اکیڈمی" کرتی ہے۔

یہاں پر پھر میں مجبوراً "پرانے چراغ" کا ایک پیراگراف نقل کروں گا، جس میں سید صاحب کی جامعیت اور ملک کے زبان و ادب میں ان کے اس استادانہ ملکہ قائدانہ کردار ادا کرنے کو نمایاں کیا گیا ہے، جس نے طبقۂ علماء و عوام میں بیگانگی اور قدیم و جدید میں وہ خلیج نہیں پیدا ہونے دی، جو بعض دوسرے اسلامی ملکوں میں (علماء کے اپنے دینی اور مخصوص ثقافتی حصار میں محدود ہو جانے کی وجہ سے) پیدا ہو گئی اور جس سے دین کا رشتہ زندگی سے اگر ٹوٹا نہیں تو کمزور ضرور ہو گا۔

سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقۂ علماء میں ان کی جامعیت اور ان کے علوم و مضامین کا تنوع ہے، ان کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم و جدید واقفیت علمی تبحر اور ادبی ذوق، نقاد و مؤرخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادبا اور انشاء پردازوں کی شگفتگی اور حلاوت، فکر و نظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہو گئی تھی جو شاذ و نادر جمع ہوتی ہے، سید صاحب جس زمانے کے طالب علم ہیں اس زمانے میں جدید و قدیم کے درمیان شدید رقابت تھی، ایک شخص بیک وقت دونوں قلمروؤں سے راہ و رسم نہیں

رکھ سکتا تھا، قدیم وجدید نمائندوں کا ایک جگہ جمع ہونا بھی مشکل تھا اور شاید ندوۃ العلماء کے جلسوں میں وہ پہلی مرتبہ جمع ہوئے تھے) دینی علوم اور ملک کے زبان وادب کے درمیان بھی سرحدیں قائم ہوگئی تھیں۔ اوران کو پار کرنا بڑی جرأت کا کام تھا۔ وہ دور جس نے نذیر احمد، حالی، شبلی جیسے عالم اور صاحب طرز انشاء پرداز پیدا کیے، ختم ہو رہا تھا اب یک فنی علماء کا دور تھا، جو ادب وشاعری کو ثقافت کے خلاف سمجھتے تھے، ایسے بھی بہت سے لوگ تھے جو جیتی جاگتی زبان اور سلیس وشیریں اُردو میں تصنیف کرنا اپنی عالمانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے، جغرافیہ وتاریخ سے ناواقفیت علماء کا شعار سمجھانے لگا تھا، علوم قدیمہ میں بالعموم مغایرت تھی، جو فقیہ ومحدّث ہوتے تھے، وہ ادیب نہیں ہوتے تھے، جو ادیب ہوتے تھے ان کو علوم دینیہ سے سروکار نہ ہوتا تھا، زندگی پر اثر انداز ہونے اور قوم کی رہنمائی کے لیے ضروری تھا کہ ملک کے علمی وادبی رجحانات سے واقفیت اور علمی زندگی میں شرکت ہو، سیّد صاحب نے نصف صدی سے زیادہ علماء کی اس قدیم جامعیت کو زندہ اور نمایاں رکھا، اور دینی وعلمی وادبی حلقوں میں بیک وقت نہ صرف باریاب بلکہ اکثر صدر نشین رہے۔

سیّد صاحب نے انجمن ترقی اردو کے جلسوں کی صدارت کی، ہندستانی اکیڈمی میں فاضلانہ ومحققانہ مقالات پڑھے، جن کا مجموعہ "نقش سلیمانی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مصنّف نرا عالم دین نہیں، لسانیات، فلسفہ، زبان اور تاریخ السنہ کا ماہر خصوصی ہے، خصوصیت کے ساتھ وہ خطبہ جو تمہید کے عنوان سے ہے، اور جس میں انھوں نے کثیر التعداد اُردو کے روزمرہ کے الفاظ کا عربی نسب نامہ بیان کیا ہے، اور ان کے اس طویل اور دلچسپ سفر کی کہانی سنائی ہے، جس کے طے کرنیکے بعد انھوں نے یہ حلیہ اور لباس اختیار کیا، ان کی دیدہ وری اور نکتہ سنجی اور عربی اُردو سے گہری واقفیت کا بیّن ثبوت ہے۔

جب ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے قائدین کو انگلستان جانے والے اس مؤقر وفد میں جس کی قیادت رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ کر رہے تھے، شرکت کے لیے ایک باخبر وسیع النظر عالم اور ایک باحمیت وہوش مند ترجمان شریعت کی ضرورت پیش آئی تو

اہل نظر کی نظر اسی نوجوان عالم سید سلیمان ندوی پر پڑی، جب سلطان ابن سعود کی دعوت پر مکہ مکرمہ میں مؤتمر اسلامی کا عالمی اجلاس ہونا طے پایا اور مجلس خلافت نے مسلمانان ہند کے خیالات کی ترجمانی کے لیے ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا، تو اس کی قیادت کے لیے بھی (جس میں بلند پایہ علماء اور آزمودہ کار سیاسی رہنما تھے) ان سے زیادہ موزوں شخص نظر نہیں آیا، جب نادر خاں شاہِ افغانستان نے اپنے ملک کے لیے تعلیم کا نیا خاکہ و نظام مرتب کرنے کا ارادہ کیا، جو بیک وقت قومی و دینی تقاضوں کو پورا کر سکے، اور دین کے اصول اور عصر حاضر کی ضروریات پر حاوی ہو تو اس نازک و دشوار کام کے لیے ان کی نظر ہندوستان کی تین ہی ہستیوں پر پڑی، ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال، دوسرے سر راس مسعودؒ، تیسرے مولانا سید سلیمان ندویؒ ہم ان کو کانگریس کے مخصوص جلسوں میں شرکت کرتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں۔ اور خلافت کے سالانہ جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے بھی، ہر جگہ ان کی رائے کا وزن، ان کی شخصیت کا وقار اور ان کی واقفیت کا اعتراف پاتے ہیں، اسی کے ساتھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، جامعہ ملیہ اسلامیہ بھاولپور کے صادق ایجرٹن کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی علمی کمیٹیاں اور کورٹ ان کی شرکت پر مفتخر اور ان کے مشوروں سے مستفید ہوتی ہیں، پھر زندگی کے آخری دور میں ہم اسی ادیب و مؤرخ کو بھوپال کے مسند قضاء پر شرعی مقدمات کا فیصلہ کرتے ہوئے اور فقہی رائے دیتے ہوئے پھر دنیا کے ایک بڑے اسلامی جمہوریہ کی مملکت کے دستور میں دینی رہنمائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ گوناگوں مشاغل و خدمات سید صاحب کی ہمہ گیر طبیعت اور ان کے علم و ثقافت (CULTURE) اور وسعت کا بہترین ثبوت ہیں۔

اب ہم سید صاحبؒ کے ایک اور امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی بیداریٔ قلب، طلب صادق، اور ہمت عالی کے ثبوت کے لیے "پرانے چراغ" کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

"۱۹۴۱-۴۰ء کا زمانہ تھا کہ سید صاحب علم و تحقیق کے چشموں سے سیراب ہو کر اور علوم دینیہ اور تاریخ و ادبیات کے سمندر میں بار بار غوطہ لگانے کے بعد اپنی روح کی پیاس

اور قلب کی کسی اور چیز کی تلاش محسوس کرنے لگے تھے، اور اپنے محبوب دوست اور نامور معاصر علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں خلوتوں میں (زبان حال سے) زیر لب اس طرح گویا ہوتے تھے کہ ؎

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رُطب

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب

شاید علمائے معاصرین کم سے کم ہندستان کے فضلائے مدارس میں کسی کے ضمیر میں عقل و عشق، قدیم و جدید، مشرق و مغرب اور دین و ادب یا دین و فلسفہ کا یہ معرکہ اس طرح برپا اور تازہ نہ ہوا ہوگا جس طرح ندوہ کے اس فاضل "سیرۃ النبیؐ" کے اس مصنف، میدانِ سیاست اور بزم ادب کے اس محرم راز، اور یورپ کے اس سیاح کے ضمیر میں ہوا تھا، انھوں نے اس نخیل علم کی آبیاری بھی کی تھی، اس کی گھنی چھاؤں میں برسوں آرام بھی کیا تھا، اس کی تاریخ بھی لکھی تھی، اس کی زندگی اور موت کا فلسفہ بھی بیان کیا تھا، لیکن ان کے قلب سلیم اور روح بے تاب کی شہادت تھی (اگرچہ ان کے بہت سے معتقدین تلامذہ اس کے ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ سیّد صاحبؒ میں کوئی کمی اور تشنگی ہے) کہ وہ اس کے تازہ اور شاداب رُطب سے فیض یاب نہیں ہوئے تھے، ان کی کتابوں نے بالخصوص "خطبات مدراس" "سیرت النبیؐ" کے مضامین اور "سیرت عائشہؓ" کے صفحات نے ہزاروں کو حلاوت ایمان سے لذّت آشنا کیا تھا، لیکن ان کی ہمّت عالی اور ان کا طائر بلند پرواز خود اس دولت بیدار کا طالب تھا، جس کو حدیث میں "احسان"، قرآن مجید میں "تزکیہ" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور جس طرح ان کو علم و ادب کی وادی کو کامیابی و فتح مندی کے ساتھ طے کرنے کے لیے علامہ شبلیؒ جیسا خضر طریق ملا تھا۔ "احسان" اور "تزکیہ" کی وادی کے لیے بھی ایک خضر راہ اور ایک مرد حق آگاہ کی تلاش تھی، اس سلسلے میں ان کی کہانی اور ان کے واردات قلبی حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی کہانی اور وارداتِ قلبی سے بہت مشابہ نظر آتے ہیں کہ ان کو بھی علم و شہرت کے

بام عروج پر پہنچنے کے بعد اپنی علمی زندگی اور ذہنی کدوکاوش سراب نظر آنے لگی، وہ علم ویقین کے چشمۂ حیوان کی تلاش میں نکلے اور سیراب وکامیاب واپس آئے۔

یہ "خضر راہ" ان کو حکیم الامّت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شکل میں مل گیا، اور چونکہ عراق کی طرح ان کا باطن اِس حرارت وحلاوت کو قبول کرنے کے لیے بالکل تیار تھا، اس لیے انھوں نے برسوں کی راہ مہینوں میں اور مہینوں کی راہ ہفتوں میں اور دنوں میں طے کی اور شیخ وقت کے اعتماد واستناد سے بہت جلد سرفراز ہوکر ان کے خلیفۂ مجاز ہوئے۔"

جن حضرات کی امّتِ اسلامیہ کی علمی، فکری اور کلامی تاریخ پر وسیع وعمیق نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کے دریا اپنے اپنے رُخ پر آزادانہ سالہا سال بہتے رہتے ہیں۔ ان کو (اور صحیح طور پر ان دریاؤں کے غواصوں اور جہاز رانوں کو) زمانے کے انقلابات اور بعض اوقات وقت کی ضروریات اور مطالبات سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی، وہ اپنا کام یکسوئی اور کسی قدر بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ اپنے کتب خانوں اور مطالعہ وتصنیف کے گوشوں میں انجام دیتے رہتے ہیں، ماہرین تفسیر، محققین حدیث وفقہ، مصنفین علم کلام، شارحین متون اپنے علم ومطالعے کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں، اور آنے والی نسلوں کے لیے ان علمی جواہرات کو ایک جگہ جمع کرتے رہتے ہیں، بعض اوقات نئی نسل نئے مسائل سے دوچار اور ذہنی انتشار اور اعتقادی اضطراب کا شکار ہوتی ہے، اس کو سمجھانے اور مطمئن کرنے کے لیے ایک نئی زبان، نیا پیرایۂ بیان، سیاسی معاشرتی اور تعلیمی تبدیلیوں کے اثرات سے واقفیت اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نفسیات سے نہ صرف شناسائی بلکہ ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے، جب کبھی ان علوم کے دریاؤں کی غواصی اور شناوری، عقیدہ کی پختگی اور صلابت، دین کی حمیت، قلم کی طاقت اور زبان کی طاقت اپنے ان بلند شہ نشینوں سے اتر کر (جہاں ان کو ہر طرح کی لذّت وعزّت حاصل ہے) زندگی کے ان میدانوں میں آتی ہے، زمانے کی تبدیلیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتی ہے، اور سیّدنا علی مرتضیٰؓ کی حکیمانہ نصیحت کلّمُوا النّاسَ عَلٰی قَدرِ عُقُولِھِمْ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّکَذَّبَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ۔ (لوگوں سے اُن کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اس حکمت کی عدم رعایت کی وجہ

سے لوگ خدا اور رسول کی باتوں کا انکار کرنے لگیں!) پر یہ گروہ علماء و متکلمین عمل کرنے لگتا ہے، تو پھر اکھڑے ہوئے قدم جم جاتے ہیں، انحراف و ضلال کی شکار تعلیم یافتہ نسل دین کی نہ صرف قائل بلکہ داعی بننے لگتی ہے، اس وقت دین کے غلبے کا ایک نیا دور، مسلمانوں میں شریعت اسلامی پر اعتماد بلکہ افتخار کا جذبہ، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جدید فلسفوں کے علمی حملوں سے آنکھیں ملانے اور ان کے حملے کو پسپا کر دینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، اقوام و ملل اور مذاہب کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ قدیم و جدید کا یہ اتصال اور دین کے صحیح نمائندوں اور رمز شناسوں اور جدید نسل کے متجسس و بے چین اور تشکیکی ذہن کی مواجہت یا تقاطع (CROSS) بہت سے مذاہب و ممالک میں بڑے بڑے، طویل طویل وقفوں کے بعد پیش آیا ہے، اور اسی کی کمی یا تاخیر نے یورپ میں علم و مذہب میں وہ خون ریز کشمکش پیدا کر دی جس کی تاریخ ڈریپر (DRAPPER) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب RELIGION AND SCIENCE CONFLICT BETWEEN (معرکۂ مذہب و سائنس) میں سنائی ہے اور ان تاریک صدیوں کو جنم دیا جن کو یورپ کی تاریخ میں "قرون مظلمہ" (DARK AGES) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، (اور میرے اس ٹکڑے میں عالی مرتبت سیفر صاحب نے جو بات اٹھائی ہے اس کا بھی جواب ہے) کہ ملت اسلامیہ کی تاریخ میں علمائے راسخین اور کتاب و سنت کے حاملین و شارحین اور نئے زمانہ اور نئی نسل کے درمیان بیگانگی کا وقفہ کبھی اتنا طویل نہیں ہونے پایا کہ علم و مذہب کے درمیان کسی خون ریز کشمکش کے پیش آنے اور ان تحقیقی عدالتوں COURTS OF INQUISITION کے قیام کی نوبت آئے، جن کی یورپ میں مقتولین کی تعداد بارہ ملین یعنی پہلی جنگ عظیم کے مقتولین کی تعداد سے دو چند ہے، یہ ہے اس یورپ کی ترقی کا حال جہاں قرون وسطیٰ میں عیسائیوں کے عقائد کی تحقیق کے لیے تفتیش کے محکمے قائم ہوئے اور انھوں نے سینٹ پال کی عیسائیت سے انحراف پر لوگوں کو سزائیں دیں) لیکن تاریخ اسلام میں قرون مظلمہ کا وجود اور اس کی اصلاح کا کوئی جواز نہیں ہے۔

یہ دین اسلام کے ان شارحین داعیوں اور اسلام کے محققوں اور متکلمین کے گروہ کا وہ کارنامہ ہے، جس نے اپنے زمانے میں امام ابوالحسن اشعری، حجۃ الاسلام غزالی، ابوبکر باقلانی،

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی کو پیدا کیا، اس گروہ کی ہر زمانہ میں ضرورت ہے، اور یہ ضرورت تبدیلیوں کے احساس اور قرآن و سیرت، عقائد اسلامیہ اور تعلیمات اسلامی کو نئی زبان، نئے زور قلم، جدید استدلال، اور عصر حاضر کے فلسفوں، تاریخ و ادب سے واقفیت اور تقابلی مطالعے کے بغیر پوری نہیں کی جا سکتی۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس حقیقت و ضرورت کو محسوس کیا، اور اپنی تحریروں بالخصوص "سیرۃ النبیؐ" میں، نیز اپنی شاہکار تاریخی تصانیف "ارض القرآن" "عرب و ہند کے تعلقات" اور "خیام" وغیرہ میں اس کا پورا لحاظ رکھا، آپ پہلے اس حقیقت و ضرورت کی واقفیت و اہمیت ان کی زبان سے سنئے، پھر ان کی جلیل القدر تصانیف کا مطالعہ کر کے فیصلہ کیجئے کہ اس فرض اور علماء کے ذمہ قرض سے وہ کس خوبی سے عہدہ برآ ہوئے، یہی خصوصیت ہے جو ان کو اس عہد کے متکلمین اسلام اور نئی اسلامی نسل کے معلمین اور محسنین کی صف میں شامل کرتی ہے، اور اس کے بغیر ان کی بلندی کا اندازہ اور اس یادگاری جلسہ کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا، حیات شبلی کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفہ سے بہت کچھ ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہو گیا تھا، اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی، یہاں تک کہ اس کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا جزو اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا، اور خصوصیت کے ساتھ محکوم ملکوں کی درس گاہوں میں ان ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کر کے دکھانا ضروری قرار دیا گیا، اور اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ وہ اپنی نسلی و قومی برتری کا اعلان کریں، اور اپنے مقابلے میں اپنی محکوم قوموں کی تاریخ و تمدن کے روشن چہرہ پر نئے نئے طرز سے ایسی سیاہی پھیریں کہ ان کو خود اپنے اسلاف سے آپ نفرت آئے، اور اہل یورپ کے کارناموں کے سامنے ان کو اپنے مذہبی و تمدنی، سیاسی و قومی کارنامے پھیکے نظر آئیں اور اس طرح ان کا مذہب جو ان کی تمام تحریکات کی روح ہے، ہمیشہ کے لیے مردہ ہو جائے۔

اس کام کے لیے سب سے پہلے انھوں نے خود سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک

کو چنا اور اس کو اپنے ہر قسم کے اعتراضوں اور شبہوں کا مورد الزام ٹھہرایا۔ اس کے بعد خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ اور سلاطین اسلام کو اپنے اعتراضوں کا نشانہ بنایا، اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی سلطنتوں کو طرح طرح سے ظالمانہ ثابت کرنے کے لیے سچ جھوٹ کسی سے دریغ نہیں کیا، اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور تمدنی کارناموں کو اتنا بگاڑ کر دکھانے لگے کہ خود مسلمان نئے تعلیم یافتوں کو اپنی تاریخ سے آپ گھن آنے لگی۔"

ارض القرآن کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:۔

عہد قدیم میں مخالفین کے اعتراضات کا نشانہ اعتقادیات تھا، لیکن اس عصر جدید میں ہمارے مخالفین عقائدِ اسلام کی مضبوطی کا امتحان کر چکے ہیں، انھوں نے یہاں سے ہٹ کر تاریخ و تمدن کے میدان میں مورچے قائم کیے ہیں، ضرورت ہے کہ جس طرح ایرانی و یہودی مؤرخین کے مقابلے میں ابو حنیفہ دینوری (م ۳۸۱ھ) ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) اور ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) نے قرآن کی تحقیق و تطبیق میں کوشش کی، اس زمانے میں جدید یورپین تاریخ کی تاریخ اسلام و قرآن سے تطبیق دی جائے اور یورپین تاریخی تحقیقات و اکتشافات کی غلطی کا پردہ چاک کیا جائے۔ اور خود انھیں کے کارخانوں کے بنے ہوئے ہتھیاروں سے ان کے حملوں کا جواب دیا جائے۔

سیرۃ النبیؐ حصہ ہفتم کے دیباچے میں فرماتے ہیں:۔

اوّل تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدما کی کتابیں نقداً اکثر خالی ہیں، اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کرنے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔"

دار المصنفین کے رسالہ "معارف" کے پہلے اداریہ میں ان کے قلم سے حسب ذیل سطور نکلی

ہیں، جو ان کے صحیح ذوق اور ذہن کی ترجمان ہیں:

ملک میں اس وقت علم و مذہب کے متعلق جو خیالات بھی پھیلے ہوئے ہیں وہ بالکل غیر معتدل ہیں، کچھ ایسے اشخاص ہیں جو عقل پرستی کے غرور میں مذہب اور مذہبی علوم کے ساتھ تمسخر سے نہیں شرماتے، دوسری طرف حامیان مذہب و علوم مذہبی کا جمود عام ہے جو عقل و علم، مصالح و حکم، فلسفہ و اسرار کی ضرورت سے منکر ہے، ملک میں دونوں قسم کے مضامین اور تصنیفات ہر روز شائع ہوتے ہیں، ہماری جماعت صلح عام کی منادی ہے، وہ دونوں فریق کو دعوت دیتی ہے، وہ جدید علوم، تازہ خیالات، نئی تحقیقات کی بجان و دل خریدار ہے، لیکن اس کے معاوضہ میں بزرگوں کا اندوختہ نہیں کھونا چاہتی ہے، ان نادانوں پر ہنسی آتی ہے جو تمام سرمایۂ عمر دے کر بازار فرنگ کی چمکتی ہوئی چیز کے خریدار بن جاتے ہیں، ہر چیز کو خریدنے سے پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ کیا ہمارے بزرگوں کے تاریک تہہ خانوں ویران خرابوں میں اور مدفون خزانوں میں یہ موجود تو نہیں؟ اگر ہیں تو وہ کون احمق ہوگا جو گھر میں ایک چیز چھوڑ کر اسی کی تلاش میں گلیوں اور بازاروں کی آوارہ گردی قبول کرے گا۔

دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے لوگ اپنی وضع تبدیل کر رہے ہیں، مذاق، طرز معاشرت، طریق تجارت، اسلوب گفتگو ہر چیز میں نمایاں انقلاب ہے، اب اگر دلّی کی پرانی وضع میں ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر ایک چھوٹی سی دوکان پر بیٹھ کر دلی دکنی اور مظہر جانِ جاناں کی زبان میں ہم اکسیر بھی بیچیں تو کون خریدنے آئے گا؟ ہمارے گذشتہ علوم و فنون کا بھی بعینہٖ یہی حال ہے، ہم کو اسی سامان و متاع کو لے کر اب نئے ساز و سامان سے موجودہ طرز کی ایک بڑی شاپ میں بیٹھ کر شیشہ دار الماریوں میں اپنی دکان سجانی چاہیئے۔

پروفیسر محمد اجتباء ندوی

اسلامی بیداری (نشأۃ ثانیہ)
میں
مولانا محمد علی جوہر کے ادب کا حصہ

تاریخ کی نگاہوں نے اقوام و امم کے عروج و زوال، شکست و ریخت، بلندی و پستی کے خوب خوب مناظر دیکھے ہیں اور کبھی جوش و مسرت کے ترانے اور نغمے رقم کیے ہیں اور کبھی داستانِ رنج و غم تحریر کی ہے، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں یورپ نے اپنی تمام تر مادی ترقیوں، عسکری کامرانیوں، عقلی و عمرانی غلبہ و برتری اور فتنہ سامانیوں کے ساتھ جب مشرق کا رخ کیا تو عزائم و مقاصد اور ارادے کچھ اور ہی تھے۔ اسے صرف ممالک فتح کرنا، حکومت کرنا اور اپنی عسکری و مادی طاقت کا مظاہرہ ہی کرنا نہیں تھا بلکہ پورے نظام کو تبدیل کر کے دل و دماغ اور فکر و ذہن، بود و باش کو اپنے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھالنا تھا، وہ اپنی سب سے زیادہ توانائی اسی مقصد کے لیے صرف کرنے کی جانب متوجہ ہوا۔ اور اس کے لیے اپنی بھرپور ذہانت، عقل، فطانت، فہم و تدبر اور علم و ادب و سائنس کے وسائل و ذرائع کو استعمال کیا، بیشتر مسلم و مشرقی ممالک زیر اثر بھی آگئے، مسلمانوں کی ساری دفاعی توانائیاں اس کی یلغار کو نہ روک سکیں اور حکومت و خلافت بھی زوال کا شکار ہو گئی، جس کی تصویر علامہ شبلیؒ کی زبان سے آہ بن کر نکلی۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک؟
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک؟

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض نیم جاں کب تک
زوالِ دولت عثماں، زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک؟
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

اس درد و کرب کے پہلو بہ پہلو تحفظ و بقاء کی بھی فکر و تگ و دو بھی نظر انداز نہیں کی گئی۔ مسلم مفکّرین خاص طور سے یورپ میں تعلیم یافتہ علماء و دانشوروں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اب حکومت کا انحطاط و زوال یقینی ہے، اس لیے فکر تحفظ و بقا کی کرنی ضروری ہے، اس کے لیے انھیں میں سے چند باحوصلہ اصحاب عزیمت نے لوح و قلم اور ادب و انشاء کو تعمیر و فلاح کا ذریعہ بنایا، تاہم بچے کھچے خلافت عثمانیہ کے اثاثہ کے تحفظ اور ملک کی آزادی و حریت کے لیے آخر دم تک کوششیں جاری رکھیں، ان ادیبوں و مفکّروں میں مولانا محمد علی جوہر کا نام نامی نمایاں ہے، ان کی اور ہند کے دوسرے مسلم مفکّرین کی نظر اسلام کی آفاقی، ہمہ جہت اور ہمہ گیر و وسیع قومیت و وطنیت پر تھی۔

استاذ گرامی مولانا محمد ابوالعرفان خاں صاحب ندوی نے اپنے ایک مضمون میں اس صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"بیسویں صدی کا ابتدائی عہد ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، اخلاقی، دینی انحطاط اور زوال کا عہد ہے، اس صورت حال کی ابتدا تو عرصہ سے ہو چکی تھی، لیکن اس کی انتہا کا زمانہ بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں کا ہے، ایسے وقت میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنی شاعری سے، مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" اور "البلاغ" سے اور مولانا محمد علی جوہر نے اپنے "کامریڈ" اور "ہمدرد" سے اور اپنی محنت و مساعی سے ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کو ایک طویل خواب سے جگانے اور بیدار کرنے

کی کوشش کی اور ان کی شیرازہ بندی کی کوششیں کیں اور ان کے اندر ملّی و اجتماعی احساس بیدار کیا۔ رحمہم اللہ

بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ان سب میں مولانا محمد علی جوہر کا کام زیادہ وسیع اور پھیلا ہوا ہے اور انھوں نے ملّت اسلامیہ ہندیہ کو بیدار کرنے میں مختلف الجہات اور متنوع خدمات انجام دی ہیں۔"[1]

یہ حالات صرف ہندوستان ہی کے نہ تھے بلکہ پورے عالم اسلام کے تھے، مولانا محمد علی جوہر ایک سچے اور پکّے محب وطن ہندوستانی کے ساتھ ایک پکّے و سچّے مسلمان بھی تھے، وہ اس حدیث نبویؐ کی سچی تصویر تھے:۔

"المومن للمومن کالجسد الواحد، اذا اشتکی منه عضو تداعی لهٗ سائر الجسد بالسهر والحمی" ایک ایمان والا دوسرے مومن کے لیے ایک جسم کے مانند ہے اگر اس کا کوئی عضو بھی درد محسوس کرے تو پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جائے گا۔"

ومن لم یهتم بأمر المسلمین فلیس منّا" جو مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہ لے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (حدیث نبوی)

ان کی لندن کی گول میز کانفرنس کی آخری تقریر اور کامریڈ و ہمدرد کی متعدد تحریریں بہت واضح الفاظ میں اس پر روشنی ڈالتی ہیں، فرماتے ہیں:۔

"جہاں تک احکام خداوندی کے بجالانے کا تعلق ہے،، میں اول بھی مسلمان ہوں دوئم بھی مسلمان ہوں اور آخر میں بھی مسلمان ہوں، یعنی میں مسلمان ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوں . . . . لیکن جہاں ہندوستان کا سوال آتا ہے، جہاں ہندوستان کی آزادی کا سوال آتا ہے یا جہاں ہندوستان کی فلاح و بہبود کا سوال آتا ہے میں اول بھی ہندوستانی ہوں، میں دوئم بھی ہندوستانی ہوں اور آخر میں بھی ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں، میں دو برابر

---

[1] جوہر نامہ ص ۷۷-۷۶

کے دائرہ سے تعلق رکھتا ہوں جو ہم مرکز نہیں ہیں[1]

یہی وجہ تھی کہ مولانا جوہر اپنی خداداد صلاحیتوں اور غیر معمولی ذہانت، شعلہ فگن حوصلہ وجذبہ کے ساتھ اسلام و ہندوستان کو ہر طرح کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے میدان میں اس جانباز و سرفروش کی طرح اترے تھے کہ یا تو اسے حاصل کرلیں گے یا پھر اسی راہ میں جان دیدیں گے، مولانا محمد علی جوہر نے خلافت تحریک سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ اگر خلافت عثمانیہ باقی نہ رہی اور اس کو ختم کردیا گیا تو یورپی سامراج کے سیلاب بلا کو کوئی روک نہیں سکتا، وہ صرف فوجی برتری اور غلبہ ہی کو سامراجیت کا نشان نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے نتیجہ میں فکری سماجی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی تسلّط کو بھی بے حد زہرناک قرار دیتے تھے، اسی بنا پر خلافت عثمانیہ کے سقوط نے ان پر بہت زیادہ اثر ڈالا اور وہ شدید اضطراب وکرب میں مبتلا ہوگئے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنے مخصوص انداز نگارش میں ان کے حالات تحریر کرتے ہوئے اس کیفیت کو بڑے مؤثر طور سے بیان کرتے ہیں:۔

"ولایت گئے اور آئے، گرجے، چیخے، چلائے، دم لینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہوگئی۔ خلافت اسلامیہ کی آخری جنگ، آہ کہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفہ اسلام کا پرچم لہرایا۔ محمد علی اب اپنے عالم میں کہاں تھے، قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منھ کا ایک ایک بول سنان و خنجر، زبان کھولی تو نظر بند ہوئے، نظر بندی بھی مہینہ دو مہینے کی نہیں، اکٹھے پانچ برس کی، عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زباں بندی، معطلی کی نذر! شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے، مظلوم کی زبان بن کر نالہ و فریاد کرتے ہیں ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھ نظر بند دعا بند نہیں ہیں
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ[2]

---

[1] جوہر نامہ ص۲۶، [2] محمد علی جوہر، ذاتی ڈائری کے چند ورق حصہ دوم ص۲۱۷-۲۱۶

مولانا محمد علی جوہر انگریزی و اردو زبان بے تکلّف اور بغیر کسی تصنع و عبارت آرائی کے لکھتے تھے، خواہ کامریڈ ہو یا ہمدرد، شعر ہو یا تقریر بڑے پُر زور و مؤثر و پُر درد ہوتی تھی پڑھنے اور سننے والے کو مسحور و گرویدہ بنا دیتی تھی، انھوں نے اپنے اس ادب کو مسلمانوں کی بیداری، سیاسی فکری اور دینی شعور کی بالیدگی اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے وقف کر دیا جس کا وہ خواب دیکھتے رہے، مگر افسوس کہ اپنی زندگی میں اسے شرمندۂ تعبیر ہوتے نہ دیکھ سکے البتہ اُمّت و وطن کو وہ سب کچھ دے گئے۔ جس کی روشنی میں شعور و بیداری آسان ہوتی چلی گئی، اور ان کی رہنمائی نے اپنی مردم شناسی، حقائق و حالات سے باخبری، زمانہ کی نباضی، دوست و دشمن پر رائے زنی بڑے ایجاز و اعجاز کے ساتھ راہ حق پر لگا دیا، ایک مثال ان کے اعجاز بیانی کی ملاحظہ ہو،

"انگریز کسی کو ہرگز اس وقت تک کچھ نہیں دیتے، جب تک انھیں اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اگر آج اتنا بھی نہ دیا گیا، تو کل کو اس سے دوگنا اور تگنا دینا پڑے گا۔" ص ۳۵۰ (ذاتی ڈائری ص ۹۸-۲۹۹)

مولانا محمد علی جوہر فطری طور سے داعی تھے، اسلام کے خیر و فلاح کے، انسانیت اور اخلاقیات کے، وہ جس پلیٹ فارم پر ہوتے خواہ خلافت تحریک کا ہو، کانگرس کا ہو مسلم لیگ کا ہو، یورپ کا ہو یا عرب و ترک و افغان کا ہو، ہر جگہ سے اس دعوت کا پیغام ضرور دیتے تھے انھیں یہ پختہ یقین بھی تھا کہ اسلام ہی سچّا دین اور تمام مشکلات کا حل و علاج ہے لکھتے ہیں:۔

"لیکن اب حالات بدل گئے ہیں، مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں، سب پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کبھی اور کسی حالت میں بھی خدا کے احکام کے خلاف عمل نہیں کر سکتا، چاہے اس کا حکم کانگرس دے، خلافت کمیٹی دے یا کوئی اور دے۔"

افغانستان گئے تو وہاں کے سربراہوں سے بہت سے سیاسی، معاشی، سماجی مسائل کے ساتھ اسلامی احکام اور اس کی اخلاقی قدروں کے بارے میں بھی زور دے کر تبادلۂ خیال کیا، نماز کا بھی مسئلہ آیا، انھیں کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

"نماز کا بھی یہی حال ہے اور ہر نمازی ایک خاص سپاہی ہوتا ہے، مسلمانوں میں آج کل نفاق وشقاق کا مرض اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی جان ومال پر حملہ کرتے رہتے ہیں حالانکہ اسلام کا حکم ہے کہ "سباب المسلم فسق، وقتالہ کفر" یعنی مسلمانوں سے سخت کلامی بدکاری ہے، اور اس سے لڑنا کفر ہے"

مغربی تہذیب کی جلوہ گری نے مسلم نوجوانوں میں جس طرح بگاڑ پیدا کرنا شروع کردیا تھا اس کے بارے میں افغانستان کے سپہ سالار غازی سے ان کی گفتگو ان الفاظ میں ہوئی:۔

"اگر ہمارے نوجوانوں نے لندن کا لباس زیب تن کرنا سیکھ لیا، یا ہماری عورتیں پیرس کی فراک پہننا اور بال ترشوانا اور ان کو گھونگھر والے کروانا سیکھ گئیں تو کیا یورپ اس سے خائف ومرعوب ہوجائے گا، وہ تو یہی سمجھے گا کہ افغان ہم سے خائف ومرعوب ہوگئے ہیں، میں خود اس قسم کی اصلاحات کا دشمن نہیں...

آخر میں سپہ سالار غازی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"اور ان کا خیال ہے کہ یورپ خود اسلام سے اس میں بھی سبق لے گا۔ اور یہی کیا ہے ہر چیز میں اسلام سے سبق لے گا بشرطیکہ ہم خود اسلام کو سمجھیں اور اسے یورپ کو سمجھانے کی کوشش کریں"[1]

مولانا جوہر اپنے ایک مقالہ میں فرماتے ہیں:۔

"جس طرح ترک، افغانی یا ایرانی کو اپنے ملک کی ایک انچ زمین پر قبضہ کرنے دینے کا روادار نہیں، اور نہ افغانی یا ایرانی ترک کو یا کسی دوسرے کو اپنے ملک پر قابض ہونے دینا گوارا کرسکتے ہیں، اسی طرح میں بھی ہندوستانی راج کے سوا اور راج تسلیم نہیں کرسکتا۔

ہندوستان سے رسول صلعم کو محبت تھی، اور اس بنا پر میرا دلی عقیدہ ہے کہ

---

[1] مضامین محمد علی ص ۱-۴۰۳

یہاں کے لوگ ایک نہ ایک دن اسلام کی آغوش میں آجائیں گے لیکن زبردستی اور قوت کے زور سے نہیں بلکہ تبلیغ کے ذریعہ سے جس طرح اگلے بزرگان دین نے کی تھی اور خود بہار کے جنگلوں میں آپکے مخدوم (شیخ یحیٰی منیری) اور دیگر اولیاء کرام نور اسلام پھیلاتے تھے، ملوکیت کی خاطر ملکوں کی تسخیر اسلامی اصول کے خلاف ہے، ہم نے دنیا کو حکومت کرنے کے لیے فتح نہیں کیا تھا بلکہ اسلامی عقائد کی تعلیم دینے کے لیے اور گمراہی سے نکال کر نور ہدایت میں لانے کے لیے ..... آج ہمیں بھی اسی رواداری سے اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔ جن پنج ذات والوں کو برہمن ذلیل کیا کرتے ہیں ہم ان کی خدمت کریں، انھیں دائرہ اسلام میں لاکر اپنی لڑکی ان کو دیں ان کی لڑکی ہم لیں، اور ہر معاملات میں مساوات عطا کریں۔"[1]

ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں:۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ میرا دل و دماغ سب کچھ کانگریسی ہے لیکن پھر بھی میں کہتا ہوں، اور سب لوگ اس کو سمجھ لیں کہ اسلام دین الفطرۃ ہے، جو اس سے ذرّہ بھر بھی ہٹا وہ گمراہ ہوا، اس میں کسی کی تخصیص نہیں، خواہ مہاتما گاندھی ہوں، یا مولانا شوکت علی ہوں، خواہ مصطفےٰ کمال ہوں، جو لادی ولاطینی پھیلا رہے ہیں، یا شاہ امان اللہ اور ان کی ملکہ ثریا ہوں جو پردہ کو اٹھا رہے ہیں اور ہاتھ کھلے رکھنے کا فیشن اختیار کر رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہندوستان اسلام کے جھنڈے کے نیچے آجائے گا، اور سب لوگ مسلمان ہوں گے لیکن جبر واکراہ سے نہیں، بلکہ اس قسم کی تبلیغ سے جیسی کہ رسول اللہ صلعم کو کرنے کا حکم ہوا تھا۔ "جَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" اور یہی بہتر ہے۔ آج جو لوگ ہمارے دشمن ہیں کل وہ دوست ہو سکتے ہیں، قرآن کا ارشاد بھی یہی ہے، جہاد کا حکم بھی اسلام نے اسی وقت تک کے لیے دیا تھا کہ فتنہ مٹ جائے۔"[2]

---

[1] مقالات محمد علی حصہ دوم (مولانا رئیس احمد جعفری) ص ۲۳-۲۲۴ ، [2] ایضاً ص ۲۱۳

مولانا محمد علی جوہر محمڈن کالج علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، اس سے بے پناہ محبت تھی، اس کے بانی کے عاشق و عقیدت مند بھی تھے، اُمت و قوم کے لیے ان کی اور ان کے کالج کی خدمات پر بڑا فخر و ناز بھی تھا، ابتلاء و آزمائش، انحطاط و پستی اور پسماندگی و بے چارگی کے عہد و عالم میں ملک و ملت کے سہارا و اعتماد، ایمان و ایقان، ہمت و عزم اور بقاء و تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ کالج و سرسیدؒ ہی کو قرار دیتے تھے، ۱۹۰۷ء میں جبکہ وہ کالج چھوڑ کر کارگہہ حیات میں الجھ چکے تھے، کہ اچانک خبر ملی کہ علی گڑھ ان کی محبوب دانش گاہ کشمکش و اختلاف کا شکار ہے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ علی گڑھ پہنچے، اتفاق سے اسی دن سرسیدؒ کی برسی تھی، ہر فریق سے ملے، جوڑا اور منایا اور پھر سرسیدؒ مرحوم کی خدمت میں بڑے درد و گداز سے اپنی عرضداشت پیش کی:۔

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو — ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے ناخدا تم ہو
یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو — وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڑھ میں — اور اس پر یہ تماشا، ہر طرف اور جا بجا تم ہو
سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا — جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو
تمہیں ہو زندۂ جاوید، باقی جانے والے ہیں — نمونہ ہیں فنا کے ہم تو تمثیل بقا تم ہو

تحریک ترک موالات میں علی گڑھ کا رخ کیا، انگریزوں سے اسے چھٹکارا دلانا تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ امتِ مسلمہ کی تعلیم کا بھی نظم اس انداز سے کرنا مقصود تھا کہ اس میں جذبۂ حریت کے ساتھ جذبۂ خدمت اسلام بھی پیدا ہو سکے، انگریز کی غلامی کا جوا اتار کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی غلامی و عبدیت کے لیے سر تسلیم خم بھی ہو جائے، اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں ہو تاکہ سرفرازی و کامرانی کے جوہر سے مسلم و ہندوستانی نسلیں آراستہ ہوں، علی گڑھ کو تو ہموار نہ کر سکے مگر کچھ سرفروشوں اور ملک و ملت کے دیوانوں نے ان کی پرسوز آواز پر لبیک کہی اور علی گڑھ ہی میں اپنا ایک ملی ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم ہو گیا، تحریک آزادیٔ ہند کے عظیم رہنما اور علماء کے ممتاز سربراہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنی دعاؤں سے اس کی بنیاد رکھی اور مولانا محمد علی جوہر اس کے پہلے شیخ الجامعہ منتخب ہوئے، اور تدریس کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔

تفصیل کی گنجائش نہیں، جامعہ کا تعارف خود مولانا جوہر کے معجزانہ مختصر لفظ سے پوری تاریخ مقصد اور حقائق و خصوصیات آشکارا ہو جائیں گی فرمایا تھا جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی خصوصیت ہے:

" خدا پرستی، ملّت پروری، وطن دوستی، ص۴۱۸ (۱)

کیا اس کے بعد بھی کچھ مزید لکھنے یا کہنے کی ضرورت ہے؟

مولانا جوہر کا سوز و درد، کرب و الم صرف ذاتی و شخصی نہ تھا بلکہ آفاقی، انسانی اور وطنی، ملکی و ملّی تھی، یہ ان کے ایمان کی گہرائی و گیرائی کا کرشمہ ہے جس نے انھیں فرزانگی سے دیوانگی میں تبدیل کر دیا تھا، خود ہی تو کہا تھا ؎

مئے اسلام کا بھلا جوہر
نشہ چڑھ کر کہیں اترتا ہے

وہ فعال، متحرک اور ہمہ تن و مجسم تحریک تھے، انھوں نے آزادی کی جنگ لڑی اور اس راہ میں پوری توانائی صرف کر دی، یہاں تک کہ اپنی عزیز جان بھی نثار کر دی، اس تگ و دو، جد و جہد، محنت و جانفشانی کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں رو رو کر ملک و ملّت، عالم اسلام اور احیاء اسلام اور نشأۃ ثانیہ کے لیے دعا بھی کرتے تھے، بڑے سادہ اور مؤثر الفاظ میں دعائیں تو بہت کیں، ایک دعا کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں جن میں سوز و درد بھی ہے، تڑپ بھی ہے، اُمّتِ مسلمہ کو پیغام بھی ہے اور اسلامی نشأۃ ثانیہ کی آرزو اور التجا بھی ہے:۔

" آج سے پہلے بھی جب کبھی دین اقدس کی حمایت و پاسبانی اور ملک و ملّت کی خدمت گذاری کے لیے میں نے قدم اٹھایا تھا تو تیری ہی توفیق فرمائی کے بھروسہ اور تیرے ہی لطف و کرم گستری کے سہارے پر اٹھایا تھا اور آج بھی تیری اور صرف تیری مقدس ذات کا سہارا ہے اور اسی پر اعتماد و بھروسہ، وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون، اور بھروسہ کرنے والوں کو صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے کہ تیرے سوا اور کون سا دروازہ ہے جس کو کوئی کھٹ کھٹائے اور کون سی چوکھٹ

۱؎ محمد علی ذاتی ڈائری ص۲۹۹

ہے جس پر جاکر سر رگڑے۔

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے
اک فقط تیرا سہارا چاہیئے[1]

مولانا محمد علی جوہر نے اس کے علاوہ بھی بڑی دل سوزی سے دعائیں کیں جو یقینی طور سے شرف قبولیت سے باریاب ہوئیں، خود انھیں نے کہا ہے:

اجابت کیوں نہ آئے عرش سے تا فرش، اگر جوہر
دعا کا سلسلہ تیری زمیں سے آسماں تک ہے

مولانا محمد علی جوہر ایک سچے دیندار، باحمیت و باغیرت مسلمان بھی تھے، بااصول لیڈر و رہنما بھی تھے، ملک و ملّت کے شیدائی بھی تھے اور آزادی وطن کے پرجوش مجاہد بھی تھے، ادیب و شاعر اور کامیاب صحافی تھے اور ہر میدان میں رہتی دنیا کے لیے شاندار کارنامے اور یادیں چھوڑی ہیں، ہر ایک جگہ و کام میں ان کے اصول و ضوابط اور فکر و عقیدہ تھا، جن کا دامن کبھی نہ چھوڑا، اور حق بات دوست و دشمن سب کے سامنے برملا و بلا جھجک کہی، ایک حق پسند صحافی کے طور سے ان کا یقین تھا کہ:۔

"بغیر کسی عقیدہ کے اخبار نویسی محض دوکان داری ہے، اخبار کا کام رائے عامہ کی رہنمائی کرنا ہے نہ کہ اس کی تقلید، یہ طریقہ معیوب ہے کہ اخبار کے کاروبار کی کامیابی کے لیے اور اخبار کو ہر دل عزیز بنانے کے لیے پڑھنے والوں کے خیالات کی تائید کی جائے"[2]

جناب احمد سعید ملیح آبادی نے ان کی صحافت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"ان کی صحافت کا بنیادی عقیدہ اور نظریہ تھا قومی اتّحاد، ہندوستان کی کامل آزادی، مسلمانوں کی سربلندی اور عالم اسلام کی حفاظت اور سرفرازی، اپنے

---

[1] ہمدرد کی بسم اللہ، ۹ر نومبر ۱۹۲۴ء، [2] جوہر نامہ ص ۸۹

اصولوں میں مولانا نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، لکھتے ہیں:۔

"میں نے ہمیشہ اتحاد کی حمایت کی اور میرے اخبار کا نام "کامریڈ" اسی پر دلالت کرتا ہے"[1]

آخر میں ان کے چند اشعار پیش ہیں جو جذبۂ دینی اور جذبۂ حب الوطنی دونوں سے بیک وقت مشکبار ہیں۔

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

گر بوئے گل نہیں، نہ سہی، یادِ گل تو ہے
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

پاداش جرم عشق سے ہے کب تلک مفر
مانا کہ تم رہا کیے دار و رسن سے دور

کچھ بھی وہاں نہ خنجر قاتل کا بس چلا
روح شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دور

تقویٰ کے بعد خوف کہاں حزن پھر کہاں
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن سے دور

مست مئے الفت کہاں اور ہوس کہاں
طرز وفائے غیر ہے اپنے چلن سے دور

یہ اس مرد مومن اور مجاہد آزادی کی مختصر سی داستان ہے جس نے دلوں میں آزادی کا پرجوش و پرشور جذبہ پیدا کیا اور عقیدہ و ایمان کی مشعل روشن کی، جس نے ملک و ملّت کو حیات نو عطا کی، اور کامیابی و کامرانی کی راہوں کو تابناک رکھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی

---

[1] جوہر نامہ ص ۸۹

خدمت کا صلہ اس دنیا میں بھی اتنا عظیم عطا کیا کہ جو اس نے کہا یا کیا اس کی لاج رکھی، حدیث شریف میں ہے۔ رب أشعث اغبر لو اقسم علی اللہ لأبرہ "

کچھ ایسے بھی پریشان حال و بال ہیں کہ اللہ کی قسم کھالیں تو اسے وہ پوری کرتا ہے۔

اس کی حیات و موت اور قبلہ اوّل و پیغمبروں کی سرزمین اور معراج نبوی کے قرب میں تدفین کو محبوبیت کی علامت و نشان بنا دیا ہے:۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن
خدا بخش لائبریری پٹنہ

مولانا محمد علی جوہر کی اُردو صحافت

کے

اہم موضوعات و خصوصیات

سرزمین ہند کی تاریخ نئی نہیں پرانی اور بہت پرانی ہے۔ اور یہ اپنے ہر دور میں قیمتی سے قیمتی اور گراں قدر انسانوں کے ہیرے جواہرات اگلتی رہی ہے۔ اسی سرزمین سے ہر زمانے میں بڑے بڑے مذہبی رہنما، سیاسی قائدین، شعراء و ادباء اور ریفارمرس جنم لیتے رہے ہیں۔ اور انسانوں کی فلاح و بہبود اور سدھار کے کام کرتے رہے ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ملک اس وقت بڑے نازک مسائل، انقلاب آفریں حالات، قربانی، ایثار، جوش و خروش اور سیاسی و سماجی بیداری اور چوکسی کے دور سے گذر رہا تھا۔ اگر سوال کیا جائے کہ ایسے اہم اور نازک موقع پر وہ کون مرد مجاہد تھا جس نے اپنی انگریزی و اُردو صحافت اور خطابت کے ذریعے ہندوستانیوں کے دلوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا، ملک کے بکھرتے ہوئے شیرازے کو پیار و محبّت کی لڑی میں پرو دیا، باشندگان ہند کے دلوں میں آزادی کی روح پھونک دی، انگریزی سامراجیت کو درہم برہم کر دیا، غلام ملک کے بجائے آزاد ملک میں مرنے کو پسند کیا۔ اپنی انگریزی دانی سے انگریزوں کو حیرت میں ڈال دیا — ہندوستانی مسلمان اور عالم اسلام کے مسلمانوں کے قلوب میں اسلامی اخوت، اسلام پسندی اور اسلام دوستی کا عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ اور اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لیے راستہ ہموار کیا تو

ان تمام سوالوں کے جواب میں صرف ایک فرد کا نام پیش کیا جا سکتا ہے اور وہ ہیں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء)

مولانا محمد علی جوہر دراصل ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اسلام کے عظیم سپاہی اور جانباز قائد تھے۔ وہ ایک شاعر اور بے مثل خطیب تھے۔ انگریزی و اُردو کے معروف ادیب اور بلند پایہ صحافی تھے۔ تاریخ نگار اور تاریخ ساز تھے۔ تحریک آزادی کے بے باک اور پرجوش لیڈر تھے۔ ایثار و قربانی کے مجسمہ تھے۔ ہندوستان اور اسلامی ممالک میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کے شیدائی اور فدائی تھے۔

مولانا محمد علی جوہر دینی اور تعلیمی لحاظ سے ایک اچھے گھرانے کے فرد تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں ایم، اے، او کالج علی گڑھ سے بی اے کیا۔ اور پھر آکسفورڈ یونیورسٹی سے ۱۹۰۲ء میں بی۔ اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے آبائی شہر رام پور میں ملازم ہوئے چند دنوں تک یہاں ملازمت کی۔ اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں ریاست بڑودہ میں ایک اہم پوسٹ پر بحال ہوئے۔ زندگی خوش حال اور مزے میں گزرنے لگی تھی لیکن قدرت نے چونکہ انھیں قلب سلیم اور حساس دل عطا کیا تھا۔ اور صحیح اسلامی فکر کی دولت سے نوازا تھا۔ اس لیے وہ چند کلیوں پر قناعت کیسے کر سکتے تھے۔ اس عارضی دنیا کی عارضی خوش حالی کو دائمی کس طرح سمجھ سکتے تھے، انھوں نے چند ماہ بعد ہی ریاست بڑودہ کی ملازمت ترک کر دی سیاست کی وادیٔ پرخار میں قدم رکھ دیا۔ نہ انھوں نے اپنی خوش حال زندگی کے بارے میں سوچا اور نہ مستقبل کی الجھنوں، پریشانیوں کلفتوں، بدنامیوں کے سلسلے میں غور و فکر کیا۔ یہ سچ ہے کہ عشق اپنے حدود میں عقل کو دخیل ہی ہونے کب دیتا ہے۔ محمد علی تو محمد علی تھے۔ جو مستوں میں مست تھے، ہاں مست الست!

مولانا محمد علی جوہر نے اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ صحافت کی راہ سے ہی اپنے ملک اور ملّت اسلامیہ کی خدمت کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دے سکتے ہیں۔ اسی بنا پر انھوں نے پہلے گپ کے نام سے ۱۹۰۴ء میں الہ آباد سے انگریزی زبان میں پندرہ روزہ ایک اخبار نکالا۔ جس کے صرف دو شمارے نکل سکے۔

اس کے بعد دوسرا انگریزی ہفت روزہ اخبار کامریڈ کے نام سے ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء میں شائع کیا۔ جو انقلاب آفریں تھا۔ جس میں ہندوستانی مسلمان، ہندوستانی سیاست، اسلامی ممالک کے سیاسی حالات و مسائل پر خبریں شائع ہوتی تھیں اور انگریزی حکومت کی سیاسی چالوں پر بھرپور وار کیا جاتا تھا۔ اس اخبار نے جلد ہی سیاسی و صحافتی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ اور بڑا نام پیدا کیا۔ ہندوستان اور یورپی ممالک کے بڑے بڑے انگریز اور انگریزی داں اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ وائسرائے ہند، وزراء اور انگریزی صحافی اور ادیب اس کو بڑے فخر کے ساتھ خریدتے اور بڑے احترام کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس اخبار کا آخری شمارہ ۲۲ر جنوری ۱۹۲۶ء میں نکلا۔ اس اخبار نے اسلامی دنیا کو بیدار کرنے، مسلمانوں کو سیاسی سوجھ بوجھ عطا کرنے اور دینی اقدار کو زندہ کرنے میں جو اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کو مسلم تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

یہ اخبار چونکہ انگریزی زبان میں تھا جس سے فیضیاب ہونے والے صرف انگریزی داں طبقہ کے لوگ تھے۔ اس لیے مولانا محمد علی جوہر نے اُردو زبان میں بھی ایک اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ ان کے خیالات و احساسات اور جذبات سے اُردو داں طبقہ بھی واقف ہو سکے اور ان میں بھی دینی و سیاسی شعور پیدا ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے اس خیال سے ایک پرچہ نقیب ہمدرد کے نام سے ۲۳ر فروری ۱۹۱۳ء میں شائع کیا جو دراصل اگلے پرچے کا تعارف اور مقدمۃ الجیش تھا۔ باضابطہ طور پر یہ پرچہ روزنامہ ہمدرد کے نام سے جون ۱۹۱۳ء سے نکالنا شروع کیا۔ یہ پرچہ درمیانی وقفے کے ساتھ ۱۹۲۹ء تک شائع ہوتا رہا اس کا آخری شمارہ ۱۲ر اپریل ۱۹۲۹ء کو نکل کر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس اخبار کی اشاعت کے اغراض و مقاصد کیا تھے۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر خود ہی ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے جب ۱۹۱۰ء میں ریاست بڑودہ کی ملازمت سے اس لیے علاحدگی اختیار کی تھی کہ اس سے زیادہ وسیع دائرے میں قدم رکھ کر ملک و ملّت کی خدمت کیا کروں۔ تو کامریڈ نکالنے کے لیے کلکتہ گیا تھا۔ اس وقت سے یہ خیال میرے دل میں تھا کہ انگریزی ہفتہ وار تو حکومت کی خدمت میں عرض حال کرنے کے لیے ہو۔

اور ہندوستان کی دوسری ملتوں کو بھی ملت اسلامیہ کے افکار و مصالح سے اس کے ذریعے سے باخبر رکھا جائے اور ایک حد تک ہندوستان کے باہر کی اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کو بھی افکار و مصالح سے آگاہ کیا جاتا رہے۔ لیکن باقی مسلمانان ہند کی خدمت کے لیے جو اس ملتِ مرحومہ کے سواد اعظم ہیں۔ ایک روزنامہ اُردو میں بھی شائع کیا جائے۔"

مولانا محمد علی جوہر نے اس اخبار کو بڑے اہتمام سے نکالا۔ اس کی طباعت اور چھپائی پر خصوصی توجہ دی اس کے ایڈوٹوریل بورڈ میں ملک کے نامور اور اچھے صاحب قلم بحال کیے گئے مقامی طور پر خبروں کی حصولیابی کے لیے رپورٹر مقرر کیے۔ دوسرے شہروں میں نامہ نگار نامزد کیے گئے۔ اس کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی اہم خبروں کے لیے خبر رساں ایجنسیوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جس کا رواج اس وقت کی اُردو صحافتی دنیا میں شاذ و نادر تھا۔ ان تمام باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمدرد اخبار کے لیے کس قدر محنت و مشقت اٹھائی جا رہی تھی اور کتنی شان و شوکت کے ساتھ خبروں کو مرتب کر کے شائع کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام کوششوں کے در پردہ ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا ملت اسلامیہ کو بیدار کرنا اور ہندوستان میں آزادی کی روح پھونکنا۔

دوستو! آپ جانتے ہیں کہ کسی اخبار یا جریدہ کے موضوعات اور عناوین بڑے اہم اور گراں قدر ہوتے ہیں کیونکہ ان کو دیکھنے اور پڑھنے سے ہی اس اخبار کے دائرہ کار، دائرہ فکر اور مبلغ علم کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے ہمدرد کے کل یا کچھ شمارے تو ضرور دیکھے یا پڑھے ہوں گے آیئے ذرا ایک نظر اس کے کچھ اہم اور گراں قدر موضوعات پر ڈالیں اور دیکھیں کہ اسلام کے دیوانے، ادب کے عاشق اور سیاست کے مرد مجاہد محمد علی نے کیا سوچا، کیا کیا۔ ہمیں کیا دیا اور کیا لیا۔ ایک اچھے اور معیاری اخبار کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اس میں مقامی اور غیر مقامی خبریں زیادہ سے زیادہ شائع ہوں۔ جو معتبر اور باوثوق ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں۔ اس اعتبار سے ہم ہمدرد کو دیکھتے ہیں تو اس میں ہندوستان کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، فرانس، چین، ایران، افغانستان، حجاز، جنوبی و شمالی افریقہ، ترکی، شام طرابلس، مراکش، مصر اور یمن وغیرہ کی خبریں

ملتی ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کا مقصد چونکہ ان ممالک کے سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور تعلیمی مسائل سے ہندوستانی مسلمانوں کو آگاہ کرنا اور ان میں اسلامی شعور بیدار کرنا تھا اس لیے انھیں جیسے مسائل حالات و واقعات کی خبریں ہمدرد میں چھاپی جاتی تھیں۔ مثلاً افریقہ سے متعلق۔ ہندوستان اور جنوبی افریقہ (ہمدرد ۲۸/۱/۱۹۱۳ء) جنوبی افریقہ میں ہندوستانی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ (ہمدرد ۱۲/۵/۱۹۱۴) شمالی افریقہ سے ہسپانیہ کی بیزاری۔ اہم امور کا انکشاف (ہمدرد ۸/۱۱/۱۹۲۳ء) چین سے متعلق۔ چین کی خانہ جنگی (ہمدرد ۵/۶/۱۹۲۷ء) چین کی آزادی (۸/۱۲/۱۹۲۶ء) جنگ کی سیاسی حالت (ہمدرد ۱۰/۲/۱۹۱۲) چین میں اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ (ہمدرد ۱۳/۶/۱۹۱۳ء) مسلمانان چین اور ان کے مذہبی اور سیاسی مشاغل (ہمدرد ۲۴/۱۱/۱۹۲۶ء) بلقان اور جنگ بلقان پر۔ محاربۂ بلقان (ہمدرد ۵/۶/۱۹۱۳) ختم جنگ کے اسباب۔ انکشاف حقیقت (ہمدرد ۲۴/۲/۱۹۲۴ء) بلقان کی ایک اسلامی جمہوریہ۔ البانیہ (ہمدرد ۶/۱۱/۱۹۲۷ء) ترک مقتولین کی تعداد کا اندازہ (ہمدرد ۲۴/۵/۱۹۲۴ء) ترکی سے متعلق۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا تاریخی خطبہ۔ ترکی وطنی اور قومی تحریک کا آغاز (ہمدرد ۲۳/۱۱/۱۹۲۷ء) انقلاب ترکی اور انقلاب فرانس۔ مقابلہ و موازنہ (ہمدرد ۱۱/۹/۱۹۲۵ء) جدید ترکی۔ ترقی کے آثار (ہمدرد ۳/۱۲/۱۹۲۵) جدید ترکی اور اسلامی جذبات (۲۴/۱۰/۱۹۲۶ء) ترکی میں بجائے عربی کے ترکی خطبہ (ہمدرد ۳/۶/۱۹۲۷ء) حجاز سے متعلق جزیرۃ العرب کی حالت (ہمدرد ۳۱/۱/۱۹۲۷ء) حجاز کی تجارت (ہمدرد ۲۸/۱/۱۹۲۷ء) دولت ہا مصر و حجاز میں ناچاقی (۲۱/۶/۱۹۲۷ء) سلطان ابن سعود اور برطانیہ (ہمدرد ۱۷/۱/۱۹۲۷ء) شریف حسین کی یہ کاریوں کے چند اوراق (ہمدرد ۲۰/۹/۱۹۲۵ء)

یہ تو عالم اسلام اور دیگر ممالک سے متعلق خبریں اور رپورٹیں تھیں۔ اب ذرا اپنے ملک ہندوستان کی خبروں کو دیکھئے اور اس کے ساتھ ہمدرد کی ہمدردی۔ دل چسپی اور وابستگی کے نمونے ملاحظہ کیجئے۔ سیاسی پہلو سے۔ انڈین نیشنل کانگرس پر۔ ملک کی موجودہ سیاسی حالت کانگرس کی مختلف پارٹیوں کا مسلک اور ہم سب کا فرض (ہمدرد ۱۸/۸/۱۹۲۷ء) کیا نہرو رپورٹ قابل قبول ہے (ہمدرد ۱۶/۱۰/۱۹۲۸ء) مقاطعہ کمیشن کا جلسہ اور نہرو رپورٹ کی تائید کا مسئلہ

(۱۸/۱۰/۱۹۲۸ء) مسلمان اور شرکت کانگرس (ہمدرد ۵/۱/۱۹۲۷ء) ہندو مسلم اتحاد۔گانے اور باجے کے مسائل پر مہاتما گاندھی کی تجویز (ہمدرد ۲۹/۱۲/۱۹۲۷ء) ہندوستان کا دستور اساسی (۲/۱/۱۹۲۸ء) اسی طرح آل انڈیا مسلم لیگ پر دیکھئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ ۴/۱/۱۹۱۴) مسلم لیگ کا قضیہ۔ ڈاکٹر کچلو کا مفصل بیان (ہمدرد ۲۵/۱۲/۱۹۲۷ء) بعض اکابر لیگ کا زاویۂ نگاہ (۹/۱/۱۹۲۵) مسلمانان پنجاب کے جذبات کی صحیح ترجمانی (ہمدرد ۱۹/۱/۱۹۲۸) اب ذرا ایک نظر اسلامی مسائل پر۔ اسلام کی تبلیغ۔ بہترین طریقہ کار کیا ہے (ہمدرد ۲۹/۱۲/۱۹۲۷) انگلستان میں تبلیغ اسلام (ہمدرد ۲۲/۵/۱۹۱۴) اوقاف (ہمدرد ۵/۵/۱۹۱۴) مسئلہ اوقاف (ہمدرد ۱۵/۲/۱۹۱۴) اشاعت اسلام میں ظاہری رکاوٹیں (۲۴/۵/۱۹۱۴) اسلام اور اشتراکیت (ہمدرد ۷/۱۰/۱۹۲۵) خادمان ملک و ملت اور ان کی معاش (ہمدرد ۵/۱۲/۱۹۲۶) اسمبلی اور قانون اسلام (ہمدرد ۱۶/۵/۱۹۲۸) بیسویں صدی اور اسلام (ہمدرد ۱۴/۱/۱۹۱۴) اسلامی جمہوریت (ہمدرد ۱۵/۱۲/۱۹۲۶) ایک نظر ڈالئے دینی معاملات و مسائل پر بھی۔ اسوۂ ابراہیمی (ہمدرد ۳۰/۵/۱۹۲۸) اسوۂ حسنہ (ہمدرد ۱/۱۰/۱۹۲۵) عید میلاد النبی (ہمدرد ۱۸/۱۰/۱۹۲۵) عید۔ احتساب نفس کا ماہ تقدس (ہمدرد ۲۳/۳/۱۹۲۸ء) عید قرباں اور حقیقی قربانی (ہمدرد ۲۴/۵/۱۹۲۷) دہلی کے مزارات (ہمدرد ۲۲/۲/۱۹۱۴) مساجد اللہ غیروں کے ہاتھوں میں (ہمدرد ۲۵/۱۰/۱۹۲۶) نماز، روزہ حج، زکوٰۃ (ہمدرد ۳۱/۳/۱۹۲۷) بہاری شادی و غمی کی رسوم (ہمدرد ۶/۲/۱۹۲۷) پردہ کے شرعی احکام اور علمائے کرام (ہمدرد ۳۰/۹/۱۹۲۷) ہم دنیا میں کس لیے آئے ہیں (ہمدرد ۴/۷/۱۹۲۸) ان موضوعات کے علاوہ ہندوستان اور اسلامی ممالک کی تنظیموں اور تعلیمی اداروں پر بھی خبریں اور رپورٹیں نظر آتی ہیں جیسے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، انجمن خدام الحرمین انجمن خدام کعبہ، جمعیۃ علمائے ہند، جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ اسلام، خلافت کانفرنس، مدینہ یونیورسٹی، مؤتمر عالم اسلامی وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستانی اور عالمی شخصیات پر بھی خبریں چھپی ہیں جیسے امان اللہ خاں، اجمل خاں، جمال الدین افغانی، حافظ شیرازی، شردھانند، مہاتما گاندھی، علی برادران،

مولانا عبدالباری فرنگی محلی ۔غازی محمد بن عبدالکریم وغیرہ۔

ان موضوعات کے علاوہ مختلف دیگر موضوعات پر بھی خبریں، رپورٹیں اور مضامین مل جاتے ہیں۔ طب وصحت پر جیسے ہندوستان میں حفظان صحت کی سرکاری پالیسی (۲۹/۵/۱۹۱۴) علوم و فنون پر جیسے جادو کیا شے ہے (۲۹/۲/۱۹۲۸) انسان کی بلند پروازیاں۔ فن ہوا بازی کی تاریخ۔ (۲۳/۱۲/۱۹۲۷) صحافت پر جیسے روزنامہ زمیندار (ہمدرد ۲۷/۱/۱۹۱۴) آہ زمیندار (ہمدرد ۱۴/۲/۱۹۱۴) پریس ایکٹ پر جیسے انڈین پریس کی گذشتہ تاریخ (ہمدرد ۲۷/۲/۱۹۱۴) پریس ایکٹ۔ برٹش پبلک سے اپیل فوری ترمیم کا مطالبہ (ہمدرد ۳/۴/۱۹۱۴) اقتصادیات پر جیسے عورت اور اقتصادیات (ہمدرد ۵/۳/۱۹۱۴) مسئلہ افلاس و تمول (ہمدرد ۳/۱۲/۱۹۲۵) بے کاری اور افلاس (۱۱/۴/۱۹۲۷) وغیرہ۔ اب تک تو گفتگو سیاست، مذہب، علوم وفنون پر چل رہی تھی۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ مولانا محمد علی جیسا شاعر وادیب اور شعر وادب کا رسیا اپنے اخبار کو اس سے محروم کر دیتا۔ اور اس صنف عالی سے اپنی محفل صحافت کو نہ سجاتا اور نہ سنوارتا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمدرد کے صفحات شعر وسخن اور ادب کے اعلیٰ اور خوبصورت خیالات، دل کش جذبات واحساسات اور نازک افکار سے سجے ہوتے ہیں۔ ہمدرد کے ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی شعر وادبی تخلیق ضرور نظر آتی ہے۔ لیکن تخلیق بھی کیسی۔ بے مقصد اور محض انسانی جنسیات کو ابھارنے والی نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے اصول کے تحت زندگی بنانے والی، صحیح راستہ دکھانے والی، بھولے بھٹکوں کو ہدایت کے ڈگر پر لگانے والی! مثال کے طور پر دیکھیے۔ شعر وسخن کے عنوان سے ہمدرد کا ایک خاص کالم ملتا ہے۔ جس میں غزلیں قطعات اور رباعیات پیش کی جاتی تھیں۔ وقتی سیاست اور سماجی حالات وواقعات پر نظمیں نظر آتی ہیں۔ جو فارسی زبان میں ہوتی تھیں یا اردو زبان میں۔ اس سلسلے میں قیس شاہجہاں پوری، آرزو لکھنوی، حسرت موہانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کی خوبصورت غزلوں سے ہمدرد کی محفل سجی ہوئی ملتی ہے۔ سیاسی نظموں کے لیے کیفی جریاکوٹی، محمد اسمٰعیل میرٹھی اور علامہ اقبال کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو ہمدرد کے صحافتی پلیٹ فارم سے برصغیر کے مسلمانوں کو چراغ ہدایت دکھا رہے تھے۔ ادبی سلسلے کا ایک کالم ہمیں

افسانہ کے عنوان بھی ملتا ہے۔ اس کالم میں منشی پریم چندر، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر مجیب، سجّاد حیدر یلدرم۔ مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتحپوری جیسے بلند پایہ اور معروف افسانہ نگاروں کی تخلیقات چھپتی تھیں۔ ہمدرد نے طنز و مزاح کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دی۔ جو تجاہل عامیانہ اور حاجی بغلول کے عنوان کے تحت شائع ہوتے تھے۔ جس میں طنزیہ اور ظریفانہ مضامین تحریر کیے جاتے تھے۔ اور عوام و خواص میں خوب خوب پڑھے جاتے تھے۔

دوستو! آپ نے ہمدرد کے خاص خاص موضوعات کے نمونے ملاحظہ کر لیے۔ اس کے موضوع کا اسلوب، دائرہ کار، اس کے دامنِ فکر کی وسعت اور گہرائی و گیرائی دیکھ لی۔ ان تمام موضوعات کو دیکھنے، خبروں، رپورٹوں اور مضامین کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمدرد نے خبروں کو پیش کرنے اور اپنا پیغام پہنچانے کے لیے جو اسلوب اور طرز نگارش اختیار کیا ہے وہ انتہائی سنجیدہ، متین، شریفانہ، عالمانہ، اور مدلل صحافت کا راستہ ہے۔ واقعات کی صحت کا خاص خیال کیا ہے۔ واقعات کو بیان کرنے میں حالات کی عکاسی ہی نہیں کی بلکہ رہنمائی بھی کی ہے۔ اور جو بات صحیح سمجھ میں آگئی اس کو بلا تأمل بیان کر دیا اور صاف صاف لکھ دیا ہے اس بات کا کبھی خیال نہ کیا کہ اس رائے سے لوگ خوش ہوں گے یا ناخوش۔ زعمار ملک و ملّت اس سے متفق ہوں گے یا نا متفق! اپنے پرائے دعا دیں گے یا بدعا! حقیقت یہ ہے کہ ہمدرد سچّائی، ایمان داری، حق گوئی اور بے باکی کا رکن اور نقیب دکھائی دیتا ہے۔ صحافت کی ایک اعلیٰ قسم ہوتی ہے۔ کوالٹی جرنلزم۔ یعنی اعلیٰ پایہ کی صحافت۔ ہمدرد کے اسلوب اور طریقہ اظہار کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلاشبہ کہی جا سکتی ہے کہ اردو صحافت میں سب سے پہلے مولانا محمد علی جوہر ہی نے اس خوبی کو اپنایا ہے۔ اور آنے والے صحافیوں کو ایک صحیح راستہ دکھایا ہے۔

(۲) ہمدرد کی دوسری خوبی جامعیت اور اس کی ہمہ گیری ہے۔ یعنی اس میں ہمارے مسلم سماج کی سیاسی، مذہبی، تعلیمی، ثقافتی، سماجی، سائنسی، اقتصادی شعری و ادبی ہر طرح کی خبریں، رپورٹیں اور مضامین ملتے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کا کوئی بھی مسئلہ ہو، اس پر ہمدرد میں خبریں مل جاتی ہیں، ملّت اسلامیہ کا کوئی بھی حادثہ ہو اس کی مفصل روداد اس اخبار میں نظر آتی ہے۔ ملک

اور بیرون کے کسی بھی مسلمان کو کانٹا چبھا ہو، اس کے درد اور کرب و اضطراب کی آواز اس اخبار میں سننے کو ملتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمدرد بیسویں صدی عیسوی کے اوائل کی اسلامی تاریخ کا ایک مستند خزینہ، دائرۃ المعارف اور ان سائیکلوپیڈیا ہے۔ جس میں ہمارے ملک و ملّت کے خیالات، احساسات، حالات، واقعات، ترقی و تنزلی کی داستانیں۔ اور شعری و ادبی دلچسپیاں محفوظ ہیں۔

(۳) ان تمام خوبیوں سے بڑھ کر سب سے بڑی خوبی ہمدرد میں جو نظر آتی ہے وہ اس کی مذہب پرستی اور احیائے دین کا جذبہ ہے۔ مولانا محمد علی جوہر چونکہ اسلام کے عظیم سپاہی اور مرد مومن تھے۔ مومنانہ صفات اور کردار کے اعلیٰ نمونہ تھے۔ اس لیے ان کے اس عملی کردار کی جھلک ہمدرد کے ہر شمارے، ہر خبر، ہر مضمون، ہر رپورٹ، ہر لفظ اور ہر حرف میں ملتی ہے۔ دینی و مذہبی پہلو جس طرح ان کی عملی زندگی میں پورے طور پر نمایاں اور غالب نظر آتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ پہلو ان کی اُردو صحافت میں بھی نمایاں اور روشن دکھائی دیتا ہے۔ آپ ہمدرد کے تمام موضوعات کو دیکھ جائیے۔ سب سے زیادہ خبریں، سب سے زیادہ مضامین اور رپورٹیں اسلام، مسلمانان ہند، مسلمانان عالم، ان کے واقعات و حالات پر ہی ملیں گے۔ اور جو خبریں دوسرے موضوعات سے متعلق دکھائی دیں گے ان کے پس پردہ اور بالواسطہ مسلمانوں کو ہی سکھانا، مختلف مسائل سے واقف کرانا اور ان کی معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں ہم یہ بات بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں احیائے اسلام اور اسلامی نشأۃ ثانیہ کے سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمارے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ اور تاریخ اسلامی ہند کا روشن باب ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کے معروف سیرت نگار رئیس احمد جعفری نے ہمدرد کی ایک جگہ صحیح عکاسی کی ہے۔ فرماتے ہیں "ہمدرد صرف ایک روزنامہ نہ تھا۔ وہ ایک تحریک تھا۔ وہ ایک پیغام تھا۔ ایک مقصد تھا۔ ایک انقلاب تھا۔ ہمہ گیر اور ہمہ پہلو انقلاب! آج سے پچاس سال پہلے اُردو زبان میں جس طرز صحافت کا آغاز کیا تھا وہ اسی پر ختم ہو گیا ع قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں

مصادر و مراجع

۱ - رئیس الاحرار مولانا محمد علی - سوانح و خدمات - ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری وغیرہ - کراچی

۲ - محمد علی جوہر - حمیدہ ریاض - ناگپور ۱۹۸۸ء

۳ - محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق - مولانا عبد الماجد دریابادیؒ (اعظم گڑھ) ۱۹۶۵ء

۴ - سیرت محمد علی - رئیس احمد جعفری - دہلی

۵ - مولانا محمد علی اور ان کی صحافت - ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری - کراچی ۱۹۸۳ء

۶ - ہمدرد کے شمارے ۱۹۱۳ء - ۱۹۲۹ء

۷ - جوہر نامہ - حکیم محمد عرفان الحسینی - کلکتہ ۱۹۸۷ء

۸ - صحافت پاکستان و ہند میں - ڈاکٹر عبد السلام خورشید - لاہور ۱۹۶۳ء

عبدالرشید ندوی

الہلال میں آزاد کا دعوتی پہلو

مولانا ابوالکلام آزاد کا مشہور و معروف جریدہ الہلال ان کی جودت طبع، بوقلمونی، حمیت دین، قرآن فہمی، جذبۂ دعوت اسلامی، تحقیقی دماغ، ادبی مزاج، تحریکی قوت، وسیع النظری، بلند ہمتی، ملی ہمدردی، خطابی رنگ اور سیاسی بصیرت کا مرقع تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ الہلال میں مولانا آزاد ہیں یا مولانا میں الہلال؟ لیکن یہ کہنا قطعی غلط نہیں کہ مولانا کا الہلال آزاد ہے، اس لیے کہ مولانا پر کوئی فکری دباؤ نہیں، سیاست کا کوئی وار نہیں، گرد و پیش کا کوئی حال نہیں اسی لیے مولانا کو الہلال سے اور الہلال کو مولانا سے جدا نہیں کیا جا سکتا دونوں ایک دوسرے کی شناخت اور تعارف کا ذریعہ بنے، مولانا شمع ہیں تو الہلال پروانہ، الہلال پھول ہے تو مولانا اس کی خوشبو اور اگر مولانا چاندنی ہیں تو ان کا الہلا چاند، کون گل اور کون بلبل دونوں ایک دوسرے کی جان اور پہچان ہیں۔ الہلال کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مردہ دلوں میں جان ڈال دی، سرد لاشوں میں جھرجھری پیدا کر دی جو سو رہے تھے انھیں جگایا اور جو جاگ رہے تھے انھیں چلایا اور جو چل رہے تھے انھیں دوڑایا، مولانا کے معاصرین نے سب بڑے چھوٹے بے اختیار پکار اٹھے، الہلال نے ولولہ اور حوصلہ دیا، ایمان کو تازگی روح کی بالیدگی میں فکر کو روشنی اور یقین کو پختگی عطا کی، اسیر مالٹا مولانا محمود حسن دیوبندی پکار اٹھے، الہلال نے ہمیں بھولا سبق یاد دلا دیا، الہلال کی قدر و منزلت کا اندازہ علامہ اقبال کی اس تگ و دو سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال نے اس کے لیے خریدار مہیا کیے دوسرے جرائد دو تین سو سے آگے نہ بڑھ سکے اور الہلال ہر ہفتہ دس ہزار سے زیادہ شائع ہونے لگا اس کی

مقبولیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ متنوع مضامین لیے ہوتا، جن میں مذہب، سیاست، عمرانیات، معاشیات، تاریخ، ادب اور شعر و نغمہ سب ہوتا، اس کے اسلوب، سلاست، روانی، برجستگی اور بے ساختگی کو دیکھ کر حسرت موہانی کو کہنا پڑا۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا !

الہلال کے اجرائی کے محرکات و اسباب میں سب سے بڑا محرک مولانا کا دوبارہ وکیل امرتسر کی ادارت میں شامل ہونا ہے جب اخبار کے مالک شیخ غلام محمد افکار و خیالات مولانا کے خیالات سے ٹکرانے لگے تو مولانا دل برداشتہ ہو کر امرتسر سے بھوپال چلے آئے، اور ۱۹۰۸ء میں مصر، عراق، شام، ترکی، فرانس کے دوران سفر دیکھا کہ محمد عبدہ و جمال الدین افغانی کے العروۃ الوثقیٰ نے یورپ کے سیاسی حلقوں میں دھوم مچادی اور مصر کے الوقائع المصریۃ نے اصلاح معاشرہ کا بیڑہ اٹھا رکھا تو مولانا نے الہلال جاری کرنے کا تہیہ کر لیا اور مولانا کا یہ خواب ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو الہلال کی اجرائی کی شکل میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ مولانا نے الہلال کا اجرا کسی تجارتی کاروبار یا ذاتی منفعت کے لیے ہرگز نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات اور دعوت اسلام عوام تک پہنچانا چاہتے تھے وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار، ایک دکاندارانہ شغل ہیں جن میں قومی خدمت اور ملّت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں سب اپنی جگہ پر سنبھل سکوں وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے اور میرے تمام کاموں کو ایک دن بلکہ ایک لمحہ کے لیے بھی کامیابی کی لذّت چکھنے نہ دے" (الہلال ۱۳ر جولائی ص۳)

مولانا کا نظریہ تھا کہ اخبار و رسائل قوم کی رہبری اور ان کی خدمت کے لیے ہو وہ اس سلسلے میں عطیات قبول کرنے سے بھی گریز کرتے رہے ان کی سوچ تھی کہ جو اخبار اپنی قیمت کے علاوہ کسی انسان یا جماعت سے کوئی رقم لینا روا رکھتا ہو وہ اخبار نہیں بلکہ اس

فن کے لیے ایک دھبہ اور سرتاسر ننگ و عار ہے وہ اخبار کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سے تعبیر کرتے ہیں اور قلم کار کو حق کی راہ میں ہر طرح کی آزادی اور ہر دباؤ سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ الہلال کے ۲۷ر جولائی ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:۔

"جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی اعانت اور قومی عطیہ اور اس طرح فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نور ایمان کو بیچیں بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر اور قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچہ "کام ایڈیٹر کا" کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔

ایک سر برآوردہ شخص نے الہلال کا پہلا شمارہ دیکھ کر ایک چک روانہ کیا تو مولانا نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بڑی سختی کے ساتھ ۲۷ر جولائی ۱۹۱۲ء کے الہلال کے شذرات میں لکھا:

"ہم خاک نشینانِ بوریائے مذلّت، مسند نشینان عزو جاہ کے بذل و عطا کے مستحق نہیں ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں، صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں، دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں۔"

مولانا کے نزدیک درحقیقت الہلال حق کا اعلان و اظہار تھا، وہ ہندوستان کی آزادی مسلمانوں کی وحدت، خدا کی اطاعت، اسلام کی دعوت، مشرق کی بیداری، غلامی کی بیخ کنی، جہاد کے ولولے، یقین کی دولت، نظم کی طاقت، ایمان کی نصرت، اتحاد کے جلال اور غیر ملکی استعمار کے خلاف ہندوستانی قوم کے اعلان مبارزت کا وثیقہ تھا وہ مسلمانوں کو اللہ کی طرف رجوع ہونے اور اپنے پر پیچ مسائل کا حق تلاش کرنے کی دعوت ایک جگہ اس طرح دیتے ہیں:

"مسلمانوں کے لیے تمام عالم میں صرف ایک ہی ہاتھ ہے جو رہنما ہو سکتا ہے، ایک ہی چشم نگراں ہے جو لغزشوں سے بچا سکتی ہے یہ وہی ہے جو کبھی کوہ سینا پر تجلی حق

بن کر چمکی، کبھی فاران پر ابر رحمت بن کر نمودار ہوئی کبھی غار ثور میں لاتحزن إن اللہ معنا کی صدا تھی، کبھی بدر کے کنارے ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم کے پیغام میں تھی۔ کہیں احد کے دامن میں وکان حقا علینا نصر المؤمنین کی بشارت تھی اور آج ایک لٹے پٹے کارواں ایک برباد شدہ قافلہ اور ایک برہم شدہ انجمن کے لیے امید کا آخری سہارا اور زندگی کی آخری روشنی ہے۔"

(الہلال ۹ راکتوبر ۱۹۱۳ء)

وہ غافل دلوں کو جگاتے ان کے کانوں میں صور اسرافیل پھونکتے اور کسی ناگہانی مصیبت پر ماتم کناں ہونے کے بجائے اللہ سے لو لگانے اور کسی آفت کے آنے کو بما کسبت ایدی الناس کا عنوان دیتے ہیں وہ کہتے ہیں:

"یہ دائم المرض نہیں ہے بلکہ قدرت کی طرف سے تازیانۂ تنبیہ و عبرت ہے مگر افسوس کہ دل کی غفلت شکنی اس سے بھی زیادہ سخت چابکوں کو ڈھونڈتی ہے، خدا کا آفتاب اس کی رحمت کی طرح روز میرے سر پر چمکتا ہے اور اس کے بقریب چاند کی ٹھنڈی روشنی کبھی مجھ سے بخل نہیں اس کا، ابر رحمت جب کبھی برسا ہے تو شاہی محل و ایوان کی طرح میرے صحن خانہ کے پرنالے بھی بہے ہیں، پھر اس کے سوا جو کچھ ہے، اسے خود اپنی محرومی اور بے عملی کیوں نہ سمجھوں وما اصابک من حسنة من اللہ وما اصابک من سیئة فمن نفسک (الہلال شمارہ نمبر ۳ ج ۱)

وہ اللہ کو راضی اور خوش رکھنے کے لیے انسان کو اپنے غرور و کبر پر متنبہ کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"یاد رکھو ہر محبت کے لیے ایک بغض لازمی ہے اور کوئی عاجزی نہیں کر سکتا جب تک مغرور و متکبر نہ ہو، نیکی کو اگر پسند کرو گے تو اس کی خاطر بدی کو برا کہنا ہی پڑے گا اور خدا کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو شیطان کی دشمنی کی پروا مت کرو۔"

(الہلال ۱۱ راگست ۱۹۱۲ء)

مولانا آزاد دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک جان سمجھتے تھے مشرق وسطیٰ کے حوادثات میں جو اس وقت پیش آرہے تھے ایک حادثہ جب تک ایڈریانوپل میں ترکوں کی پسپائی ہوئی تھی اور یہ خبر جب ہندوستان پہنچی تو مولانا کی زبان وعلم سے شعلے برسنے لگے کلکتہ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"اے عزیزانِ ملّت اور بقیہ ماتم زدگان اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں، اگر آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیرو توحید کی لاش تڑپ رہی ہو تو لعنت ہے اس سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو یا اگر مراکش میں ایک حامیٔ وطن بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منھ سے دل وجگر کے ٹکڑے نہیں گرتے، ایران میں اگر گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعت نزع میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی آواز نکل رہی ہے تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظین کلمۂ توحید کے سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہوں تو ہم اللہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہیں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لیے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ اگر میدان جنگ میں کسی ترک کے تلوؤں میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کوئی ہندوستان کا مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل محسوس نہ کرے کیونکہ ملّت اسلامیہ ایک جسم واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہو اس کے اعضاء وجوارح ہیں۔" (الہلال ۶ر نومبر ۱۹۱۲ء ص ۱۷)

مولانا کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ اسلاف عظام نے جو طریقہ حق اختیار کیا اسی پر زندگی کی گاڑی دوڑائی جائے ان کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ اسلام صرف خیالی تصوّر اور چند عبادات وعقائد

کا نام نہیں بلکہ انسانی زندگی کے لیے وہ مکمل ایک قانون اور ضابطہ ہے جو زندگی کے ہر ہر موڑ پر چھوٹی اور بڑی تمام ضرورتوں میں رہنمائی کرتا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"اسلام اپنی توحید کی تعلیم میں نہایت غیور ہے وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں، مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیاوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دست گیری کا محتاج نہیں رہا۔"

(الہلال ۸ر ستمبر ۱۹۱۲ء)

چنانچہ الہلال کی دعوت کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"الہلال کی دعوت کا اصل اصول مسلمانوں کو ان کی زندگی کے ہر عمل اور عقیدے میں اتباع کتاب اللہ و سنت رسول کی طرف بلانا ہے اور ان کی پولیٹکل پالیسی کے لیے بھی وہ اس اصول کو پیش کرتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں میں ان کی گم شدہ قرآنی روح پھر بیدار ہو جائے گی اس دن وہ پھر اپنے اندر ہر چیز کامل و اکمل پائیں گے اگر اصل کام اسلامی تعلیم کا احیاء اور ایک صحیح دعوت کی تحریک ہے تو بدبختی سے مسلمانوں کے پاس آج قرآن کی اصلی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، صدیوں کی تقلید اور استبداد فکری نے سیکڑوں پردے اصل حقیقت پر ڈال دیئے ہیں اور قرآن و سنت کی کوئی شاخ اس فتنۂ تقلید کے مہلک اثر سے محفوظ نہیں۔" (الہلال ۲۲ر ستمبر ۱۹۱۲ء)

دعوت دینیہ اور تعلیمات اسلام کا اثر ہمیں الہلال میں جگہ جگہ نظر آتا ہے انھوں نے مختلف مواقع پر مختلف پیرائے بیان میں اس دعوتِ حق کو پیش کیا، مولانا نے زور دیا کہ جب اتباع دین اور اعتصام بحبل اللہ المتین کی شمعیں خود ان کے یہاں فروزاں ہیں تو ان کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے انھوں نے واضح طور پر لکھا:۔

"قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے ہی کے لیے نازل نہیں ہوا بلکہ وہ انسانوں کے لیے ایک کامل و اکمل قانون فلاح ہے جس سے انسانی زندگی کی کوئی شے باہر نہیں، مسلمانوں کو ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا ان کے لیے کبھی موجب فلاح و فوز نہیں ہو سکتا۔" (الہلال ۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۲ء)

بس یہی نہیں بلکہ انھوں نے نہایت سختی کے ساتھ لکھا کہ:۔

"ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل اور اعتقاد کے لیے بھی قرآن کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم بلکہ مشرک ہے۔" (الہلال ۸ر ستمبر ۱۹۱۲ء)

مولانا نے خالص خطیبانہ جذباتی اتار چڑھاؤ اور مرعوب کن لب و لہجہ میں مسلمانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ بتلایا کہ مسلمانوں کا سارا زوال اور انحطاط صرف اس ایک غفلت کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کو چھوڑ دیا، وہ اس وقت تک ترقی کرتے رہے جب تک قرآن حکیم کی اشاعت اور تبلیغ ان کا قومی عشق رہا ان کی تاریخ میں جو کچھ بھی ہے صرف اس کے لیے ہے، انھوں نے اپنا وطن چھوڑا تو اس کے لیے عزیز و اقربا سے مہجور ہوئے تو اس کی خاطر، مال و دولت لٹایا تو اس کی یاد میں، ان کی تلواریں بے نیام ہوئیں تو اس کو پھیلانے کے لیے اور ان کی گردنوں سے خون بہا تو اسی کے عشق میں کیونکہ ان کی قومی زندگی کی صدا یہ تھی کہ میری عبادت میری قربانی، میرا جینا میرا مرنا جو کچھ ہے بس اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، مولانا نے الہلال کے صفحات میں مسلمانوں کو قرآن پاک اور اسلام کی طرف مراجعت کی دعوت دی تاکہ اس فردوس گم شدہ کی بازیافت ہو سکے جو قرآن سے دور ہو جانے کی بنا پر ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی، ان کے مضامین میں الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، القسطاس المستقیم، الجہاد فی الاسلام، عید الاضحی، موعظہ و ذکری۔ الحج، محرم الحرام اور حقیقۃ الصلوٰۃ وغیرہ پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں انتشار و پراگندگی محض اس لیے پیدا ہوئی کہ انھوں نے تعلیمی، تمدنی اور سیاسی زندگی میں قرآن کریم کی رہبری تلاش نہ کی اس لیے وہ کشور انسانیت کے حصول میں محروم ہو گئے۔

الہلال کے تمام مضامین میں الہلال کا قاری آزاد کا ہمدم و ہمراز نظر آتا ہے وہ دوئی کی حدوں کو توڑتے ہیں، وہ عالمانہ وقار کے ساتھ بے تکلفی کی ہر منزل سے گذرتے ہیں، کبھی سرگوشی کرتے ہیں تو کبھی داغہائے سینہ پر ماتم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی زمانے کی بوالعجبیوں کا مذاق اڑاتے ہیں غبار خاطر اگر مولانا کے اسلوب کی انتہا ہے تو الہلال شاندار دعوت و تبلیغ کا نقطۂ آغاز۔

شاہنواز احمد خاں

اسلامی نشاۃ ثانیہ

نگارش آزاد کے حوالے سے

سورۂ اقرا کی نورانی آیتیں معجزاتِ قلم پر ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ اب تک دنیائے انسانیت نے جتنے انقلابات دیکھے ہیں سب کی پشت پر پہلی چاپ قلم کی سنائی پڑتی ہے قلم کے ابھارے ہوئے نقش قدم پر چل کر قدم نے اپنا حق ادا کیا ہے۔ تقریر و تحریر سے ذہن سازی ہوتی ہے جو چند قدم آگے عمل کے قالب میں ڈھل کر، کسی تحریک کی پہلی اینٹ بن جاتا ہے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی نے، اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں ادب کی خدمات پر جس مبارک بحث کا آغاز کیا ہے اُس کی طبیعت و کیفیت کسی مقیاس الحرارت کی محتاج نہیں۔ ادب ایک مجرد لفظ ہے۔ یہ ہر زمان و مکان میں اپنی تازگی کے جوہر دکھلاتا رہا ہے، سمندر کی گہرائی اور پہاڑوں کی اونچائیاں بھی۔ اس کے سامنے لاف زنی نہیں کرتیں اس کے دست شفقت سے دونوں یکساں محفوظ ہوتے ہیں۔ ادب زبان بھی ہے بیان بھی، فکر بھی ہے تخیل بھی۔ یہ قرطاس و قلم کے بغیر بھی زندہ رہتا ہے۔ اس کی صدا فضاؤں میں رنگ گھولتی ہے یہ جب تحریر کی صداقت میں سماتا ہے تو پیغمبر اسلامؐ کے مکتوب نامے کی شکل میں تاریخ میں محفوظ ہو جاتا ہے اور جب اسے تقریر کے پیکر میں خود کو آشکارا کرنے کا شوق ہوتا ہے تو حضرت جعفر بن ابی طالبؓ بن کر شاہ نجاشی کے دربار میں نمودار ہو جاتا ہے۔ یقیناً ادب پر ایسے بھی دور آئے ہیں جب وہ محتاج فکر ہو کر، برسوں لیل و نہار سے گلہ جو رہا ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیونکر

ہو رہا ہے، اس کے فکر رسا کا مستقل موضوع بن جاتا ہے۔ میں انھیں فکروں کے ساتھ شیخ سرہندی کو، خواجہ باقی باللہ کی خانقاہ میں دیکھتا ہوں۔ وہ فکر کیا تھی کیوں کر تھی؟ وہ تمام مکتوبات ربانیؒ کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہ مکتوبات کئی حیثیتوں کے حامل ہیں۔ ان کی ادبیت بھی مسلّم اور فکر بھی سالم، یہی وہ مکتوبات ہیں جنھوں نے عائدین سلطنت اور اراکین تخت سے ان کی نیندیں چرالیں، اکبر اعظم کے ہندوستان میں بحیثیت مسلمان اُن کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہوگیا۔ آپ ان مکتوبات کو صدائے جرس کہہ لیں یا پیکر اجل بہر حال یہی وہ خطوط ہیں جن میں امام ربانیؒ کی فکر اور شورشِ فکر دونوں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہاں معرفت ادب کے لیے ایک لفظ تخئیل بھی استعمال کیا گیا ہے۔ تحریر و تقریر و فکر کے اعلیٰ نمونے ہمارے سامنے ہیں تخیل کی جولانی طائرانِ صحرا کی طرح ہے۔ یہ بھلا کب قید فرنگ کی محتاج ہو۔ یورپ کی استعماریت اور بلاد مشرق کی اشتراکیت دونوں پشیمان، اس کی بلندی کا نظارہ، اقبال کی طائر لاہوتی، شاہین، مرد مومن، ضرب کلیم، بانگ درا اور ردائے فاطمہ کی صورتوں میں کرنا چاہیئے۔ ان الفاظ کے ساتھ تخئیل کی وابستگی تاریخ سے جواز فراہم کرتی ہے۔ تخیل فکر کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ علامہ سید جمال الدین افغانی کی نظر میں اسلام کا تصور کسی سرحد کی پابند نہیں وہ جانتے ہیں کہ "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" کی عملی صورت ہی اس کرۂ ارض پر نمودار ہو جائے ان کے مبدأ فیض سے جس ادب عالیہ کا ظہور ہوا ہے اس کی ایک ایک دھار سے پان اسلامزم کی آواز سامعہ نواز ہوتی ہے۔ افغانی اور اقبال دونوں کے تخیلات اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لیے سنگ میل سمجھے جا سکتے ہیں۔

مولانا آزاد ایک نابغۂ روزگار ہستی کا نام ہے۔ اپنی تعلیمی منزل کے دوران ہی انھوں نے نظامِ کہن کے خلاف خموش جنگ چھیڑ دی تھی۔ وہ تقلید کے سخت خلاف تھے۔ جو زمانہ عام لوگوں کے لیے لہو لعب اور تلعب و تمسخر کا ہوتا ہے، عین انھیں ایام میں اُن کے فکر کا سانچہ تیار ہوا۔ انھوں نے جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو انھیں بڑی

مایوسی ہوئی۔ ہر گروہ اپنے خول میں بند تھا۔ اسلام کے لیے جس اقدامی کیفیت کی ضرورت تھی وہ مفقود ہو چکی تھی۔ ائمہ مساجد میں، شیوخ خانقاہوں میں اور مدرسین جامعات میں، اپنی تنگ و دو کو محدود کئے بیٹھے تھے۔

مولانا نے اٹھارہ برس کی عمر ہی میں "لسان الصدق" کی اشاعت سے اپنے علم کا لوہا صاحب علم سے منوالیا تھا۔ علماء کی ایک بڑی جماعت جن میں مولانا محمد علی مونگیری، سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے ارباب ہم شامل ہیں مولانا کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۰ء تک مولانا کی شہرت ہندوستان کی سرحدوں کو چھو رہی تھی بلکہ جامعہ ازہر میں بھی ان کے علم و حکمت کی داد دی جانے لگی۔

مولانا کی شخصیت پر سرسید احمد خاں اور سید جمال الدین افغانی کے بڑے اثرات تھے سید جمال الدین افغانی کو وہ پان اسلامزم کا پیک سمجھتے تھے۔

۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء میں الہلال کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ انھیں ایام میں علامہ رشید رضا مصری کا ہندوستانی دورہ ہوا تھا۔ وہ ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے تھے۔ علامہ کی حیثیت سید جمال الدین کے خلف راشد کی تھی۔ مولانا آزاد نے "المصلح العظیم والمرشد الحکیم" کے عنوان سے ایک بہت ہی جامع مضمون لکھا۔ انھوں نے اس مضمون میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر زمانہ حاضر تک کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور وہ تھا جس میں ابوریحان بیرونی ہندستان آیا۔ یہ دور اجنبیت کا دور تھا۔ دوسرا دور وہ ہے جس میں ابن بطوطہ سیاح عالم کی حیثیت سے تغلق آباد میں فروکش ہے۔ اس دور کو مولانا خالص اسلامی دور کہتے ہیں۔ یعنی سلاطین عہد اور اس کے بعد کا دور اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ کا دور تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو دور آیا ہے وہ ذلت و نکبت کا دور ہے۔ زوال اس کے ہر بن مو سے ہویدا ہے۔ وہ خود رقم طراز ہیں۔

"..... پھر آٹھویں صدی کی تاریخ کا ایک صفحہ ہے جس میں مغرب اقصیٰ کا جہانگیر سیاح (ابن بطوطہ) تغلق آباد کی دیواروں کے نیچے سے گزرا اور یہ وہ

زمانہ تھا کہ اسلامی تہذیب و تمدّن اس سرزمین کے چپّے چپّے پر قبضہ کر چکا تھا یا آج ایک تیسرا زمانہ ہے کہ رشید رضا نے ہندوستان کی سیاحت کی مگر بیرونی کی طرح علوم و فنون کی تلاش میں نہیں بلکہ مسلمانوں کا علمی دور اب تاریخ کی خاک میں مدفون ہو چکا ہے اور ابن بطوطہ کی طرح اسلامی جاہ و جلال کے دیکھنے کے لیے بھی نہیں کیونکہ جہاں تغلق آباد کے ابوابہائے عظمت و شوکت تھے وہاں اب زاغ و زغن کا آشیانہ ہے وتلك الايام نداولها بين الناس اب ہندوستان کے عہد اسلامی کے تناظر یہ ہیں کہ (دہلی مرحوم) میں ہماری گذشتہ زندگی کے قبرستان کا ایک شہر آباد ہے۔ سیاحانِ عالم اس میں چل پھر کر خاک کے ڈھیر دیکھ لیں، اور اگر چشم عبرت اور دلِ درد آشنا رکھتے ہوں تو انقلاب عالم کا ایک سبق لے لیں، ایسا مؤثر سبق جو شاید دنیا کی کوئی اور قوم نہیں دے سکتی۔" (الہلال ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء)

محولہ تحریر سے صاف عیاں ہے کہ مولانا آزاد کی آرزو کیا ہے؟ اُن کی آرزو اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہی تو ہے، الہلال اور البلاغ کے تمام شمارے اس کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اُن کی تحریر کے ہر جزو سے اسلامی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ جہاں جہاں انھوں نے جنگ طرابلس، الجزائر، اٹلی اور فرانس کا ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ تمام رپورٹیں ہیں جو انھیں موصول ہوتی ہیں اور ڈاک خبر کے حوالہ سے انھوں نے شائع کیا ہے لیکن اُن کی دیدہ ریزی اس میں بھی اپنے مقصد کی خبر کھوج نکالتی ہے۔ وہ بدر و حنین کے معرکے کی یاد تازہ کر بیٹھتے ہیں۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ مسلمان اگر برطانیہ و فرانس کی سالوسیت کے شکار نہیں ہوتے اور ان کا اتحاد باہمی قائم رہتا تو وہ ممالک یورپ کے ساتھ حیرت انگیز جنگ چھیڑ سکتے تھے۔ جنگ طرابلس کے عنوان سے تحریر کردہ مضمون میں امیر عبدالقادر کے باب میں لکھتے ہیں:-

"یہ امیر عبدالقادر جزائری نامی ایک جاں فروش وطن پرست کا ظہور تھا جس کے

تہوّر و شجاعت، عزم و استقلال، اور فوجی و دینی زندگی کے یکساں اعلیٰ اوصاف نے ایک سال کے اندر تمام یورپ اور ایشیا کو متوجہ کرلیا۔"

اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے جس اینٹ کی ضرورت ہے اس کی نشاندہی محولہ عبارت میں کی گئی ہے۔ بغیر عزم و استقلال، جانفروشی اور تہوّر و شجاعت کے اسلامی نشاۃ ثانیہ کا خواب بارآور نہیں ہوسکتا۔ اسی باب میں وہ آگے رقم طراز ہیں:۔

"لیکن کوئی قوم خواہ کتنی ہی گہری نیند سو رہی ہو اگر آزادی اور حکومت کے خواب کو بھلا نہیں چکی ہے تو ایک ضعیف سی آواز بھی اس کے جگانے کے لیے کافی ہے .... اگر زمین شور نہ ہو تو اس کا بیج بیکار نہیں جاسکتا۔ امیر عبدالقادر کی صدائے رعد آسائے حرّیت نے تمام الجزائر میں یکایک آگ لگا دی، سرداران قبائل چاروں طرف سے آکر جمع ہوتے تھے اور شوق شہادت و فدویّت کی محویت میں آتشیں گولوں سے کھیلتے تھے۔"

یہی وہ تحریریں ہیں جو الہلال کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان تحریروں کی معنویت مسلّم ہے۔ ان میں زمانہ کی صداقت ہے۔ ان کی نافعیت آج بھی مسلّم ہے۔ زمانہ نافع کو باقی رکھتا ہے اور غیر نافع کو زبدہ رابیہ کی طرح مٹا ڈالتا ہے۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ صرف پھولوں سے موانست کا نام نہیں ہے۔ سنگریزے بھی اتنے ہی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ آج سارے کرب و الم کی علّت تن آسانی ہوچکی ہے۔ آخر اسلامی نشاۃ ثانیہ یوں ہی من و سلویٰ بن کر آسمان سے بے ستون سے ٹپک تو نہیں پڑے گی۔

سقوط خلافت مولانا آزاد کے لیے ایک بڑا سانحہ تھا۔ ترکی میں خلافت کے رخصت ہوتے ہی بلاد عربیہ میں شورشوں کا آغاز ہوا۔ براعظم افریقہ کے وہ ممالک جو ترکی کے زیر نگیں تھے محو حیرت ہوا ٹھے، آخر کار پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر، ان تمام ممالک کے حصّے در حصّے کردیئے گئے جو کبھی خلافت عثمانیہ کے ماتحت تھے۔ کاش اسی پر بس کیا گیا ہوتا، نہیں ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بعد ان ممالک کے شہریوں پر لامتناہی ظلم و بربریت کا طوفان توڑا گیا۔ ان ممالک

سے اسلامی قدروں کو محو کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ شعائر اسلام کی منسوخی کا اعلان ہوا۔ اگر آپ البانیہ کے مسلمانوں کی تاریخ پڑھیں تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اُن کے نرم و نازک ہاتھوں سے ان کے ناخن اتار لیے گئے۔

سب سے بڑی سزا خود ترکی کو ملی اسے یورپ کا مرد بیمار کہہ کر مفلوج کر دیا گیا۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی شکل میں جو ابلیست وہاں نمودار ہوئی اس نے مذہب بیزاری سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ وہاں بھی بالکل وہی روایتیں دہرائی گئیں جو روس کے مختلف اکائیوں میں ۱۹۱۷ء سے جاری تھیں۔ مذہب کا نام لینا تک گناہ ٹھہرا۔ مذہب اور افیون کو ایک ہی صف میں رکھا نتیجہ یہ ہوا کہ عجمی مسلمانوں کا ایک جری طبقہ تقدیر سے برسوں گلہ جو رہا۔ اسے جبری احکام کی اطاعت میں وہ تمام امور بے جا انجام دینے پڑے جو اسلامی قدروں کے منافی تھے۔

مولانا آزاد نے الہلال اور البلاغ کے صفحات پر پہلی جنگ عظیم کے بیشتر منظر نامے پیش کیے۔ ان کا یقین تھا کہ مسلمانان عالم کے معاملے میں برطانیہ عظمیٰ کی حیثیت فریق متحارب کی ہو چکی ہے۔ برطانیہ عظمیٰ اور اس کے حلیف ملکوں کی اس خواہش ناپاک کو مولانا نے ہی چاک کیا۔ جس کی پہلی قسط مسلمانان عالم کی تذلیل و تحقیر سے شروع ہوئی تھی۔ مسجد کانپور کے واقعہ کو اسی سیلاب رواں کا ایک قطرہ شمار کیجیے۔

الغرض الہلال و البلاغ کی اشاعت نے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پھونک ڈالی اور وہ جہاں تھے وہیں سے چلنے پر از بس آمادہ ہوتے۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ علما ملک کی قیادت کو آگے آئیں۔ انھوں نے برادرانِ وطن کو کبھی حریف ملت نہیں سمجھا۔ وہ ان کے ساتھ اسلامی رواداری کے اصول پر تعلقات بحال رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب ۲ر دسمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں انھوں نے "حزب اللہ" سوسائٹی کا اعلان کیا تو اسی کے ساتھ "حزب الشیاطین" کی بھی تشریح فرمادی۔ انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی رو سے اس ارضِ مقدس پر دو ہی جماعتوں کا ظہور ممکن ہے۔ ایک حزب اللہ جو نمائندہ حق ہے اور دوسری حزب الشیاطین جو باطل کی غماز ہے۔ مسلمانوں کے خلاف جن جماعتوں نے تلوار اٹھائی، یا جنھوں نے شعائر اسلام کو

علی الاعلان رسوا کیا، مولانا اُسے حزب الشیاطین کی صف مذموم میں جگہ دیتے ہیں۔

"حزب اللہ" کا اعلان ہوتے ہی لاکھوں سرفروشانِ اسلام اس کی طرف جھک پڑے۔ پورے ہندستان میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ حزب اللہ کا داعی ہونا موت پر بیعت کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن وہ معاملہ ہی ایسا تھا، وہ پکار ہی ایسی تھی کہ موت آسان اور زندگی مہنگی نظر آنے لگی تھی۔ حزب اللہ کے شیدائیوں کے لیے مولانا نے کلکتہ ہی میں شیالوں سے تھوڑی دور ایک مسجد کا نقشہ تیار کیا اور اُس میں دارُالارشاد کی بنیاد رکھی۔ دارُالارشاد ایک تربیت گاہ تھی۔ دارالارشاد کے تربیت یافتہ مبلغین پورے ملک میں پھیل گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو مولانا کے نظریاتِ ملّی سے پوری طرح آگاہ تھے۔ بھلا اسلامی نشاۃ ثانیہ کی عملی اور اقدامی کیفیت کا انگریز حکام کب تک بے صبری سے معائنہ کر سکتے تھے۔ مالک رام "تذکرہ" کے پیش لفظ میں کہتے ہیں کہ "پانیر" نے انگریزوں کی توجہ کو اس طرف مبذول کیا۔ اگر "پانیر" والے انگریزوں کی خوشامد میں ایسا نہ بھی کرتے تو سورج کی حدّت بھلا کب تک چھپتی۔ الہلال پر ضمانت طلب ہوئی اور اسے بند کر دیا گیا۔ پھر ایک سال کی خموشی کے بعد نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ "البلاغ" جاری ہوا۔ لیکن اس کے مقدر میں بھی انگریزوں کا جابرانہ صدمہ برداشت کرنا تھا چنانچہ مولانا آزاد کے خروج بنگال کے بعد ہی فوراً یہ بند ہو گیا۔

فضل الدین احمد محرک "تذکرہ" مقدمہ میں صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں۔ سب سے یادگار اور تعجب انگیز اثر اس نے دو جماعتوں پر ڈالا۔ اور یہی دونوں جماعتیں تمام قوم کے لیے بمنزلہ اصل و بنیاد کے ہیں یعنی علماء و مشائخ کا گروہ اور انگریزی تعلیم یافتہ جماعت اگر ہلال شائع ہو کر اور کوئی کام نہیں کرتا صرف ایک عالمِ ایک پیر ایک بااثر جدید تعلیم یافتہ شخص کو اس رنگ میں رنگ دیتا جس میں اس نے تمام قوم کو رنگ دیا ہے تو صرف یہی کارنامہ اس کی انقلابی قوت کے اعتراف کے لیے کافی تھا۔

ذرا آگے بادۂ کہن کی تاثیر ملاحظہ فرمائیے۔

علماء و مشائخ کا گروہ جو اپنے مدرسوں اور حجروں سے کبھی جھانک کر بھی دنیا کی حالت پر

نظر نہیں ڈالتا تھا "الہلال" نے ان کو یکایک نکال کر جد و جہد کے میدان میں کھڑا کر دیا اور ان میں سے ہر شخص نے محسوس کر لیا کہ ہم اپنی اصلی غرض کو آج تک بھولے ہوئے تھے۔ تعلیم یافتہ جماعت کا یہ حال ہوا کہ یا تو یہ گروہ مذہب کے نام سے متوحش تھا یا اب ہزاروں سر خدا کے آگے جھک گئے اور بعض کا تو یہ حال ہوا کہ بڑے بڑے عابدوں زاہدوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ پورے ملک بلکہ بلاد اسلامیہ کو حرارت دینی نصیب فرما کر، مولانا آزاد چھوٹا ناگپور کے ایک گمنام گوشے (رانچی) میں منتقل کر دیئے گئے اپریل ۱۶ء کے پہلے ہفتے میں ان کا ورود ہوا۔ حزب اللہ کے شیدائی۔ جامعۃ الارشاد کے طالبین۔ اس کے علاوہ علماء کی ایک بڑی جماعت، ان کی مصیبتوں کو برداشت کر کے یہاں پہنچنے لگی۔ رانچی کی خوش فضا میں ایک تموج روحانی و دینی نمودار ہوا۔ مسلمانوں کی اکثریت دین سے غافل تھی۔ دین کے معنی رسم و رواج کی پابندی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔ چنانچہ "تذکرہ" کی تصنیف سے فارغ ہوتے ہی اپنے ارادے کو ان الفاظ میں مقید کر دیا۔

اگر حالات طولِ قیام کا باعث ہوئے تو یہاں بھی اپنا کام شروع کر دینا چاہیئے دنیا نے فروغ و آزادی ہی کے زمانے کے کاموں کا کچھ نہ کچھ نمونہ دیکھ لیا ہے بہتر ہے کہ جلاوطنی اور نظر بندی کے قید و بند میں کام کرنے کا بھی ایک نمونہ دکھلایا جائے کہ اصلی آزمائش گاہ عمل یہی ہے۔"

یہ آزمائش گاہ عمل مولانا آزاد کے عزائم عظیم ہیں جن کی طرف الہلال کے پہلے ہی شمارہ میں عام قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔

الہلال کی اشاعت ہمارے قدیمی ارادوں کے سفر کا آغاز ہے اور فضل الٰہی سے امید ہے کہ اب بہت جلد اپنے ارادے اعمال مہمہ میں تبدیل ہو سکیں گے . . . . پس یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے چند عزائم عظیم ہیں جن کی طرف بتدریج متوجہ ہونا ہے۔"

یہی عزائم عظیم اور اعمال مہمہ رانچی پہنچ کر، انجمن اسلامیہ، اور مدارس اسلامیہ کی شکل میں ظاہر ہوئے، یہ اپنے فیوض و برکات کے اعتبار سے حزب اللہ اور جامعۃ الارشاد کی

متبدل صورتیں تھیں جیساکہ مولانا آزاد کا قیام رانچی احوال و آثار کا مؤلف صفحہ ۱۴ میں پیش لفظ کے اختتام پر کہتا ہے۔

دارالارشاد اور مدرسہ اسلامیہ بالترتیب حزب اللہ سوسائٹی اور انجمن اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کے صیغے تھے۔"

میں نے اپنے ایک مضمون "رانچی کی اولیت" مطبوعہ قومی تنظیم مورخہ ۲۶ اگست ۹۷ء میں لکھا ہے۔

"تذکرہ جیسی نادر روزگار کتاب رانچی ہی سے لکھی گئی۔ یہ کتاب نہیں ایک غم نامہ ہے اس میں علمائے حریت کی داستانِ ایمان افروز ہے اس میں علمائے حق کی گرج ہے، فقیروں کی آہ بے نوا ہے، قصر سلطنت کے ملبے کے سنگریزے ہیں، ہر دور میں شعاع ربانی کو جن نفوس قدسیہ نے جلائے رکھا ہے۔ ان کی داستانِ پرغم تذکرہ کی تحریروں میں عیاں ہے امام احمد بن حنبلؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ پر خصوصی کلام کیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر دونوں ہستیاں دو فلک نما سلطنتوں کے عروج و زوال کی زندہ یادیں ہیں۔ خلیفہ معتصم اور اکبر اعظم اپنی سلطنتوں کے دبدبوں کے باوجود ایک خداترس انسان کی پھونک سے خس و خاشاک کی طرح اُڑ گئے اور ان کے تمام شاہانہ تماشے ایک عالم حق کو جادۂ مستقیم سے ایک لمحہ کے لیے بھی ٹس سے مس نہ کر سکے۔"

رانچی ہی میں امارت شرعیہ کل ہند کا نقشہ استوار کیا گیا مولانا کی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے عائلی اور مذہبی معاملات کو امارت کا پابند کر دیا جائے۔ یہی وہ خواب تھا جو آگے چل کر امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کی شکل میں نمودار ہوا جس کی افتتاحی صدارت خود مولانا آزاد نے ۱۹۲۰ء میں فرمائی۔"

یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی چند نگارشات بشمول تذکرہ کا ایک سرسری مطالعہ ہے۔ ان نگارشات کی روح بلکہ اس کا کالبد اسلامی نشأۃ ثانیہ کے خمیر ہی سے تیار کیا گیا ہے۔ اسلامی نشأۃ ثانیہ کی روح کو سمجھنے میں بطور علامت حزب اللہ، جامعۃ الارشاد، انجمن اسلامیہ

مدرسہ اسلامیہ، خلافت اور ترک موالات سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ مولانا آزاد اسلامی نشأۃ ثانیہ ہند کو واسطہ بنا کر، اسلامی نشأۃ ثانیہ عالم کا خواب دیکھ رہے تھے۔ آج رابطہ ادب اسلامی کی کوششوں سے، ادب اسلامی کے جس ماخذ و مصدر کی ہمیں تلاش ہے، اس کا بڑا ذخیرہ مولانا آزاد کی نگارشات میں ہر صاحب بینش کے لیے موجود ہے۔

مولانا آزاد کی تحریر، تقریر، خطابت، فکر، تخیل سب اسی خواب کی تعبیریں ہیں اور وہ خواب ہے اسلامی نشأۃ ثانیہ میں ادب عالیہ کے نمونے۔

افتخار احمد ندوی

اسلامی بیداری میں

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا حصّہ

"سچ" کے حوالے سے

زیر نظر مضمون اصلاً تلخیص ہے جناب شافع قدوائی صاحب کے ایک طویل مضمون کی جس کا عنوان ہے: "مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی "سچی باتیں" ایک تجزیاتی مطالعہ"، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۲۵ء میں "سچ" کے نام سے ایک ہفت روزہ جریدہ جاری کیا تھا، جس کے صفحۂ اوّل پر ان کا اداریہ نما کالم "سچی باتیں" شائع ہوتا تھا، اس کالم کو مولانا نے بنیادی طور پر معاشرتی اصلاح اور اخلاق کی درستی کے لیے وقف کر رکھا تھا، اور "سچی باتیں" مولانا کے مخصوص نصب العین یعنی اخلاقی قدروں کی بازآفرینی کی مظہر اور مذہب کی سربلندی اور احیاء کے جذبہ کی آئینہ دار ہوتی تھیں جناب شافع قدوائی صاحب نے انھیں سچی باتوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ اپنے مضمون میں پیش کیا تھا۔

شافع صاحب چونکہ مولانا دریابادی سے خاندانی قرابت رکھتے ہیں اور ان کے حقیقی نواسے ہیں اس طرح مولانا مرحوم کے علمی وادبی ورثہ سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کا مضمون بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے اپنے مضمون کے لیے اس کی تلخیص کو مرجع بنانے کی جسارت کی گئی ہے، البتہ اس میں تلخیص کے ساتھ ساتھ کچھ اضافے بھی کیے گئے ہیں، خاص طور سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی تحریروں اور پرانے چراغ کے اقتباسات کا اضافہ جس سے اس کی حیثیت ایک مستقل مضمون کی ہوگئی ہے۔

اسلام ایک آفاقی مذہب ہے، یہ ایک مکمّل نظام زندگی اور کامل دستورِ حیات ہے اور اس کی کچھ مخصوص اخلاقی قدریں اور رہنما اصول ہیں، جن سے اعراض اور تغافل کسی طرح درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر جب اور جہاں بھی ان اخلاقی قدروں پر عمل درآمد کے سلسلہ میں کوتاہی ہوئی، اور ان اصول وضوابط اور احکام وشرائع کو پس پشت ڈالا گیا جو اسلام نے اپنے ماننے والوں پر نافذ کیے ہیں اور جن پر عمل کرنا ضروری قرار دیا ہے اور جن کے ترک سے اسلام کا روشن چہرہ داغدار اور دھندلا ہو جاتا ہے، اور اس پر ایک طرح کی نیند طاری ہو جاتی ہے تو علما اور مذہبی قائدین نے مسلمانوں کے اندر اسلامی بیداری لانے اور انھیں اسلام پر عمل پیرا بنانے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کر دی ہیں، مقررین نے اپنی تقریروں کے ذریعہ، مصنّفین نے اپنی تالیفات اور کتابوں کے ذریعہ، ادبا اور اہلِ قلم نے اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ کام انجام دیا ہے اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم ایک صاحب طرز انشا پرداز، بے مثال ادیب اور ایک کہنہ مشق صحافی تھے، انھوں نے صرف بارہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۰۴ء میں ایک مذہبی عنوان پر مضمون لکھ کر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا، اور پھر ۱۹۲۵ء میں ایک ہفتہ وار "سچ" نکال کر اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ اور اس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کے اندر اسلامی بیداری کی روح پھونکنے کا جو عظیم الشان کام لیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ مولانا کے نزدیک مذہب میں جملہ مسائل کا حل موجود ہے، اور اس سے روگردانی کوتاہ نظری کے سوا کچھ نہیں، نصف صدی کو محیط مولانا کی صحافتی زندگی کا بنیادی (concern) روحانی اور اخلاقی اقدار ہیں، ان کی جملہ تحریریں اسی ایک نقطۂ نظر کی توضیح وتشریح سے عبارت ہیں۔ مولانا نے "سچ" کے بعد "صدق" اور پھر "صدقِ جدید" نکالا۔ لیکن ان کی تحریروں کا مرکزی حوالہ وہی رہا، وہ اپنے جریدے "صدق جدید" کو سیاسی اخبار کی صف میں شامل کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، صدق جدید کے موقف کے بارے میں خود ہی رقمطراز ہیں:۔

"صدق جدید سیاسی پرچہ تو کسی معنی میں ہے ہی نہیں، اصلاً ایک دینی اصلاحی اور اخلاقی

صحیفہ ہے، اس کی اصل دعوت دینی و اصلاحی دعوت ہے، پھر اس کا ایک مخصوص علمی و ادبی معیار ہے، اور اس کا خاصہ حصّہ کتابوں کے نقد و نظر کے لیے وقف رہتا ہے، اس کے بعد اگر کچھ جگہ بچتی ہے تو وہ سیاسی رائے زنی بھی کر دیتا ہے، وہ بھی صرف اپنے ملک سے متعلق جس سے وہ سیاسی، آئینی، قانونی، جغرافیائی طور پر وابستہ ہے، کسی دوسرے ملک کی سیاست سے چاہے وہ چین و روس ہو، یا عرب و پاکستان ہو اسے نفیاً اور اثباتاً اتنا بھی واسطہ نہیں ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ کسی ملک پر سیاسی رائے زنی صرف اسی ملک والوں کا حق ہے، اخلاقیات اور ایمانیات کا معاملہ دوسرا ہے، اس میدان میں آکر صدق کا تعلق ساری دنیا سے قائم ہو جاتا ہے، وہ فسق والحاد پر نکتہ چینی اپنی بساط کے موافق دنیا بھر پر کیا کرتا ہے۔"

ادبی موضوعات ہوں یا روزمرہ کے واقعات، مولانا دریابادیؒ ہر واقعہ سے عبرت اور سبق آموزی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے تھے، اور اپنے اخبار میں اور خاص طور پر "سچی باتیں" کے کالم میں اسی پہلو کی معنویت کو آشکار کرتے تھے، بالخصوص مغربی تہذیب کی حقارت، بے وقعتی اور اس کے مقابلہ میں اسلام اور اسلامی تہذیب کی حقانیت و ابدیت اور عظمت و اہمیت کو اجاگر کرنا اپنا شیوہ بنا لیا تھا، اس لحاظ سے مولانا کی تمام تحریریں اسالیب بیان کے تنوع اور موضوعات کی رنگا رنگی کے باوجود مواد کی سطح پر باہم متحد اور مربوط نظر آتی ہیں، انھوں نے سچّی باتوں کے حوالے سے کائناتی تعینات میں مستور ایک مرکزی حقیقت کی عقدہ کشائی کو اپنا محور و مرکز بنا لیا تھا۔ مفکّرِ اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم پُرانے چراغ میں فرماتے ہیں:

"سچ" کے مطالعہ نے دو بڑے کام کیے، ایک مغربی تہذیب کی جس کو مولانا یاجوج تمدّن اور دجالی فتنہ سے تعبیر کرتے تھے، حقارت اور بے وقعتی اور اس کے ثبوت میں دلائل و واقعات کی فراہمی جو مولانا برطانیہ سے نکلنے والے انگریزی پرچوں سے براہ راست مہیا فرماتے تھے۔ دوسرے لسان العصر میر اکبر حسین الہ آبادی کی شاعری، اور ان کے حکیمانہ خیالات سے گہری واقفیت اور قلبی مناسبت، اکبر کے کلام سے مخصوص خاندانی ماحول اور ہم خیالی کی بنا پر مناسبت تو شروع سے ہی تھی، لیکن "سچ" نے ان کو عقیدت و محبّت کے درجہ تک پہونچا دیا۔ "سچ" کا کوئی پرچہ

مشکل سے ان دونوں باتوں سے خالی ہوتا تھا، مولانا انگلستان، و ہندوستان سے نکلنے والے پرچوں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے حقائق، اعداد و شمار، تہذیب مغربی کی ناکامی، اس کی انسانیت کشی، اور انسان دشمنی کی مثالیں پیش کرتے رہتے تھے کہ آنکھیں کھل جاتیں اور خون کھول اٹھتا، دوسری طرف حضرت اکبر کے حکیمانہ اشعار کو اپنی دلپذیر تمہید و تشریح کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ جن باتوں کے لیے کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، چٹکلوں میں ادا ہو جاتیں، اس طرح "سچ" اس ذہن و شعور کی تشکیل میں بیش قیمت مدد کرتا رہا جس کا اپنی بعد کی اردو عربی تصنیفات ہندوستان اور ہندوستان کے باہر دعوتی کاموں میں بنیادی حصہ رہا، یہ وہ احسان ہے جس کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔"

مولانا نے سچی باتوں کے ذریعہ لوگوں کو دعوتِ فکر دی، اور اعلیٰ روحانی مذہبی اور اخلاقی اقدار جو رفتہ رفتہ قصۂ پارینہ بنتی جا رہی تھیں، روزمرہ کے سماجی مسائل، فحاشی، بے راہ روی، اور تعلیمی نظام کے مسائل پر مولانا نے تفصیلی اظہار خیال کیا، مولانا دریابادی کو فنا اور عبرت کے موضوع سے خاص مناسبت تھی، اور وہ بعض خبروں، واقعات، حکایات اور قصوں کے حوالے سے دنیا کی ناپائیداری کے نقش کو اور گہرا کرتے اور یہ باور کراتے کہ یہ حیات چند روزہ، وقتی اور لمحاتی ہے، اور اسے آنے والی زندگی کا ایک پڑاؤ سمجھنا چاہیئے، اس سلسلے کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"شہر کے کسی کباڑیئے کی دکان پر آپ کا گذر ہوا ہوگا، ضرورتاً نہ سہی تفریحاً، یا سر رہگذر پڑ جانے کی حیثیت سے، نخاس لکھنؤ کا سارا بازار ہی گویا عظیم الشان کباڑ یا گھر کا نام ہے، پھر آپ ایسی جگہ میں کیا پاتے ہیں، ایک عظیم الشان ڈھیر، ایک انبار عظیم، بے کار، بے مصرف ردی، اور ناقابل استعمال چیزوں کا، ٹوٹے ہوئے گلاس کی چمنیاں، چٹخی ہوئی چائے دانیاں، ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، دیمک کھائے بوئے کوچ و صوفے، بدقلعی لوٹے، زنگ کھائے ہوئے برتن، پھٹے ہوئے پاجامے، پچے ہوئے کوٹ، بوسیدہ گھڑیاں، بے مرمت سائیکلیں، پرزہ ٹوٹے ہوئے بدرنگ موٹر، غرض ساری دنیا کا ملبہ یا کوڑا کرکٹ جمع، مگر یہ کوڑے کرکٹ کا انبار ہے کیا، سب کی سب ایسی چیزیں جو ابھی کل تک آپ کو کس قدر عزیز تھیں، وہی سامان جسے آپ نے کس شوق سے کس تلاش و محنت سے، کتنا روپیہ خرچ کر کے

جمع کیا تھا، وہی سازوسان جس کے پیچھے آپ دیوانہ ہوئے جارہے تھے، کیا دنیا کی سب سے بڑی چمکیلی چیزوں کی حیثیت کل اتنی ہی ہے، دنیا کی بڑی سے بڑی رغبت بھی کچھ دن کے بعد، کچھ وقت گذر جانے کے بعد، کہنہ و فرسودہ، ہوکر آخر بے رغبتی میں تبدیل ہوکر رہتی ہے۔"

مولانا کا خیال تھا کہ عہد حاضر کے تمام مسائل خواہ وہ معاشرتی لوٹ کھسوٹ کی شکل میں ظاہر ہوں، یا اخلاقی کمزوریوں کے روپ میں یا طلبہ کی شورش کی صورت میں، اصلاً آخرت فراموشی کا نتیجہ ہیں مغرب سے درآمد شدہ تعلیمی نظام اور معاشرتی اقدار نے لوگوں کو اس طرف سے بالکل بے بہرہ کردیا ہے، روحانی اور اخلاقی اقدار پر عدم اطمینان معاشرتی بگاڑ کی صورت میں ظاہر ہوا، ایک جگہ فرماتے ہیں "یہ ہڑبونگ اور ہمہ وقتی دھوکہ دھڑی، چھین جھپٹ، لوٹ کھسوٹ، نتیجہ ہیں اس تعلیم کا اور اس نظام و تمدن کا جس میں مطالبہ حقوق ہی سب کچھ ہے اور ادائے فرض کچھ نہیں، جس میں یہی موجودہ مادی، ناسوتی زندگی سب کچھ ہے اور اس کے بعد کی کسی پائدار پاداشی اور اخروی زندگی کا کوئی تخیل ہی سرے سے موجود نہیں، یورپ نے ڈسپلن، سوشل ڈیوٹی کے نام سے پھر بھی کچھ بیت تراش رکھے ہیں جو فی الجملہ کام دے جاتے ہیں، اور اجتماعی زندگی کے شیرازہ کو بالکل پراگندہ ہوجانے سے کسی حد تک روکے ہوئے ہیں، یہاں خیر سے اس قسم کا کوئی لولا لنگڑا سہارا موجود نہیں ہے اس لیے قدرتاً ایک انارکی (بدحکومتی) ہی برپا ہے، اور بندے بندوں کے ہاتھوں زندگی سے عاجز ہو رہے ہیں، اخلاقی قدروں کی حکومت جب تک سرے سے قائم نہ ہوگی، نفس بشری کو قابو میں رکھنے کی کوئی دوسری مستقل صورت نہیں، اور اخلاقی حکومت جب ہی ممکن ہے جب دلوں میں خوف خدا اور اندیشۂ آخرت کی روح پیدا ہوجائے۔"

اب اس مضمون کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کے ایک اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے، جو حضرت مولانا نے مولانا دریابادی کے متعلق پرانے چراغ میں لکھا ہے، اور بہت صحیح لکھا ہے، مولانا کی پوری زندگی اس کی گواہ ہے، حضرت مولانا مدظلہٗ فرماتے ہیں "مولانا کی خصوصیات و کمالات میں سب سے بڑا جوہر ان کی اسلامی حمیت تھی، ذات نبوی اسلام، شریعت اسلامی کے لیے کوئی توہین آمیز مضمون، رسالہ یا کتاب، یا فلم یورپ و ایشیا میں کہیں نکلتی یا کوئی

گستاخ و بے ادب کوئی تصویر شائع کر دیتا تو سب سے پہلے مولانا "صدق" میں اس کا نوٹس لیتے، اس وقت ان کا خامۂ گوہر بار شمشیر جوہر دار بن جاتا وہ اس کا سلسلہ جاری رکھتے یہاں تک کہ خود ناشر کی طرف سے معذرت یا تلافی کی کوشش ہوتی، یا اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں عمومی احتجاج ہوتا، اس بارے میں ان کی عقابی نگاہ سے کم کوئی چیز پوشیدہ رہ پاتی، اسی دینی حمیت نے ان کو انکار حدیث کے فتنہ کے موقع پر نیاز فتحپوری، اور خدا و رسول اور مذہب کے خلاف دریدہ دہنی سے بے تاب ہو کر جوش بلیغ آبادی اور یگانہ چنگیزی کے مقابلہ میں صف آرا کر دیا، اور انھوں نے صدق جدید کو عرصہ تک ان کی تردید اور ان کے خلاف مضامین کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا، اور چونکہ وہ رسمی و اصلاحی طور سے کسی مدرسہ کے عالم و مدرس نہ تھے بلکہ اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ صاحب طرز ادیب و انشا پرداز، فلسفہ و نفسیات کے فاضل اور مغرب اور اہل مغرب سے مذہب کا مذاق اڑانے والوں سے زیادہ واقف تھے، اس لیے ان کی تحریروں کو "ملائے مذہبی" کا طعنہ دے کر یا "شعر من بمدرسہ کے برد" کا فقرہ چست کر کے ٹالا نہیں جا سکتا تھا، اس بارے میں مولانا کی ذکاوت حس اتنی تیز تھی کہ کسی شاعر کے کلام یا کسی ادیب کے مضمون میں مذہب و شریعت کی توہین، یا طنز و استہزار کا کوئی جملہ دیکھ لیتے تو فوراً اس کا نوٹس لیتے اور اس پر متنبہ فرماتے، مولانا کی مغفرت و مقبولیت کے لیے شاید یہی دینی حمیت کافی ہو جائے، جو ہزار عبادت و تسبیح سے زیادہ خدا کے یہاں وزن رکھتی ہے"

سطور بالا سے یہ بات نمایاں طور پر ظاہر ہوئی کہ اسلامی بیداری میں مولانا دریابادی کا کتنا حصہ رہا ہے، اور انھوں نے اپنے اخبار "سچ"، "صدق" اور "صدق جدید" سے اس سلسلہ میں کتنا کام لیا ہے۔ بعد کا کوئی مؤرخ مولانا کے اس عظیم کارنامہ سے صرف نظر نہیں کر سکتا ہے۔

محمد صدر الحسن ندوی

علامہ اقبال اور اسلامی نشاۃ ثانیہ

اقبال اسلام کا ترجمان اور اُمّت مسلمہ کا نقیب ہے اور اس کی شاعری میں نہاں افکار کا سرچشمہ قرآن کریم اور حدیث نبوی ہے، اس کے قلب و نظر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو فکر و آگہی کی خوشبو سے معطر اور ایقان و اذعان کی روشنی سے منوّر نہ ہو۔ اقبال کی بلند پروازی، جاں سوزی، بلند نگہی اور دل نوازی فیضان ہے عشق رسولؐ اور اسلام کی ابدیت و حقانیت پر یقین کامل کا۔ وہ اسلام کی سربلندی کے لیے گھلتا رہا یہاں تک کہ ہم سے جدا ہو گیا اور اب اس کا کلام اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے اس کی علمی فکری اور چشم کشا کاوشوں پر شاہد عدل ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی نے اقبال، کلام اقبال اور فکر اقبال سے اپنی دل چسپی کے جو اسباب بیان کیے ہیں ان میں اقبال کی شاعری کے محرکات، پس منظر اور مقاصد اس طرح واضح طور پر آگئے ہیں کہ وہ اقبال کے فکر و فن کے متلاشی کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا رقمطراز ہیں:

"سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی محبت اور ایمان ہے جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس و آفاق کے لیے اُبھارتا ہے جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور

کو بیدار کرتا ہے جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت وابدیت پر ایمان لاتا ہے، میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لیے ہیں کہ وہ بلند نظری محبت اور ایمان کے شاعر ہیں ایک عقیدہ دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں۔ وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لیے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت واسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔

(نقوش اقبال ص ۳۴)

اقبال نے وہ زمانہ پایا جب پورا عالم اسلام علمی فکری اور سیاسی طور پر اضمحلال کا شکار تھا مغربی تہذیب کی یلغار کے نتیجہ میں پوری امت مسلمہ کے بن موسے انتشار و پژمردگی آشکارا تھی اسلام کی عظمت وآفاقیت، اس کی ابدیت اور عشق رسولؐ کی جگہ فرنگی تہذیب کی جاذبیت، خود پسند قومیت اور جانبدارانہ وطنیت لے رہی تھی، ہر طرف مرعوبیت کا دور دورہ تھا، اسلام اور شعائر اسلام کی عظمت اور اس پر عمل پیرا ہونا رجعت پسندی کی علامت بن چکی تھی اور ہر درد کا درماں تجدید اور مغربی تہذیب کی تقلید ہی کو سمجھا بھی جا رہا تھا اور باور بھی کرایا جا رہا تھا، ان حالات میں اقبال امت مسلمہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ

مغربی تہذیب نے نوجوانوں کو عشق کوش، آرام طلب، تن آسان اور بے ذوق بلکہ بدذوق بنا دیا ہے۔ نوجوانوں کی اس حالت زار پر اقبال خون کے آنسو روتے ہیں۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل

نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

اقبال کی نگاہ میں نوجوانوں میں ذہنی انحطاط، فکری ژولیدگی، علمی پستی، عملی بے راہ روی اور روشن ضمیری کے بجائے کور نگاہی کا اصل سبب مغربی تہذیب اور عصری نظام تعلیم ہے۔

عصر حاضر ملک الموت ہے ترا جس نے قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

عصری نظام تعلیم کے اثرات سے نوجوانوں میں پُرکاری و سخن سازی تو آئی لیکن نمناکی رخصت ہو گئی۔

جو آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

وہ جدید نظام تعلیم کے مراکز کو مقتل قرار دیتے ہیں، جہاں نہ اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے اور نہ تربیت کی طرف کوئی توجہ ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الّا اللہ

اقبال دانش گاہوں کی کوتاہ دستی و کور چشمی اور خانقاہوں کی کم طلبی و بے توفیقی کا شکوہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبّت نہ معرفت نہ نگاہ

جلوتیان مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو

جب وہ دیکھتے ہیں کہ مغربی فلسفہ کے نتیجہ میں نوجوانوں کے عقائد متزلزل ہو رہے ہیں

اور ان کے دلوں میں اسلام کی شمع فروزاں بجھتی جارہی ہے تو وہ تڑپ اٹھتے ہیں اور ان کے دل کی بے کلی ان الفاظ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا ! زناری بر گساں نہ ہوتا
انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہائے بے صوت ہیں ذوق و عمل کے واسطے موت
دین مسلک زندگی کی تقویم ایں سر محمد و براہیم

اقبال امت مسلمہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ مغربی تہذیب لب گور ہے۔ خدائے لم یزل کے دست قدرت کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس بے روح تہذیب کو اپنے ہاتھ سے تھامے، تیری فطرت تو ممکنات زندگانی میں ہے اور اقوام زمین ایشیا کا تو پاسبان ہے۔ دنیا کی امارت کا مستحق تو ہے پھر تقلید تہذیب فرنگ چہ معنی دارد۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشت ملت بیضا سے ہے پیدا کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبال کو یہ احساس ہے کہ پے در پے مصائب و آلام کے نتیجہ میں امت مسلمہ میں بیداری آئی ہے اور اس میں خود احتسابی، خود نگری، خود گری پیدا ہوئی ہے اور اضمحلال و پژمردگی کے دبیز پردے آہستہ آہستہ سرک رہے ہیں، مغربی تہذیب کی فسوں کاری، سحر انگیزی اور جاذبیت کی جگہ حقیقت پسندی، دینی حمیت اور اسلامی عزت لے رہی ہے، آثار و قرائن اس بات کا پتہ دے رہے ہیں کہ اب وہ منزل دور نہیں جس کی تلاش میں امت مسلمہ سرگرداں و پریشاں ہے۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی افق سے آفتاب ابھرا، گیا دور گراں خوابی
عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے طلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی

اقبال اس بات سے دل گرفتہ ہیں کہ آج امت مسلمہ کا دامن عقل و شعور اور فکر و وجدان کے گنج گرانمایہ اور حمیت و غیرت کی دولت لازوال سے تہی ہے، نہ اس میں جدت افکار ہے اور نہ رفعت کردار، نہ اس میں ایمان و یقین کی پختگی ہے اور نہ بلند نگہی، خود شناسی اور خدا شناسی کی روح جلوہ گر، پورا عالم اسلام ایسے حق نگر، حق گو، حق شناس، صاحب دل اور صاحب نظر مرد مومن سے خالی ہے جو باطل سے پنجہ آزمائی کر سکے، عصائے مصطفوی سے بتان عصر حاضر کو پاش پاش کر دے۔ جمود و تعطل اور یاس و قنوطیت کے اس تیرہ و تاریک ماحول میں ایسی شمع فروزاں کر سکے جو قافلہ گم کردہ راہ کے لیے منارۂ نور ثابت ہو سکے۔

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات کہنہ ہے بزم کائنات تازہ ہیں مرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں بیٹھے ہیں کب سے منتظر دیر و حرم کے سومنات
ذکر عرب کے سوز میں فکر عجم کے ساز میں نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات
قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں گرچہ ہیں تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدہ تصورات

اقبال کی پوری زندگی مشرق و مغرب کی بادیہ پیمائی میں گذری لیکن جس بادہ کی تلاش میں وہ نکلے تھے وہ نہ خم مشرق مہیا کر سکا اور نہ سبوئے مغرب وہ خم خانہ مشرق اور سبو کدۂ مغرب پر نوحہ کناں ہیں۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا

اقبال کو نوجوانوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں اسی لیے وہ ان سے اپنے قلبی لگاؤ اور بے پایاں الفت و محبت کا اظہار کرتے ہیں، اس لیے کہ نوجوانانِ اسلام اپنی بلند ہمتی ژرف نگاہی، عالی حوصلگی اور بیدار مغزی سے ستاروں پر کمند ڈال سکتے ہیں اور کائنات کو مسخر کر سکتے ہیں۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اور پھر نوجوانوں میں اس احساس کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اے نوجوانانِ اسلام کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ تم کن اسلاف کے اخلاف ہو۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے — وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں — کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں خلاق آئینِ جہاں داری — وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ
سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں — بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں عباد اللہ والے تھے غیور اتنے — کہ منعم کو گدائے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے — جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں — مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی — کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی — ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ ایک عارضی شے تھی — نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی — جو دیکھا ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

اور پھر اسلاف کے اوصاف اور امتِ مسلمہ کے مطلوب و مقصود کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلاتے ہیں۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے — جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

وہ خلاق کائنات کی درگاہ میں دست بستہ بصد عجز و نیاز درخواست کرتے ہیں کہ اے خدا میرا سوز جگر، میرا عشق، میری نظر، میری آہ سحر اور میرا نور بصیرت امت مسلمہ کے ہر فرد تک پہنچا دے اور نوجوانوں کو اس کی توفیق دے کہ وہ اسے حرز جاں بنا لیں۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نور بصیرت عام کر دے

اور فرماتے ہیں کہ:

جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

وہ طارق ابن زیاد کے واقعہ سے مسلمانوں میں بلند ہمتی پیدا کرتے ہیں کہ کس طرح ایک نوخیز مسلم سپہ سالار نے سرزمین اندلس پر قدم رکھنے کے بعد اپنی کشتیوں کو نذر آتش کرنے کا حکم دیا تھا۔ تم بھی جوان ہو تم میں بھی اسی جذبہ قلندرانہ کی کارفرمائی ہونی چاہیے جبھی تمہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنا انتساب ان اخلاف کی طرف کر سکو۔

طارق چو بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو، بہ نگاہ خرد خطا است
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر بر درگفت
ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ماست

وہ ضمیر امت مسلمہ کو جھنجھوڑتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں کہ اے لاالٰہ کے وارث کیا بات ہے کہ تجھ میں نہ

گفتار دلیرانہ ہے اور نہ کردار قاہرانہ ہے اور نہ جذب قلندرانہ، کیا تمہیں کسی کی نظر لگ گئی کہ تم سے اعلیٰ ستودہ صفات رخصت ہوگئیں۔

اے لاالٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلیرانہ کردار قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ تم میں محبّت کا جنوں باقی نہیں ہے زندگی کی چنگاری جو تم میں ہر وقت عمل پیہم کی لو فروزاں رکھتی تھی بجھ چکی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ تمہاری صفیں کج ہیں دل پریشاں ہیں اور سجدہ بے ذوق ہے:

محبّت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں اقبال مخلصانہ دعا کرتے ہیں کہ خدا پھر اس امت میں روح زندگی بیدار کردے اس کی عظمت رفتہ اسے واپس دلادے اور اس کے وجود میں سوز دروں اور شعلہ محبت کو ایک بار پھر بھڑکا دے کہ اس سے اپنی نشأۃ ثانیہ کا سامان کرے اور محبّت کے پروں سے پرواز کرکے وہاں پہونچے جہاں گرانبار مادہ پرست نہیں پہونچ سکتے وہ آرزو کرتے ہیں کہ اس پسماندہ امّت کو ایک بار پھر قلب علی مرتضیٰ کی دھڑکن اور صدیق اکبر کی دھن اور لگن عطا ہو اور اسے دوبارہ سوز مشتاقی مرحمت ہو جو زندہ قوموں کو ملا کرتا ہے یہاں شاعر عزو ناز اور عشق و ایمان کے

احساس سے سرشار ہوا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا تیرے آسمان و زمین برحق اور تیرا جلال و جبروت ابدی ہیں مسلم جوانوں کو بھی اس کا راز داں بنا اور ان کے دلوں میں زندگی کا سوز و ساز اور درد و گداز پیدا کر دے۔ اور مجھ جیسی محبت و دلسوزی اور حکمت و بصیرت انھیں بھی عطا کر، میرے سفینے کو گرداب سے نکال اور منزل پر پہونچا۔

(نقوش اقبال ص ۲۲۰)

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملّت ترے نم سے ہے — نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دل مرتضےٰ سوز صدیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنّا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخشدے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرار برگ حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوتِ انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینہ روزگار — غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

اقبال جمال الدّین افغانی سے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی پسماندگی کا سبب دریافت کرتے ہیں جواب میں جمال الدین افغانی فرماتے ہیں کہ اس نکبت کا سبب عشق رسولؐ اور تعلیمات قرآنی سے دوری ہے۔

در دل او آتش سوزندہ نیست مصطفٰے در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد در ایاغ او نہ مے دیدم نہ درد

اقبال کے یہاں رجائیت ہے اس لیے وہ امّت مسلمہ کو مخاطب کرکے ایک اچھوتے اسلوب میں اس کو جہاں کے تعمیر نو کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ معمار حرم کو ہی تعمیر جہاں کا حق پہنچتا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس سے اس کا یہ حق سلب نہیں کرسکتی، اے مسلمانو! اٹھو اور اپنے دلوں کی تپش، شبوں کے گداز، نالۂ نیم شبی، آہ سحر گاہی، زور حیدری فقر بوذری، صدق سلمانی اور سوز صدیقی سے جہان نو کی تعمیر کرو کیونکہ:

ناموس ازل را تو امینی تو امینی دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندہ خاکی تو زمانی تو زمینی صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دلآویزی افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ بہ چنگیزی افرنگ معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

اور کہتے ہیں کہ:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

اقبال کی جگر کاوی رنگ لائی اور آج مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پوری امّت مسلمہ اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے کوشاں اور سرگرم عمل ہے اور اسلامی نشأۃ ثانیہ کے آثار اتنے واضح ہیں کہ بلا تأمل یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آئندہ صدی اسلام کی صدی ہوگی، اس نشأۃ ثانیہ کی تشکیل میں جہاں حالی، اکبر، مولانا آزاد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا حصّہ ہے وہیں علاّمہ اقبال کا حصّہ بھی ان سے کم نہیں بلکہ ان میں سب سے زیادہ ہے۔

رشید احمد صدیقی نے بجا لکھا ہے کہ:

مذہب کے اوامر و نواہی کو جس طرح صلحاء اور اتقیاء عمل سے تعمیل کی ترغیب دیتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں اسی طرح بڑے شعراء اپنے کلام سے ان کو مؤثر کرتے اور وقیع بناتے ہیں کبھی کبھی تو یہاں تک خیال آتا ہے کہ ہم پر عام طور سے آج مذہب کا جو اثر ہے بالخصوص ان پر جو مذہب کو اتنا اعتقاد سے نہیں جتنا عقل سے دیکھنے پرکھنے کے شائق ہیں وہ براہ راست اتنا مذہبی تصانیف کا نہیں جتنا اقبال کے اس کلام کا جس میں مذہب اخلاق اور تاریخ کے تقاضوں کی طرف رہبری ملتی ہے میرا خیال ہے کہ اقبال کا کلام اس صدی کا علم کلام ہے۔ (نقوش ص۲۵ اقبال)

جناب اقبال ظفر رائے بریلی۔

مسدس حالی منظر اور پس منظر

مدوجزر اسلام جسے عرف عام میں مسدس حالی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے خواجہ الطاف حسین حالی کی وہ طویل نظم ہے جس کا پہلا حصہ ۱۸۷۹ء اور دوسرا ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں مسدس کے ساڑھے چار سو سے زائد بند ہیں یہ طویل نظم انکی صلاحیت شعر گوئی کی شہادت بھی ہے۔ ان کے دل کی دھڑکنوں کا نغمہ بھی، اسلام اور اس کے توسط سے مسلمانوں کی عظمت و شوکت کا قصیدہ بھی ہے اس کی پستی و ضلالت کا مرثیہ بھی۔ اور اس تغیر کی طرف واضح اشارہ بھی، نظم میں شاعرانہ تکلفات سے قطعاً کام نہیں لیا گیا۔ نظیر کے سے ہلکے پھلکے انداز میں حالات کو جوں کا توں بیان کر دیا ہے، نہ فلسفہ ہے نہ تصوف، نہ وصال کی پیش دستی نہ ہجر کی رقت۔ زبان سادہ و عام فہم ہے۔ انداز شعر ہر قسم کے تصنع سے مبرا۔ کہیں کہیں الفاظ بندش کی سستی اور غیر ضروری تعقید سے بوجھل بھی ہیں۔ جا بجا اجنبی الفاظ کے استعمال سے لہجے کی روانی ٹوٹ جاتی ہے۔ مگر جب خیال کے جوہر اپنی چمک دکھانے لگتے ہیں تو ہر آواز میں بازگشت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ نظم کا خاکہ ہے اصل نہیں مسدس کی روح تک پہونچنے کے لیے اس سوال کا جواب ڈھونڈنا پڑے گا کہ آخر حالی نے یہ نظم کیوں لکھی؟ بزم سخن میں موہوم دھڑکنوں کی نغمہ سرائی کرتے کرتے اچانک ان کو ٹوٹے ہوئے دلوں کی دھڑکنوں کا حساب کرنے کا خیال کیسے آیا۔ وقت کے کینواس پر وہ کون سی تصویریں تھیں جن کے

خدوخال تلاش کرتے ہوئے حالی مسدس لکھ بیٹھے۔ اس کے لیے ان کے عہد کے مروجہ رجحانات اور اس پر چوٹ کرنے والے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے مصنف کے ذہن پر اُن اثرات کی پرچھائیاں تلاش کرنی ہوں گی جو اس نظم کو وجود میں لانے کا باعث ہوئے کہ اس کے بغیر نہ حالی کو سمجھا جا سکتا ہے نہ ان کی نظم کو۔

درۂ خیبر سے بحر عرب کے ساحل تک کسی ایمان والے کے پہلے قدم سے آج تک ہندوستان کی سرزمین پر گزرنے والے واقعات کی بازگشت اگر سنی جا سکے تو یہ زمین انقلابات کی آماجگاہ کہلائے گی۔ تاریخ کے اس وسیع و عریض کینواس پر لحظہ لحظہ بدلتی ہوئی زندگی اور اس کی قدروں کے درمیان انقلابات کے باوجود توازن کی حالت قائم رہی۔ ہر تغیر کم نقصانات کے ساتھ زیادہ فائدے دے گیا، جب تک ملت کے افراد میں قوت احتساب اور حرکت باقی رہی۔ علاء الدین خلجی کے عزائم نے بہکنا چاہا تو اس کی فکر کی جولانیوں کو نئے میدان دیئے گئے۔ زمین کا پہلا زرعی بندوبست ہوا۔ ایک نئی زبان ایجاد ہوئی آواز کی رفتار سے خبر رسانی کا کام لیا گیا۔ تغلق نے دلی کی آبادی کو دولت آباد منتقل کیا تو دکن کی سنگلاخ چٹانیں علم و فن کی گلکاریوں سے سرسبز ہوئیں یا برخم لنڈھاتا ہوا آیا۔ اور اسے توبہ کرنی پڑی۔ اکبر نے دین الٰہی کے نام سے فکر اسلامی کے سامنے ایک چیلنج پیش کیا تو شیخ احمد سرہندی کا ردعمل اتنا شدید اور اتنا متوازن تھا کہ اکبر کی سانسیں ابھی باقی ہی تھیں کہ دین الٰہی کا خاتمہ ہو گیا یہاں تک کہ خود اکبر بھی اس سے تائب ہوا۔ یہ نتیجہ تھا۔ زندگی کے تحریکی شعور سے وابستگی کا جس نے علم و عمل میں حرکت کو مقدم رکھا تھا، لیکن اٹھارہویں صدی کی آمد سے اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ انتشار کا جو دور شروع ہوا تھا۔ اس نے بڑھتے بڑھتے جمود کی شکل اختیار کر لی، احمد شاہ ابدالی کی بروقت مدد، سید احمد شہید رائے بریلوی کی تحریک احیائے اسلام اپنی تمام قوت، خلوص اور جانفشانی کے باوجود بہتری کی کوئی شکل و صورت نہ پیدا کر سکیں،

کہ جب خود اپنے اندر زندگی کی شعائیں پیدا ہونا بند ہو جائیں تو مانگے کے اُجالے زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے پاتے۔ اٹھارہویں صدی کی آمد جس زوال کی ابتدا تھی ۱۸۵۷ء کا انقلاب اس کی انتہا ثابت ہوا۔ وقت کی پیشانی پر لکھی ہوئی وہ تمام عبارتیں اگر پڑھی جا سکیں تو ان میں وہ تمام معرکے درج ہیں جن کی ابتدا آزادی کے متوالوں کی سرفروشیوں سے شروع ہو کر شہنشاہِ ہند کی گرفتاری و جلاوطنی اور اس کی انتہا ذہن و دل کے تمام دروازوں پر کڑی پہرہ داری اور فکر و تہذیب، زبان و ادب کے تمام مندرجات پر سوالیہ نشان لگانے سے ہوئی۔ یہ حملہ اچانک نہ تھا۔ نہ اس میں بہکے ہوئے قدموں کی کوئی آہٹ تھی نہ فکر و عمل میں کوئی الجھاؤ، یہ انتہائی منظم، دھیمی لیکن بیحد گہری سازش کا نتیجہ تھا۔ کہ ردعمل کو عمل کے لیے زمین تلاش کرنے اور پھر اپنی راہ نکالنے میں خاصہ وقت لگا کہ۔ جذبوں کے لیے ذہن و دل کے سوائے اور کہیں جائے پناہ نہ تھی۔ کسی صف میں کہیں کوئی صورت شناسا نہ تھی۔ چہرے، قد، کاٹھی، لباس، زبان، حتیٰ کہ گالیاں تک اجنبی تھیں۔ دور دور اگر کوئی جانی پہچانی صورت دکھی بھی تو وہی ناز و انداز، اسی طرح اکڑی ہوئی گردنیں، خشک چہرے نہ شرمسار نہ غمگسار جن کے ہونے سے نہ ہونا بہتر۔

لیکن ۱۸۵۷ء کا یہی افق اسلامی زندگی کا وہ عجیب نقطۂ اتصال ہے جہاں خواب و بیداری ایک ساتھ ملتے ہیں یہ غفلت کی انتہا بھی ہے، ہوش کی ابتدا بھی، جہاں زندگی اپنی جدلیاتی قوتوں کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے خود اپنے تضادات سے مواد حاصل کرتی ہے۔ زندگی کی نا میاتی قوت ایک جہت کی کمی کو دوسری جہتوں میں پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی وہ ابتدا ہے جس کی رفتار سست اور راہیں گرد کارواں سے محروم ہی سہی لیکن دھیمے دھیمے قدموں کی چاپ سے یقیناً محروم نہیں تھیں۔ قدموں کو رفتار کے لیے سمت

کی تلاش تھی۔ اور سمت ابھی موہوم تھی۔ دلوں میں خوف بھی تھا۔ تذبذب بھی جن آنکھوں نے اپنوں کو بیگانہ بنتے دیکھا تھا۔ وہ ہر اپنے پن کو جھلا وہ سمجھنے پر مصر تھیں۔ جاگیردارانہ نظام کے شیدائی ولی مرحوم کا مرثیہ پڑھتے ہوئے نئی حکومت کی عطا کردہ رعایتوں کی ریت میں سر چھپا چکے تھے۔ دل زخمی تھے لیکن سر بچ جانے کا شکر ادا کرتے ہوئے مالگذاری طوائف شطرنج، شکار، غرض کسی نہ کسی سراب میں پناہ لے چکے تھے۔ اہل علم اپنے محدود علم پر تکیہ کیے مابعد الطبیعاتی فلسفوں کی بحثوں میں الجھے اسی کو علم و دانش کی انتہا سمجھ بیٹھے تھے۔ خانقاہیں مجاوروں کا اکھاڑہ تھیں۔ شاعر اپنے تصوراتی عشق کی قافیہ پیمائیوں سے ذرا مہلت پاتے تو تصوف کی نکتہ دانیوں میں مصروف ہو جاتے۔ گویا زندگی سے فرار ہی جینے کا واحد سہارا تھا۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے بدلے ہوئے حالات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی فردوس گمشدہ کی تلاش میں نئے راستوں کے متلاشی تھے۔ حکومت ختم ہو چکی تھی۔ اور اس کی واپسی کی سردست کوئی صورت نہ تھی۔ نئی راہیں کھولنی تھیں یا ان راہوں کو پھر ڈھونڈنا تھا۔ جو نقش پا سے محروم ہوتے ہوئے اپنا سراغ کھو چکی تھیں۔

اس کشمکش نے تلاش و جستجو کے جذبہ کو نئی زندگی دی۔ محکومیت میں عزت و وقار کس طور پر ممکن ہے۔ یہ وہ سوال تھا جس کی گونج ہر ذہن میں تھی۔ اس کا جواب ضروری تھا۔ ورنہ بے یقینی کی یہ کیفیت بے دلی اور بے حوصلگی میں مزید اضافہ کر سکتی تھی اور قوم جبلی سطح پر تو جیتی رہتی لیکن انسانی اور جذباتی سطح پر جینے سے بہت جلد محروم ہو جاتی۔ خیال پیدا ہو جائے تو اسے متحرک ہونے میں دیر نہیں لگتی، علی گڑھ تحریک" ایجوکیشنل کانفرنس، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، انجمن حمایت اسلام لاہور، غرض مختلف عنوانوں سے اصلاح کا کام شروع ہوا۔ سرسید نے انگریزی تعلیم کا بگل بجایا۔ شبلی نے "محکومیت میں زندگی کیوں کر بسر ہو"۔ "غیر قوموں کی مشابہت" جیسے عنوانات پر مضامین لکھے۔ مسجدوں میں تقریریں ہوئیں، مدرسوں

کی بنیاد ڈالی گئی۔ اٹھتے ہوئے قدموں کو سمت ملی تو زندگی نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

خواجہ الطاف حسین اسی پُرآشوب دور میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے، جب ان کی آنکھوں نے دیکھنا سیکھا تو ان کے سامنے کھلتی ہوئی کلیوں کی شبنم آلود پنکھڑیاں نہ تھیں۔ گزرتی ہوئی بہاروں کا غبار تھا۔ لیکن ان کے چولے سے جس حالی نے جنم لیا اس کے خمیر میں سعدی کا تہیں غالب کی فکر، شیفتہ کی سادگی و سلاست۔ آزاد کی جدت، یتیمی کا درد، بزرگوں کی شفقتیں اور علم کا شوق شامل ہوا۔ اور اس مرکب نے جب سرسید کی تحریک سے جلا پائی تو ملت کو ایک ہمدرد اور اردو کو وہ دُرِّ بے بہا مل گیا جس کے ذکر کے بغیر نہ سوانح نگاری کی تاریخ مکمل ہو سکتی ہے نہ اردو تنقید کی۔ غالب نے ان کے متعلق کہا تھا "اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنے آپ پر ظلم کرو گے"۔ اگر حالی شعر نہ کہتے تو اردو پر بھی ظلم ہوتا۔ غالب نے ذہن رسا پایا تھا وہ انقلاب سے پہلے اس کی دستک سن چکے تھے۔ لیکن ان کے سامنے کوئی مشن نہ تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری اور خطوط کے ذریعہ زندگی کے مروجہ رجحانات اور اس کی بدلتی ہوئی قدروں سے متعلق اشارے کیے تھے، سوال اٹھائے تھے حالی کے سامنے ایک مشن تھا۔ انھوں نے غالب کے اشاروں کو سمجھا اور ان کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ انھوں نے تاریخ سے سند لی۔ اور ان عوامل کی تشریح کی جو گذشتہ عظمتوں کا باعث ہوئے تھے۔ اُن خامیوں کو اُجاگر کیا جو موجودہ تنزل کا سبب تھیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں اُن راہوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو کھوئی جا چکی تھیں حالی قدیم و جدید کے درمیان کی انتہائی اہم کڑی ہیں، مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر یہ کہنے کی جسارت کی جائے کہ اگر حالی نہ ہوتے تو اقبال کو اقبال بننا محال ہوتا۔ اور اردو والوں کو غالب شناسی، غالب حالی کے پہلے محرک ہیں اور اقبال امپروومنٹ Improvement

حالی بیس برس کی عمر سے شعر کہہ رہے تھے لیکن اپنی شاعری سے مطمئن نہ تھے۔ اسی عالم میں سرسید نے قوم کو بیدار کرنے کے لیے نظم کی فرمائش کی تو

حالی کی فکر کو مقصد مل گیا۔ مسدّس کے پیرایہ میں لفظوں کا ایک آئینہ بنایا اور ملّت کو اس کی ترغیب دی کہ اس میں اپنی تصویریں دیکھو۔ اور آپ اپنا محاسبہ کرو کہ اس کے بغیر نہ عیبوں پر نظر جائے گی نہ درستی کی خواہش پیدا ہوگی۔

مسدّس کا موضوع بارہ صدیوں پر محیط وہ داستان ہے جو اپنے آپ میں سادہ بھی ہے رنگین بھی اور اتنی دلچسپ بھی کہ زیب داستاں کے لیے لفظوں میں تراشے ہوئے کسی طلسم کی ضرورت نہیں۔ یہ بت گری نہیں بت شکنی کے حوصلوں کی کہانی ہے جسے حالی نے جوں کا توں بیان کر دیا ہے۔ مسدّس کو انھوں نے عوام کے خوابیدہ شعور کو جگا کر ہوشیار کرنے کا ذریعہ بنایا۔ ماضی کی طرف حسرت بھری نظریں۔ حالی کی اپنی کڑھن اور اس سے نکل بھاگنے کا جذبہ بے اختیار غرض امید و بیم کی وہ تمام کیفیات جو اگر اصلاح کی طرف نہیں تو کم از کم خود احتسابی کی طرف ضرور مائل کر دیں، ماضی کا قصیدہ ہو یا حال کا مرثیہ اس کا درد و کرب ان کا شوق ہر ہر لفظ میں مجسم ہو جاتا ہے جہاں آورد ہے وہاں بھی والہانہ جذباتیت کی کمی ان کے قول کی صداقت کو مجروح نہیں کرتی وہ اسلام کے تحریکی شعور سے آشنا تھے۔ اور اسی کے داعی بھی۔ اس سے الگ جو بھی ہے وہ مسدّس کا موضوع نہیں۔

نظم کی ابتدا اس تمہید کے ساتھ ہوتی ہے کہ مرض لاعلاج نہیں ہوتا اگر اس کی تشخیص اور علاج میں لاپرواہی نہ برتی جائے۔ یہ ایک اشارہ ہے ملّت کے لیے کہ موجودہ امراض کا علاج بھی ممکن ہے اگر اس کی سعی کی جائے، پھر ایام جاہلیت میں عربوں کی زندگی کا خاکہ ہے جس میں ان کی جغرافیائی حالت علم اور تمدن سے انکی دوری۔ دلوں کی شقاوت، وحشت و بربریت، حد سے بڑھے ہوئے فخر و غرور کے باعث مسلسل اور بے وجہ خانہ جنگیاں، دختر کشی، بدقماشی غرض ان عیوب کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کسی قوم کے نیکی سے دور اور بدی سے قریب ہونے کا پیمانہ ہوتے ہیں۔

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

اس عالم میں غیرت حق جوش میں آئی اور ع

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا دعائے خلیل اور نوید مسیحا

اور اسی کے ساتھ رحمتوں کا نزول شروع ہوگیا۔ بعثت نبوی کے ساتھ حالت بدلنے لگی۔ یہاں حالی کا قلم براہِ راست ان کے قلب سے تحریک پاتا ہے کہیں آورد نہیں ہے آمد ہی آمد ہے ع

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والے مرادیں غریبوں کی بر لانے والے
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والے وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والے
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

ان تمام نعمتوں کا ذکر ہے جو اسلام کی برکتوں کا نتیجہ تھیں۔ ایمان، امانت صداقت، اخوت، بندگی، غیر اللہ کا انکار، بندگان خدا سے محبت و شفقت، معیشت و معاشرت کے آداب، علم و تمدن سے رغبت، اور ان تمام نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے بعد عرب کے وہی صحرا نشین اپنے نبی کی پیروی میں سرگرم ہوئے تو ع

لیے علم و فن اُن سے نصرانیوں نے کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب اُن سے سیکھا صفاہانیوں نے کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

مسدّس کے صفحات میں سیاسی عروج و زوال کو اہمیت حاصل نہیں ہے۔

وہ ان اسباب وعوامل کا ذکر کرتے ہیں جو قلعوں اور شہروں کی تسخیر کے بجائے ان کی فضا کو مسخر کرتے ہیں۔ افراد کی بہتری ان کے اخلاق کی رہین منت ہے۔ مساوات اخلاق کا پیمانہ ہے۔ علم تمام خزانوں کی کنجی اور مشقت زندگی کا رختِ سفر ہے، بناؤ کا ذکر ہو یا بگاڑ کا تذکرہ یہی ان کی فکر کا محور ہے۔

جب تک ملت کے افراد خدا کے حکم اور رسول کی تلقین پر عمل پیرا رہ کر اپنے ایمان، اخلاق اور علم کو صیقل کرتے رہے جب تک خدا کے لیے مٹنے کا دم بھرتے رہے۔ زندگی ان کی چوکھٹ پر پہرے دیتی رہی، ہر گزرنے والی رات نے ان کی شان اطاعت کی گواہی دی۔ ہر روز نکلنے والا سورج ان کی عظمتوں کی روشنی پھیلاتا رہا ان کی حکومت حکمرانی کا سبق تھی۔ ان کی محکومیت حکمرانوں کی نظر میں قابل احترام، لیکن جب صدق وصفا کا یہ چشمہ گدلا ہوا اور دین سے ان کے رشتہ کمزور ہونے لگے ؎

"مٹیں خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت"

"کیے بے سر جس نے ساتوں سمندر وہ ڈوبا دھانے میں گنگا کے آکر"

اور یہیں سے وہ ملت بیمار کا مرثیہ شروع کرتے ہیں۔

چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں۔
مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

تمام نعمتیں ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں، جستجو کی جگہ سہل پسندی نے لی، قناعت کی جگہ ہوس آئی، فراغت کی بجائے افلاس آیا۔ غرور نے انکسار کی مسند سنبھالی۔ کج بحثی نے علم کے شوق پر گہن لگایا۔ سرفروشی کی جگہ سر چھپانے میں عافیت نظر آئی۔ حکومت گئی تو سب چلا گیا۔ گویا طلسمات کا ایک کارخانہ تھا۔ طلسم ٹوٹا تو نہ زمین اپنی تھی نہ آسماں اپنا، اب حاصل کریں تو کیسے، مانگیں تو کس سے، نہ لینے کا ہنر نہیں آتا ہے نہ مانگنے کی ادا یاد ہے۔ زندگی کیا بس چلتی ہوئی سانسوں کا ایک سلسلہ ہے، نہ مقصد کی خبر ہے

نہ منزل کا پتہ۔

جہاں آگ کا کام کرتا ہے باراں جہاں آکے کرتا ہے رو ابر نیساں
تردد سے جو اور ہوتا ہے ویراں نہیں اس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

غرض حالی نے ملت کی ہر رگ کو جھنجھوڑا ہے، زخموں کو اتنی بے رحمی سے چھیڑا کہ قلم چلتے چلتے رک گیا۔ غم اٹھانے کی تاب نہ تھی۔ یا آہ کا اثر دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی آہ نے اثر دکھایا۔ چھ سات برس کے عرصہ میں کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے کسی نے سراہا اور نقد جاں بنایا۔ واعظوں نے زور بیان کے لیے استعمال کیا، شاعروں نے اسی انداز کی نظمیں لکھیں۔ کسی نے طنز کے تیر چھوڑے۔ کسی نے اسے بیماری کا نتیجہ سمجھا کسی نے مزید بیماری۔ غرض اس کی گونج ہر اس گوشے تک پہنچی، جہاں شبلی کے مقالے۔ سرسید کے مضامین اور ارباب علی گڑھ کی تقریریں نہ پہنچی تھیں۔ اس پذیرائی نے حالی پر بھی اثر کیا اور قلم کی چپ ٹوٹی۔ کرب کی جگہ تحریک نے لی اور وہ امید کا دامن تھامے ایک بار پھر صدا دینے نکل پڑے۔ اب ان کو احساس ہو چکا تھا کہ بھیڑ میں کچھ اہل نظر بھی ہیں۔ ضرورت ہے فکر کو بیدار کرنے کی جو حرکت کو جنم دے کر جمود کو دور کر دے۔ اس نمی کی جو مٹی کے ساتھ مل کر بیج کی قوت نمو کو تقویت دیتی ہے اور زندگی کی نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔

تمہیں اپنی مشکل کو آساں کرو گے تمہیں درد کا اپنے درماں کرو گے
تمہیں اپنی منزل کا ساماں کرو گے کرو گے تمہیں کچھ اگر یاں کرو گے
چھپا دست ہمت میں زور قضا ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

یہاں تک آتے آتے حالی کی آواز خود اپنی بازگشت بن جاتی ہے، اور

یوں کہ اس کی تکرار ان کے عہد سے آج تک جاری ہے۔ حالی اپنے عہد میں بھی جدید تھے۔ آج بھی ہیں۔ اور ہمیشہ رہیں گے۔ مسدّس کے سہارے انھوں نے اپنے آپ کو زمانے کی گرفت میں اس طرح دیا کہ اس کی گردشوں سے محفوظ ہو گئے۔ زمانہ جو وقت کی روانی سے عبارت ہے جس کے نہاں خانوں میں روز نئے انقلاب جنم لیتے ہیں۔ نئی طاقتیں پرانی طاقتوں کو شکست دیتی ہیں اور ہر مفتوح کو اسی کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس سے ۱۸۵۷ء میں امت مسلمہ گزری تھی۔ مسدّس کے بند ہر شکست خوردہ کے لیے آئینہ بھی ہیں، مشعلِ راہ بھی کہ کوئی شکست مقدر نہیں بن سکتی اگر سپر نہ ڈال دی جائے۔

محمود حسنی ندوی

اسلامی نشاۃ ثانیہ میں

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنیؒ کا حصہ

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء (متوفی ۱۹۲۳ء) نے ایسے پُرآشوب دور میں آنکھیں کھولی تھیں جب دو عہدوں اور دو تہذیبوں کی کشمکش زوروں پر تھی اور اس وقت مسلمانوں کو عالمی طور پر ثقافتی، تعلیمی، تمدّنی، اور دینی اعتبار سے سخت مشکلات کا سامنا تھا، لیکن مولانا کو جو ماحول ملا، اور جن کی آغوش تربیت میں وہ پروان چڑھے ان کا رشتہ علم و دین سے مضبوط قائم تھا، اور صرف چند دہائیوں پہلے ہی اسی سمت سے ایک باد بہاری اٹھی تھی، جس کے ایمانی جھونکے شمالی مشرقی ہندوستان سے لے کر افغانستان کی سرحد تک پہنچ چکے تھے، اور اس کے سایہ تلے ایک ایسی نورانی جماعت کام کر رہی تھی، جس نے دین کی سربلندی اور کلمۂ حق کے نفاذ کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی، اس کی قیادت خانوادۂ نبوّت کے ایک فرد فرید امیر المومنین حضرت سیدنا سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کر رہے تھے، جن کی کوششوں کے ذریعہ مسلمانان ہند کا اسلام سے رشتہ استوار ہوا، اور برادران وطن کے دلوں میں اسلام کی حقانیت اور عظمت نے جگہ لی، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کا آپ سے خاندانی اور روحانی تعلّق تھا، مولانا کے والد حکیم سیّد فخرالدّین صاحب خیالی بذات خود ایک بڑے حقانی عالم، بلند پایہ مؤرخ، شیخ طریقت اور کہنہ مشق مصنّف تھے، جن کی اہم اور گرانقدر تصانیف میں ایک "مہر جہانتاب" فارسی زبان میں ہے۔

اس طرح آپ کے اندر دینی اور سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی طور پر مسلمانوں کو بیدار کرنے کا

جذبہ شروع سے کارفرما تھا، اور مسلمانوں کو ان تمام میدانوں میں تنزلی و پستی کے جو دن دیکھنے پڑ رہے تھے، اس سے آپ سخت متأثر تھے، اور ان خرابیوں پر آپ نظر جمائے ہوئے تھے، جو پستی و زوال کے حقیقی اسباب ہیں، لیکن چونکہ آپ کا یہ بھی نظریہ تھا کہ یہ افسوس ناک دن اور بیرونی انتشار نتیجہ ہے اندرونی خلفشار کا، یہ سوچ کر آپ نے خود اپنے اندر وہ جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے زمانہ تابناک ہو سکے، اور پھر آپ نے اپنی تحریر و تصنیف کے ذریعہ ایسے کام انجام دیئے جن سے مسلم برادری کو اپنی عظمت رفتہ کا احساس ہوا، اور ان کے مردہ دلوں میں جوش و ولولہ پیدا ہوا، اور زوال و پستی سے عروج و اقبال کا جذبہ ان کے اندر امنڈنے لگا۔

مولانا بڑے ہی کم سخن واقع ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ انھیں تحریکی کاموں اور سفروں سے بڑی کم مناسبت تھی، اور تنہائی پسند واقع ہوئے تھے، مگر دلِ دردمند اور فکر ارجمند کے حامل تھے، اور ضمیر و مزاج میں اصلاح اور جد و جہد کا جذبہ تھا، اور اس کے لیے ایک حساس طبیعت رکھتے تھے، چنانچہ مسلمانوں کو ادبار سے اقبال کی طرف لانے کے لیے ان کی طبیعت بے چین رہتی تھی، اور کسی بھی ایسے کام میں جو اس کے لیے سود مند ہو بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے تھے چنانچہ "تحریک ندوۃ العلماء" میں حصہ لینے اور صرف حصہ ہی نہیں بلکہ اہم اور بنیادی کردار پیش کرنے میں آپ نمایاں نظر آتے ہیں، اس تحریک کو وقت کی ایک اہم ترین ضرورت قرار دیتے ہوئے لوگوں کی توجہ اس کی تائید کی طرف مبذول کراتے ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ہندوستان کے مختلف حصوں میں صدہا انجمنیں قائم ہوئیں اور انھوں نے حتی الامکان اصلاح کی مناسب فکریں کیں سب سے بڑھ کر عالی خیال اور بلند حوصلہ سر سید احمد خاں بہادر نے کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی مگر افسوس ہے کہ انھوں نے قوم کو بہبودی کی یک رخی تصویر دکھائی، دنیا کو سنبھالا اور دین سے دیدہ و دانستہ اعراض کیا نوجوانوں پر ان کی دنیاوی کوششوں نے وہ اثر کیا جس سے اونگھتے کو ٹھیلے کا بہانہ ہو گیا۔

انہی باتوں پر نظر کر کے عالی خیال بزرگوں کی یہ مستقل رائے تھی کہ قوم کی حالت

اسی وقت درست ہوگی، جب علمائے کرام اس کی طرف متوجہ ہوں گے خدا کا شکر ہے کہ یہ تمنا اب تک لوگوں کے دلوں میں چھپی ہی تھی کہ تائید ایزدی سے ہمارے دین و دنیا کے رہنما، ہماری کشتی کے ناخدا اور اسلامیوں کی فوج کے سپہ سالار، دین کے سرپرست اور کلام الٰہی کے حامل یعنی مقدس علماء اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فکر کرنے پر آمادہ ہوئے لیکن نہایت ہی ظلم ہوگا اگر قوم ان کی شکر گزار نہ ہو۔"

حیات عبدالحی ص ۱۳۹

اسی سلسلہ میں حیات عبدالحی مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، سے ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو جس میں مولانا عبدالحی لوگوں کی پست ہمتی اور مردہ دلی کو دیکھتے ہوئے جھنجھوڑنے والا سخت لہجہ اپناتے ہیں وہ کہتے ہیں:۔

"صاحبو! ایک وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی عزت قائم تھی، انھیں کی حکومت تھی، انھیں کا علم و ہنر تھا، تہذیب و تمدن کے خزانے انھیں کے قبضہ میں تھے، تجارت و زراعت کے بھی مالک تھے، قصہ مختصر دین و دنیا میں ان کا بول بالا تھا دین تھا تو ان کا، دنیا تھی تو ان کی، مگر جب سے تنزل کے میدان میں انھوں نے قدم رکھا ہے، چاروں طرف سے ادبار نے گھیر لیا ہے، ساری کمائی لٹ گئی، دنیا میں صرف ان کا نام ہی رہ گیا، اور ان کے گھر کی دولت پر غیر قومیں قابض ہو گئیں علماء گوشہ نشین ہو گئے، غربا بھیک مانگنے لگے، یہاں تک کہ غیر قوموں کو بھی ان کی ابتری پر ترس آنے لگا، ایسی حالت میں کیونکر امید کی جا سکتی ہے کہ قوم کا خزاں رسیدہ باغ سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگے، بجز اس کے کہ قومی جوش از سر نو پیدا ہو، اور ہر ہر فرد پست ہمتی اور ذہانت کو چھوڑ کر اولوالعزمی اور حوصلہ مندی پر صبر و استقلال کے ساتھ آمادہ ہو جائے۔" (حیات عبدالحی ص ۱۳۸)

جن صفات کو اپنانے کی مولانا دعوت دے رہے ہیں وہ مولانا کے اندر بدرجہ کمال موجود تھیں، وہ ندوہ کی تحریک سے جڑے تو اس کے لیے چٹان ثابت ہوئے

علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں :۔

" ندوہ ان کی خدمات سے کبھی محروم نہیں رہا، ندوہ پر کیا کیا انقلابات آئے کتنے فتنے اور حوادث پیدا ہوئے، مگر ان تمام حالات وحوادث کے طوفان میں ثبات واستقلال کی صرف ایک چٹان تھی جو اپنی جگہ پر تھی اور وہ مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم کی ذات تھی۔" (یادِ رفتگاں)

مولانا کے اندر جو دینی حمیت اور ملّی غیرت تھی وہ انھیں کسی وقت بھی چین وسکون سے بیٹھنے نہ دیتی تھی، اور ان کی چوٹ اور کرب ظاہر ہو کر رہتا تھا، لیکن جیسا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے کہ "کسی بڑے پیمانہ پر کام شروع کرنے سے پہلے اور عام مسلمانوں کی اصلاح کو اپنا موضوع بنانے سے بیشتر قدرتاً ان کی نظر سب سے پہلے اپنے خاندان کی طرف گئی جو اسوۂ نبوی اور فرمانِ خداوندی " وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ " کے مطابق اولین دائرہ عمل ہونا چاہیے تھا۔"

چنانچہ آپ نے " اصلاح " نام سے ایک رسالہ لکھا، جو بڑا مقبول ہوا، اور اس کے دوررس اثرات ظاہر ہوئے، اس کا ابتدائیہ یوں ہے :۔

" اس زمانہ میں سب سے بڑا عیب جو ہم مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے وہ یہ ہے کہ نیکی کرنے کا خیال دلوں سے اٹھ گیا ہے، ہمارا کوئی کام خود غرضی سے خالی نہیں ہوتا، طمع وحرص کی ترغیبوں نے ہم کو مغلوب کر دیا ہے، جھگڑوں کا طوفان موجزن ہے، بھائیوں کی رسوائی پر خوشیاں منائی جاتی ہیں، تنگ دستی نے حواس کو ایسا مختل کر دیا ہے کہ نہ اپنی ہستی جمتی ہے نہ دوسروں کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے ہمارے سارے حرکات وسکنات پر خود غرضی فرمانروا ہے، قوم کو، ملک کو، وضع کو، غرض جو کچھ ہم کو مل سکے اس کو اپنی غرض پر قربان کرنے کو ہر وقت ہم آمادہ رہتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں کی حالت ایسی نہ تھی، ان کے اخلاق ایسے پاکیزہ تھے، جن کی

مثال دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں، اخلاق، محبّت، مروّت، دوستی، دوستی کا برتاؤ دوستی کا پاس، دلی نیکی، فیاضی، متانت، چھوٹوں کے ساتھ الفت، بڑوں کا ادب غریبوں کے ساتھ ہمدردی، قومی یگانگت، سب ان میں جمع تھے۔"

آگے بڑے درد و کرب کے ساتھ موجودہ حال کی تصویر کشی کرتے ہوتے ہو رقم طراز ہیں:۔

"اِس زمانہ میں یہ سب باتیں موقوف ہوگئی ہیں، اخلاق باقی نہیں رہا، محبّت دلوں سے کافور ہوگئی، مروت کرنا بیوقوفی میں داخل ہے، دوستی اور دوستی کا پاس اگلے لوگوں کی سادہ لوحی سمجھی جاتی ہے، نہ چھوٹوں کو بڑوں کا ادب رہ گیا ہے، نہ بڑوں کو چھوٹوں کی الفت رہ گئی ہے۔"

آگے کہتے ہیں:۔

"بات بات پر لڑنا ہمارا شیوہ ہوگیا ہے ذرا ذرا سی بات پر عزیزوں سے بگاڑ لیا جاتا ہے، رشتے ناطے توڑ دیئے جاتے ہیں، قصّہ مختصر ہماری اخلاقی حالت ایسی پست اور ردّی ہوگئی ہے جس نے ہمارے دل کو، دماغ کو، عبادات و معاملات کو، سبھی چیزوں کو راہ راست سے منحرف کر دیا ہے، اور ہماری وہ حالت ہوگئی ہے جو رسالت کے چمکنے سے پہلے عرب کی حالت تھی۔"

مولانا نے اپنے اس وقیع رسالہ میں تاریخ کے دریچوں سے نکال کر مؤثر واقعات کے ذکر کے ساتھ قرآن و حدیث سے مدلّل کر کے صلہ رحمی کی اہمیت واضح کی ایک طرف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کا ذکر کیا جو ہمارے لیے اسوہ ہیں، اور دوسری طرف اپنے گریبانوں میں جھانکنے کو کہا کہ آخر ہم کس کے نام لیوا ہیں، کہتے ہیں دیکھو!

"ایک ہم ہیں جو ذرا سی باتوں پر اپنے عزیزوں سے روٹھتے ہیں، بولنا چالنا بند کر دیتے ہیں، ان کی جان و مال، عزّت و آبرو کے درپے ہو جاتے ہیں، ان پر مقدمے چلاتے ہیں، مقدموں میں کامیاب ہونے کے لیے جھوٹے گواہ بناتے ہیں، جعلی دستاویزیں تیار کرتے ہیں، عمال کو رشوت دیتے ہیں، اور جو ہم میں

زیادہ منچلے ہیں، وہ حریفوں کو زیر کرنے کے لیے ان کے گھر میں چوریاں کرا دیتے ہیں، ان کے کھلیانوں میں آگ لگوا دیتے ہیں، ان کے گھر میں افیون رکھوا کر پولیس کے ذریعہ سے ان پر فوجداری کے مقدمے قائم کرا دیتے ہیں، جو ان سے بھی زیادہ منچلے ہیں، وہ بدمعاشوں کو ہموار کر کے ان کو مروا ڈالتے ہیں، اور پھر یہ خوش فہم اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔"

مولانا کے اندر اس ملک میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی فکر و تڑپ تھی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں مسلمانوں کو کیسا اقبال و عروج رہا، اور ہر فن میں مسلمانوں نے وہ جوہر دکھائے جس نے مسلمانوں کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے، اور ایسے ایسے باکمال علماء و ماہرین فن اور مشائخ طریقت دیئے جن کی دوسری جگہ نظیر نہیں ملتی، مثلاً قاضی شہاب الدین دولت آبادی، ملا نظام الدین فرنگی محلیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ جیسے عالی رتبہ لوگ، دوسری طرف محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسا منصف اور باحوصلہ بادشاہ اور مظفر حلیم جیسا عالی ہمت و پارسا سلطان اور ابراہیم شاہ شرقی جیسا باحمیت اور علم پرور حکمراں دیا، عجائبات پر آئے تو تاج محل اور قطب مینار نے دنیا کے عجائبات کو ماند کر دیا۔

چنانچہ آپ نے دلّی کے سفر کی ٹھانی تاکہ خود مشاہدہ کر کے مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ کا احساس دلایا جائے اور حالی کی زبان میں انھیں باور کرایا جائے ؎

کہ کل کیا تھے اور آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

دلّی کے تاریخی مقامات کا جب انھوں نے بذات خود مشاہدہ کیا تو زخم کہن تازہ ہو گئے اور ان کی اسلامی حمیت اور ملّی غیرت جوش میں آگئی کہ یہ مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ عہد کی یادگار ہے اور ان کا علمی، تمدّنی، ثقافتی، سیاسی اور دینی مرکز رہا ہے، اپنے درد و کرب کا اظہار معذرت کرتے ہوئے یوں کرتے ہیں۔

"ناظرین! مجھے معاف کیجئے گا، ان مکانوں کے دیکھنے سے مرا دل ایسا

بے قابو ہے، کہ میں اُن کے حالات بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں بلکہ جو شخص ان درباروں کی ہسٹری اور قلعہ کی جاگرفی سے ماہر ہے، وہ کیا ممکن ہے ان کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو نہ رو دے، اس کا دل بے چین نہ ہو جائے اس کے بدن پر رونگٹے کھڑے نہ ہو جائیں اس کی آنکھوں کے سامنے خدا کی سچی عظمت و ہیبت نمودار نہ ہو جائے، دنیا کے فانی ہونے کا پردہ نہ اٹھ جائے، ذرا تھوڑی دیر کے واسطے آپ حدیقۃ الاقالیم میں محمد شاہی دربار کا سماں دیکھ لیجئے، پھر عالم شاہی دربار کا تنزل ملاحظہ فرمائیے، پھر ان ٹوٹی پھوٹی دیواروں میں کروفر شہنشائی کے آثار دیکھئے، اللہ اللہ ولا موجود الا اللہ

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

اب نہ وہ زمانہ ہے، نہ وہ لوگ ہیں، نہ بادشاہ ہیں، نہ ان کے درباری، یہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں باقی ہیں جو زبان حال سے مسلمانوں کے اقبال و ادبار ترقی و تنزلی کا بیان کر رہی ہیں، بڑا سنگدل ہے وہ شخص جو ان کو دیکھ کر رُو نہ اٹھے، بڑا قاسی القلب ہے وہ مرد جوان کو دیکھ کر متاثر نہ ہو، بڑا بے حمیت ہے وہ مسلمان جو مسلمانوں کے اقبال و ادبار کی ان حقیقی تصویروں کو دیکھ کر خاموش رہے، بڑا بے عزت ہے وہ نیچری جو کارخانۂ قدرت کی ان نیرنگیوں کو دیکھ کر اپنے عقیدہ پر نادم نہ ہو۔"

دلی جو علم و ثقافت کا مرکز علماء و مشائخ کا گہوارہ اور فن و ادب کا سرچشمہ تھا، اس کی اس عظمت رفتہ کو یاد کر کے دلی کو خطاب کرتے ہیں۔

"اے خاک پاک دلی تجھ میں سیکڑوں خانقاہیں اور مدرسے تھے، ان بزرگوں کو تو ہی نے اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، جن کی جوتیوں کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے، ہائے دلی! یہ تیرا مرثیہ نہیں ہے قوم کا مرثیہ ہے، اے ہماری شامت اعمال کی بربادشدہ دلی کیا پھر ہم تیرا پچھلا جاہ و جلال دیکھ سکتے ہیں، ہم میں وہ فاروقی جلادت، خالدی جرأت، قومی اتفاق، اسلامی جوش، اسلامی ہمدردی

اب کہاں سے آسکتی ہے، ان میں تہوّر تھا، ہم میں جبن ہے، ان میں جرأت تھی، ہم میں نامردی ہے، ان میں قوی اتفاق تھا، ہم میں نفاق، وہ پر جوش تھے ہم خاموش ان میں انسانی ہمدردی تھی، ہم میں بے دردی، وہ دین و دنیا کو توام سمجھتے تھے، ہم برہم وہ غیور تھے، ہم بے غیرت، ان میں فخر نہ تھا، ہم میں کبر ہے۔"

مولانا کا سفرنامہ محض ایک روداد سفر اور واقعات نویسی کا ایک مرقع نہیں کہ قاری عہد ماضی کا لطف لینے لگتا ہے، اور اسے بدلی ہوئی دنیا کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس کے اندر علمی و تاریخی معلومات کے ساتھ جوش و جذبہ اور اپنے اسلاف کی عظمت پیدا ہوتی ہے اور یہ بات اسے کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

مولانا کسی بھی تبدیلی اور انقلاب کے لیے جو قوم و ملّت کے لیے ناگزیر ہو تعلیم و ثقافت کو اہم سبب گردانتے تھے، اور تعلیم کے لیے بھی صحیح اثرات اسی وقت مرتب ہوتے ہیں، جب نصاب تعلیم زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو۔

نصاب تعلیم میں ہمیشہ وقت کے اعتبار سے تغیرات ہوتے رہے ہیں، ہندوستان کے نصاب درس میں بھی بڑے تغیر کی ضرورت تھی کیونکہ حالات نئی کروٹ لے رہے تھے، اور ویسے علماء تیار کرنے کی ضرورت تھی، جن کی نظر حالات و زمانہ کے تغیرات اور اس کے مطالبات پر ہو، چنانچہ آپ نے اس کا بھی تفصیلی جائزہ لیا، اور ارباب علم و فن کے سامنے اپنی آواز پہونچائی جو ان کے فکر و مطالعہ کا نتیجہ اور دل کی آواز تھی، اور یہی سبب ان کی ندوہ کی تحریک سے طبعی مناسبت اور وابستگی کا تھا جس کا آغاز ہی اصلاح و ترقی نصاب کے کام سے ہوا تھا، وہ کہتے ہیں:۔

"افسوس ہے کہ ہندوستان کی علمی تاریخ نہایت تاریکی میں ہے، ہم صحیح طور پر اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ وقتاً فوقتاً نصاب درس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں، تاریخ سے اسی قدر سراغ ملتا ہے کہ اس سرزمین میں فاتحانِ ہند کے ساتھ ساتھ علم آیا تھا، اور جو تبدیلیاں عراق و ماوراء النہر میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں، اس

کا اثر یہاں کے نصاب پر بھی پڑتا تھا، سب سے پہلے سندھ اور ملتان کے ریگستانوں میں علم کے ذرّے چمکے اور ان کی جگمگاہٹ اتنی بڑھتی گئی کہ رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں ان کی روشنی پھیل گئی۔"

مغل دور کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد حکومت میں میر زاہد کا ستارۂ اقبال چمکا اور ان کی موشگافیوں نے تاج فضیلت میں چار چاند لگا دیئے گویا درس نظامیہ کی بنیاد انھیں کے پرزور ہاتھوں کی ڈالی ہوئی ہے انھیں کے سلسلہ میں قاضی مبارک اور شاہ ولی اللہ کا خاندان تھا۔"

درس نظامی جس کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، اور جس کے بانی ملّا نظام الدّین فرنگی محلی ہیں، لوگوں نے دانتوں تلے ایسا دبایا کہ جیسے کتاب و سنّت کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دیا گیا، اس کی خصوصیات اپنی جگہ مگر طریقہ تعلیم کے بدلاؤ کے ساتھ نصاب درس بھی تغیر کا سخت محتاج ہوتا ہے، مولانا کے اس نصاب درس میں اِمعان نظر اور قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، چنانچہ جو ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے پورے شوق اور جانفشانی سے یہ علم حاصل کرتے ہیں وہ تو بڑے باکمال ہوتے ہیں، مولانا لکھتے ہیں:۔

"مروّجہ نصاب درس درس نظامی کی بگڑی ہوئی صورت ہے، ایسی ایسی کتابیں اس میں داخل ہو گئیں جن کو ہم اگر کہنا چاہیں تو صحیح طور پر "ناخواندہ مہمان یا سبزۂ خودرو" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔"

اس طرح مولانا کو ہر اس مرض کے ازالہ کی فکر تھی، اور ہر اس کام میں شرکت و تعاون کے لیے تیار تھے، جس سے مسلم قوم اٹھے، اور اس کی عظمت و اقبال واپس آئے، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے سورت میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی، اور دعوت سخن بھی، مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کا یہ ارشاد میری افتاد طبیعت کے خلاف تھا، مگر کچھ اس طور پر فرمایا تھا کہ

میرے زخم کہن تازہ ہو گئے، میں نے حکم کی تعمیل کی۔"

اس طرح مولانا نے گجرات کی ایک علمی دور کی ایسی تاریخ مرتب کی جو اہل گجرات کے لیے ایک نئی چیز اور پورے ملک کے لیے ایک انکشاف تھا، اس علمی کاوش کو آپ اہل ملک کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اپنا اہم مقصد بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"مقصود یہ ہے کہ ہم سب عموماً اور باشندگان گجرات خصوصاً اس کو پڑھ کر غور کریں کہ ایک زمانہ میں انھوں نے ملک اور علم و ہنر کی کیسی خدمت کی ہے، اور اب ان کی کیا حالت ہے۔"

اپنے اس اہم علمی و قومی خدمت کی اہمیت و وقعت کو بھی صاف طور پر بیان کر دیتے ہیں تاکہ تفریحاً یہاں سے گذرا نہ جائے کہ یہ ایک پیغام اور راہ عمل ہے۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں:۔

"کسی نے سچ کہا ہے کہ رہنمایان مذہب کی سحر انگیز تقریروں کے بعد کسی قوم کے مردہ دلوں میں جوش پیدا کرنے اور ہمت بڑھانے کا اگر کوئی عمدہ ذریعہ ہے تو وہ تاریخ ہے، تاریخ ہی کے ذریعہ گذشتہ اور موجودہ زمانہ میں موازنہ کرنے کا بہتر موقع مل سکتا ہے اور اگر ہمارے حواس درست ہوں تو ہم اس بات پر غور کر کے اچھے نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں، کہ گذشتہ دور میں ہم میں وہ کون سی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے ہم نے عروج و اقبال کے مدارج طے کئے تھے، اور اب ہم میں کون سی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں، جن کی وجہ سے نکبت و ادبار کے قعر مذلت میں جا پڑے ہیں، یوں تو مسلمانوں کی عظمت و اقبال کی داستانیں اُن کے فضل و کمال سے ہر جگہ وابستہ ہیں، اور تاریخ کا ہر صفحہ ہمارے واسطے سرمایۂ عبرت ہے، لیکن اگر دور گذشتہ کی تاریخ میں سے گجرات، بیجاپور، گول کنڈہ، مانڈو، برہان پور، اور جونپور کی تاریخ کو ہم بغور مطالعہ کریں تو بہت کافی مواد ہم کو ایسا مل سکتا ہے کہ اس کو سرمۂ بصیرت بنائیں، ورنہ ضرورت اس بات کی ہے کہ رزم و بزم کے افسانوں میں سے ہم ان بکھرے ہوئے موتیوں کو تلاش کریں جن سے کحل الجواہر تیار

ہو سکتا ہے۔"

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانیؒ نے اس علمی تاریخی کاوش کو صرف پسند ہی نہیں کیا بلکہ مؤرخانہ اور ادیبانہ حیثیت سے قابل داد قرار دیا، اور کہا:۔

"یہ مولویوں کے طبقے کی ایک دلکش صدا ہے جن کی نسبت جدید خیالات بدمذاق کا فیصلہ صادر فرما چکے ہیں، دیکھنا ہے کہ جدید خیالات خود اپنے تاریخی مذاق کی خوبی کا ثبوت کا ثبوت کب پیش کریں گے۔"

مولانا چونکہ ایک بڑے مؤرخ، ادیب و نقاد کے ساتھ حساس ضمیر رکھتے تھے، چنانچہ ان کے اسی جذبۂ غیرت و حمیت نے تاریخ شعر و شاعری میں محمد حسین آزاد کی آبِ حیات جیسی بلند پایہ تصنیف کے ہوتے ہوئے گلِ رعنا تصنیف کرائی، جس میں انھوں نے آزاد کی بے اعتدالیوں، غلط فہمیوں اور بعض بلند پایہ اسلامی الذہن شعراء کو صحیح جگہ نہ دینے بلکہ مقام بگاڑنے پر ضرب لگائی اور تنقید کی، اسی کے ساتھ شعر کی اس صنف کا بڑا ذخیرہ سامنے لائے جس سے مسلمانوں کا جذبۂ دینی بیدار ہو، اور یہ واضح کیا کہ شعر و ادب محض تفریح و تسکین کا سامان نہیں ہے بلکہ یہ اسلامی روح پیدا کرنے اور ایمانی جذبہ پیدا کرنے کا اہم ذریعہ ہے، اور اس کی اصل غایت یہی ہے اور تبھی اس کی قدر و قیمت ہے۔

مولانا کی یہ بڑی اسلامی اور ادبی خدمت کہی جائے گی کہ ادب و شعر کے علمبردار اور بلند پایہ سخن شناس خاص طور پر مومن خاں مومنؒ اور مرزا مظہر جانِ جاناںؒ وغیرہ کے کلام کے سلسلہ میں "آبِ حیات" میں جو بے رخی برتی گئی تھی اور ان کی صاف کردار کی شخصیت کو علمی یا عدم مناسبت کی وجہ سے داغدار کیا گیا تھا، حکیم سید عبدالحی صاحب نے بے داغ کر کے صاف تصویر پیش کی، اور آزاد کے اس طریقہ پر سخت تنقید کی جن سے عقیدت و مناسبت رہی ان کے حالات اور کمالات شعری کو بڑی شیفتگی اور جوش و خروش سے پیش کیا اور جن سے انھیں انشراح نہ تھا اور تعلق میں کمی تھی، ان کا ذکر بادل نخواستہ کیا، یا سرے سے گول ہی کر گئے۔ جو ایک نقاد فن اور شعر و ادب کی تاریخ بیان کرنے والے کو کہیں سے زیب نہیں دیتا۔

مولانا نے زندگی کے مقصد کو سمجھا اور دوسروں کو سمجھانے کی پوری کوشش کی، جس کے لیے انھوں نے سادہ مگر پرشکوہ انداز بیان اپنایا، جو طاقت ور بھی ہے اور مؤثر بھی، اور اپنے ادبی و تاریخی مذاق سے کام لیتے ہوئے اخلاق عالی سے آراستہ ہو کر مثالی معاشرہ قائم کرنے اور نمونے کی زندگی کو اختیار کرنے کا سبق دیا، جس کے لیے اسلامی روح اور علم و ثقافت کو اہم ذریعہ قرار دیا۔

مولانا کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، آٹھ جلدوں میں نزہۃ الخواطر عربی زبان میں لکھی جو ہندوستان کے علماء و فضلاء کے متعلق ایک انسائیکلو پیڈیا ہے، جس کو پڑھ کر یہ اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام نے ایک خطہ میں ایسی متنوع اور نابغہ روزگار شخصیتیں پیدا کیں تو دوسرے ملکوں کا کیا حال ہوگا۔ اور اس کے اندر ہر زمانہ میں ایسی عبقری شخصیتیں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اسلام ایک ابدی اور عالمی مذہب ہے، اس کے علاوہ "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند"، اور "الھند فی العھد الاسلامی"، جیسی معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کر کے مسلمانوں کے اندر علمی ثقافتی اور تمدنی سرمایہ کے حصول کا جذبہ پیدا کیا اور عالم اسلام کو ہندوستان کی علمی و دینی خدمات سے واقف کرایا، اور حدیث کے ذریعہ مسلمانوں کو اسلامی تہذیب و اخلاق اپنانے کی دعوت دی اس لیے کہ اس وقت مغربی تمدن زور پکڑ رہا تھا، اور مغربی رنگ میں لوگ رنگے جا رہے تھے، اس طرح انھوں نے اپنی تحریروں اور تعلیمات سے فکری الحاد اور تہذیبی ارتداد کی زبردست لہروں کے سامنے طاقت ور پشتہ قائم کیا، اور اپنی تعلیم پر فخر اور تعلیم و ثقافت پر اعتماد پیدا کیا۔

یہ صرف ان کی مختصر سی مدت حیات کے تابندہ نقوش اور سنہرے کارنامے ہیں جو ۵۳ سال پر محیط تھی مگر اس کے ساتھ وہ اپنے پیچھے دنیا کے لیے آفتاب و مہتاب بھی دو صاحبزادوں کی شکل میں چھوڑ گئے، بڑے صاحبزادے مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء (متوفی ۱۹۶۱ء) تھے جو قدیم و جدید دونوں علوم کے جامع تھے اور بہترین مربی تھے جن کی حسن تربیت اور اخلاص کا نتیجہ ہے کہ چھوٹے صاحبزادہ مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کے علوم و معارف سے آج دنیا فیض اٹھا رہی ہے، اور جن کی فکر و بصیرت جہد و عمل اور سوز و گداز کے اثرات عرب و عجم پر نمایاں ہیں، متعنا اللہ بطول حیاتہ۔

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی

مولانا مناظر احسن گیلانی کی ادبی و علمی خدمات

اٹھارہویں صدی کے آخری عشرہ میں ضلع پٹنہ کی خاک سے جو برگزیدہ شخصیتیں اٹھیں اور علماء و مفکرین اور ادباء و شعراء کی جو جماعت تیار ہوئی ان میں حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی ذات گرامی اپنے علم و فضل، ذکاوت و ذہانت، ایمانی فراست باطنی سوز و گداز اور وسیع النظری و فکر مندی میں ممتاز تھی، وہ ایک بالغ نظر عالم، حقیقت پسند و باخبر مؤرخ، نکتہ آفریں مفسر، باعمل محدث و فقیہہ، سیال قلم مصنف، سحر بیان مقرر اور عہد حاضر کے نبض شناس متکلم تھے۔ وہ اپنے عہد کے اسلام اور مسلمانوں کی اس صورت حال پر جو روبہ زوال تھی نہ صرف ماتم کناں اور مضطرب و بے چین رہنے والوں میں تھے بلکہ اس صورت حال کو بدلنے اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لیے عملی جدوجہد کرنے والوں میں تھے اپنے چالیس سالہ عہد خدمت کے دوران انھوں نے دیوبند کے دارالعلوم سے لے کر حیدرآباد کے جامعہ عثمانیہ تک ہندستان کے معروف و موقر ماہناموں، القاسم الرشید، دارالعلوم، معارف، برہان، ترجمان القرآن اور الفرقان وغیرہ میں سیکڑوں مضامین و مقالات لکھے اور تاریخ، تفسیر حدیث، فقہ، معاشیات، سیرت اور ادب وغیرہ موضوعات پر دسیوں کتاب تصنیف کیں اور اسلام کی حمایت و نصرت اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے شکوک و شبہات کے ازالہ کا جو عظیم و جلیل القدر کام انجام دیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا گیلانی کی کتاب "تدوین حدیث" کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

"اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جو دستہ آگے بڑھا اس کے ہراول دستہ میں ہمارے دوست، مناظر اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہ) کا نام نامی ہے جن کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ زنی کا کام دیتی ہے۔ وہ ہر سال اور سال کے مختلف حصوں میں اپنی تحقیقات علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے ہیں اور خصوصاً اپنے توسیعی خطبات اور اپنے تلامذہ کے امتحانی مقالات کے پردہ میں علم اور دین کی ایسی خدمتیں انجام دے رہے ہیں جو سارے مسلمانوں کی تحسین و شکریہ کے مستحق ہیں۔" (مقدمہ تدوین حدیث ف)

مولانا گیلانی ایک صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز تھے، انھوں نے اپنے پرجوش و سیال قلم سے اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی جو عظیم خدمت انجام دی اس کا جائزہ لینے سے پہلے ذرا دیر رک کر یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ اسلام و مسلمانوں کے زوال اور اسلامی نشأۃ ثانیہ سے کیا مراد ہے۔ تاکہ مفکر گیلانی کی عظیم علمی و فکری کاوشوں کو سمجھنے میں مدد ملے۔ مولانا گیلانی ایک وسیع النظر مؤرخ اور روشن خیال و باخبر عالم دین تھے، ان کی نظر میں یہ بات عیاں تھی کہ کسی قوم کی شکست و زوال کا سبب علمی اور اخلاقی و فکری میدان میں اس کی زوال پذیری ہوتی ہے، اس کے بعد اس پر کسی دوسری قوم کو سیاسی تفوق و برتری حاصل ہوتی ہے، انھوں نے اسے محسوس کیا تھا کہ مغرب نے اٹھارہویں صدی میں علم و عمل اور سائنسی اکتشافات میں جب برتری حاصل کی اور علم کے تمام شعبوں میں مسلمانوں سے آگے بڑھ گیا۔ تو مسلم ممالک میں اس کے لیے داخلہ و غلبہ آسان ہو گیا، نتیجتہً نہ صرف اس نے مشرق و مغرب کے خشکی و تری کے حصہ پر اپنے جھنڈے گاڑے بلکہ ایشیا و افریقہ اور یورپ و آسٹریلیا کے بیشتر ممالک میں اپنی تہذیب و ثقافت کو بھی پھیلایا اور جو لوگ ان کے راستہ میں حائل ہوئے ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا اور زیر فرماں کر لیا۔ ان مغربی اقوام کے سیاسی و ثقافتی عزائم کا براہ راست شکار بننے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ کیونکہ

اس وقت یورپ کے باہر اکثر آباد دنیا مسلمانوں کے زیر اثر تھی اور طاقت اقتدار و ذہنی قیادت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے یورپی اقوام نے جب غلبہ حاصل کیا تو مسلمانوں کو ان کی عظمتوں سے محروم کر کے ایک مغلوب و پسماندہ قوم بنا دیا۔ مسلمانوں میں علمی شعور کی کمی تو آ ہی گئی تھی۔ ایمانی قوت سے بھی ان کو محروم کر دینا چاہا۔ اور جو ایمانی رمق ایمان باللہ، ایمان بالقرآن اور محبت رسولؐ کی شکل میں باقی تھی۔ اس کو کاٹ دینے کے لیے ذات الٰہی، قرآن وسنت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے چاروں طرف مستشرقین، عیسائی مبلغین اور فلاسفہ کے ذریعہ اوہام و مزعومات کا ایک ہالہ تیار کیا جس کے جال میں پھنس کر مسلمان اپنی اس بچی ہوئی ایمانی قوت سے بھی محروم ہو جائیں۔ مغربی اقوام نے ایشیا و افریقہ اور یورپی حصہ کے تمام مسلم ممالک میں زبردست یورش کی اور اس سے مسلمانوں میں دینی، ایمانی و فکری اور اخلاقی عمومی تنزلی پیدا ہوئی۔ جو اسلام کی گزشتہ بارہ صدیوں میں کبھی پیدا نہ ہوئی تھی، اس صورت حال سے پورے عالم اسلام میں جو طبقہ مضطرب و بے چین ہوا اس میں علماء ادباء اور صوفیہ وغیرہ تھے، انھوں نے مسلمانوں میں کھوئے ہوئے شعور کو واپس لانے، ذہن کو بیدار کرنے، ایمانی رشتہ کو نئے سرے سے مضبوط کرنے اور اپنی کھوئی ہوئی طاقت و اقتدار کو بحال کرنے کے لیے فکری انقلاب اور ذہنی و علمی بیداری لانے کا جو کام کیا اسے ہم اسلامی و ادبی اصطلاح میں نشأۃ ثانیہ یا فقہ و حدیث کی خاص اصطلاح میں احیاء اسلام و تجدید دین سے تعبیر کرتے ہیں۔

احیاء اسلام کے لیے جد و جہد کرنے والوں میں مولانا گیلانی صفحہ اول کے ادیب و مصنف ہیں، ان کی ذات عشق رسولؐ میں ڈوبی ہوئی تھی ۱۹۳۶ء میں انھوں نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر "النبی الخاتم" کے نام سے کتاب لکھی جو اپنی اثر انگیزی اور ادبیت میں جواب نہیں رکھتی۔ انھوں نے تاریخی واقعات کو دلفریبی بیان کے ساتھ اس طرح قلم بند کیا ہے کہ ایک بار کتاب اٹھائیے تو بغیر ختم کیے دم لینے کو جی نہیں چاہتا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے صحیح لکھا ہے "میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبویؐ پر

رحمۃ للعالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشا پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے" وہ مزید لکھتے ہیں۔

کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے، صحف سماوی کا انداز بیان خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی و وارفتگی، عقل و جذب کی لطیف آمیزش، حسب عادت معمولی معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں اور اس سرعت و کثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے۔

"دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار"

حضرت مولانا گیلانی نے پوری کتاب اپنے منفرد طرز و اسلوب میں لکھی ہے، وہ شروع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یوں آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) کہ بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے، لیکن کیا کیجئے کہ ان میں جو بھی آیا جانے ہی کے لیے آیا، پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لیے آیا، وہی جو اگنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے سب جانتے ہیں اور سبھوں کو جاننا بھی چاہیئے کہ جنھیں کتاب دی گئی اور جو نبوت کے ساتھ کھڑے کیے گئے، برگزیدوں کے اس پاک گروہ میں اس کا استحقاق اسی کو ہے اس کے سوا کس کو ہو سکتا ہے۔

اور پھر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۶۳ سالہ زندگی کی سیرت مکمل کی ہے تو کتاب کا اختتام اپنے دور کے حالات اور مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اختیار کرنے اور قوت عشق پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جب مسلمان اپنی نگرانی دوسروں کے سپرد کر کے رسول علیہ السلام کی نگرانی سے اس وقت محروم ہیں۔ اس زمانہ میں بھی اسلام کے غلبہ کا یہ حال

ہے تو کیا حال ہوگا، جب دنیا کے نگراں بن کر پھر رسول کی نگرانی کی سعادت مسلمان حاصل کرلیں گے۔ کچھ نہیں، کوئی کام نہیں جب تک اصل کام نہ ہوگا، کسی کام میں کوئی برکت نہ ہوگی، بہت آرام لے چکے تھکن مٹ چکی، کام بہت باقی ہے، ہوتا کہ چونکنے والے چونکتے اور درا کی اس بانگ پر چل پڑتے

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کردے
وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

(حیدرآباد دکن ۱۶ اپریل ۳۶ھ)

مولانا گیلانی شاعر بھی تھے اور اردو، ہندی، فارسی اور عربی چاروں زبانوں میں انھوں نے اشعار کہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے انھیں جو عشق تھا وہ نعت نبوی میں ظاہر ہوا۔ انھوں نے کئی نعتیں کہیں جو بہت مشہور ہوئیں۔ بہار کی مگھی ہندی زبان میں ان کی نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پیارے محمد جگ کے سجن تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن کبھیو کرہیو تو درشن
جیا کھنڑے دلوا ترسے
کر پا کے بدرا کہیا برسے
تمری ڈوریا کیسے چھوڑوں تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں

وہ نعت بڑے ترنم کے ساتھ پڑھتے، خود بھی روتے دوسروں کو بھی رلاتے تھے، اس طرح انھوں نے نثر اور نظم دونوں طریقہ سے دلوں کو رسول اللہؐ کی محبت سے آشنا کیا۔

مولانا گیلانی مفسر تھے اور اپنی تفسیری نکتہ سنجیوں اور نتائج آفرینی میں ممتاز تھے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہما سے مستفید تھے،

علامہ فراہی کے تو ممتاز شاگرد تھے اور تفہیم قرآن کے سلسلہ میں ان دونوں بزرگوں نے جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا تھا اس کے معترف اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں میں تھے، وہ خود لکھتے ہیں۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا ولی اللہی تجدید کے بعد ہندستان نے اپنی نشأۃ ثانیہ میں جو کام اس سلسلہ میں انجام دیا ہے میرا اشارہ حضرت الاستاد مولانا حمید الدین الفراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر نظام الفرقان کی طرف ہے، جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی قرآن و بائبل کے تعلقات اور ادبی مباحث) کے سوا سب سے بڑی اور مشترک خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے کہ انھوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط ہی اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔

(مسلمانوں کا ہندستان میں نظام تعلیم و تربیت ص ۲۸۰)

مولانا گیلانی نے تفسیری کتابوں میں سورہ کہف کی تفسیر چھوڑی ہے اس کے علاوہ تدوین قرآن پر کتاب تحریر فرمائی ہے جس میں قرآن کے نزول اور اس کی حفاظت اور کتاب وغیرہ سے متعلق متجددین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے، اس کا ایک خلاصہ مختصر رسالہ کی شکل میں ان کے شاگرد جناب غلام ربانی صاحب نے اسی نام سے شائع کیا ہے۔ مولانا گیلانی اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس حال میں بنی نوع انسانی کے لیے آسمانی دستور اور الٰہی قانون کی آخری شکل یعنی قرآن مجید کو دنیا میں چھوڑ کر تشریف لے گئے من وعن، ہو بہو سر مو تفاوت کے بغیر یہ خدائی صحیفہ آج بھی دنیا میں موجود ہے دل تو یہی چاہتا ہے کہ بداندیشی کا جذبہ کبھی نہ ابھرے لیکن شیطان نے اگر اس سوال کو چھیڑ دیا تو اس وقت آپ کو ان چند اوراق میں وہ سب کچھ مل

جائے گا جو شاید بڑے بڑے کتب خانوں کے کتابی ذخیروں میں بھی نہیں مل سکتا اور وقت پر وہ تریاق انہی اوراق سے میسر آئے گا۔ اسلام پر نازک ترین وقت کا خطرہ سامنے آگیا ہے اس نازک ترین گھڑی میں ثنویت کو رد کرتے ہوئے یہ مختصر رسالہ نمبر انشاء اللہ کافی کار آمد ثابت ہوگا۔

(تدوین قرآن)

مولانا گیلانی ادیب تھے اور ان کی کوئی کتاب ادبی چاشنی اور جدید زبان و اسلوب بیان سے خالی نہیں ہے۔ تدوین قرآن کے ساتھ انھوں نے تدوین حدیث کے نام سے ضخیم کتاب لکھی اور انکار حدیث کے فتنہ پر کاری ضرب لگائی اور ان تمام شکوک و شبہات کو بیخ و بُن سے اکھیڑ کر رکھ دیا جو اہل قرآن یا مستشرقین کی طرف سے پیدا کیے گئے تھے۔ کتاب اٹھائیے تو حدیث سے صحابہ کی شیفتگی، احادیث کے حفظ و یاد اور کتابت و تحریر کے سیکڑوں واقعات اس ترتیب سے پیش کیے ہیں کہ قاری تاریخی واقعات اور ان کے زور بیان کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح فقہ اسلامی کے تعلق سے جو شبہات پیدا ہو گئے تھے، تدوین فقہ اور امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی کے نام سے جو کتاب تحریر کی ان کے ذریعہ اصل حقیقت کو بے نقاب کر کے شبہات کے جالے کو تار تار کر ڈالا مولانا گیلانی ایک مؤرخ اور ماہر تعلیم تھے، انھوں نے تعلیمی و تاریخی جہت سے مسلمانوں کو اوپر اٹھانے کی جو تحریک چلائی، اس کا شاہکار انکی تصنیف ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت، جو دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے انھوں نے عصری و دینی نظریہ تعلیم کی وحدت تعلیم کا نظریہ پیش کیا ہے، وہ خود لکھتے ہیں:

> ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام "حکومت متسلطہ" کے قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں، اس کی دوئی اور ثنویت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کر لیا جائے۔ اس لیے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے، نظریہ وحدت نظام تعلیم" رکھا ہے۔ (نظام تعلیم و تربیت ص ۵-۶)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس میں منتقل کر دیا جائے جہاں حکومت نے جدید

علوم وفنون کی تعلیم کا انتظام کر رکھا ہے چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں بلکہ انگریزی مدارس کو چاہتا ہوں کہ مسلمان بنا لیا جائے۔ رہے عربی مدارس سو عرض کر چکا ہوں کہ غیر مرکزی مدارس کو قرآن کی با معنی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم وفنون کا ہائی اسکول مسلمانوں کے لیے بنا لیا جائے اور اسلامی علوم کی تکمیل تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس کو قرار دیا جائے۔

تعلیم اور ماہرین تعلیم کے تذکروں میں انھوں نے "دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" کے نام سے کتاب لکھی جو اپنی ادبیت، سحر بیانی اور بزرگان دیوبند کی تعلیمی تحریک اور ان کی خوبیوں کے بیان میں کہا جا سکتا ہے کہ بے مثال ہے، مولانا گیلانی نے دیوبند جانے سے پہلے ٹونک کی معقول ومنطقی درس گاہ میں تعلیم پائی۔ دیوبند میں حدیث شریف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن علیہ الرحمۃ ودوسرے بزرگان دیوبند سے پڑھی مگر حدیث کے درس میں ہونے یہ لگا کہ،

> جوں ہی حدیث شروع ہوتی اپنے ذہن میں الجھنوں کے طوفان کو پاتا۔ طرح طرح کے شبہات ہر حدیث میں ہوتے بدگمانیوں کی ایک آگ تھی جو معلوم ہوتا تھا میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے دو گھنٹہ تک عموماً ترمذی شریف کا یہ درس ہوتا تھا اور ایک سیاہ سینہ ان دونوں گھنٹوں کے اندر اپنی شکوک وشبہات کی آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا اور جب یہ کیفیت ہفتوں رہی تو شیخ الہند رح سے اس کا ذکر کیا انھوں نے سن کر فرمایا مولوی صاحب اتنے پریشان کیوں ہیں، اپنا یہ حال آپ کے لیے اتنا ناگوار ہے تو یہ بے ایمانی نہیں آپ کے ایمان کی دلیل ہے! ایمان نہ ہوتا تو ان خیالات سے اتنے پریشان کیوں ہوتے۔

پھر انھوں نے مولانا گیلانی کے تعلیمی سفر کی روداد سن کر فرمایا جو کچھ آپ کھا پکا، نگلتے چلے گئے وہی سب کچھ باہر نکل رہے ہیں پریشان ہونے کی بات نہیں مولوی صاحب جاؤ اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا۔"

مولانا گیلانی نے دیوبند کی تعلیمی، دینی، اصلاحی اور سیاسی تحریک کو اپنی زندگی کی آخری کتاب "سوانح قاسمی" میں سمیٹ دیا ہے یہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم کی سوانح حیات ہے جو تین ضخیم جلدوں میں ہے، مولانا گیلانی کی تحریری و تصنیفی زندگی کا آغاز ماہنامہ "القاسم" کی ادارت سے ہوا تھا اور عجیب اتفاق ہے کہ زندگی کی آخری منزل سوانح قاسمی ثابت ہوئی۔ یہیں پہنچ کر قافلہ حیات لٹ گیا۔ ۱۸۹۲ء میں گیلان کی خاک سے اٹھے تھے اور ۵ جون ۱۹۵۶ء کو اسی مٹی میں آسودہ ہو گئے۔

مولانا گیلانی نے وفات سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے ۱۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو مناجات مقبول پر ایک تحریر لکھی ہے کہ یکایک سونے کے وقت رات کو قرآنی آیت،

اللّٰہُ یتوفی الاَنفُسَ حِینَ مَوتِھا وَالَّتِی لَم تَمُت فِی مَنامِھا فَیُمسِکُ الَّتِی قَضیٰ عَلَیھا المَوتَ وَیُرسِلُ الاُخریٰ اِلیٰ اَجَلٍ مُسَمًّی کا خیال آیا۔

عجیب بات ہے کہ آخر میں فراہی دیا گیا ان ذالک لایات لقوم یتفکرون مگر سمجھ میں نہیں آتا مسلمانوں میں "سکرات موت" کے متعلق طرح طرح کی روایتیں کیوں مشہور ہو گئی ہیں حالانکہ اس نص قطعی میں صاف طور پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ نیند جیسے آتی ہے موت بھی اسی طرح آتی ہے نیند آنے میں سونے والے کو تکلیف کب ہوتی ہے پھر موت میں تکلیف کا تصور عجیب ہے۔ ہمارے استاذ مولانا فراہی "سکرۃ الموت" کے لفظ سے نتیجہ نکالا کرتے تھے کہ عند الموت مرنے والے پر نشہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے حضرت تھانوی نے امام غزالی کی ان روایتوں کی تنقید کرائی تھی جن سے موت کے شدائد پر امام نے احیاء العلوم میں استدلال کیا ہے۔

مفتی نسیم احمد قاسمی

مولانا ابو المحاسن سجاد اور انکی خدمات

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد خاندانِ مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لیے بے نور ہو کر رہ گیا۔ ہندوستان کے سیاہ وسفید کے مالک انگریز بن گئے۔ انگریزی حکومت اقتدار کے نشہ میں مست بن کر ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھانے لگی ان کے شعائر، تہذیب وتمدن، مساجد و مدارس اور مقدس مقامات کی بے حرمتی کی جانے لگی، عیسائیت کی ترویج واشاعت اور تبلیغ کے لیے حکومت کی سربراہی میں عیسائی مشنریوں نے منصوبہ بند جدوجہد کا آغاز کیا، عیسائی پادریوں نے ملک کے طول وعرض میں اپنے جال پھیلا دیئے اور بہ جبر واکراہ مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ عیسائیت کی تیز وتند آندھی اسلام کے شجرۂ طوبیٰ کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکے گی اور اہل اسلام کے قدم صراط مستقیم سے ڈگمگا جائیں گے۔ مگر انہیں حالات میں اکابر اسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی جیسے اسلام کے جیالے میدان میں آئے۔ اور انھوں نے عیسائیت کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب پر بند باندھا۔ علماء کے اس مقدس گروہ میں ایک نمایاں نام ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد بہاری کا بھی ہے، جنھوں نے اپنے خطبات و مقالات کے ذریعہ اسلامی نشأۃ ثانیہ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ابوالمحاسن مولانا سجاد قدرت کی طرف سے ذہن ثاقب فکر رسا دل دردمند، مؤمنانہ فراست، قائدانہ صلاحیت، ملی مسائل ومشکلات کے حل اور پیچیدہ

ولا ینحل مسائل کی عقدہ کشائی کی بہترین صلاحیت سے نوازے گئے تھے، مولانا موصوف جس عہد میں پیدا ہوئے وہ عہد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے پُر آشوب اور ان کے وجود کے لیے خطرناک تھا۔ ایک طرف متحدہ ہندوستان سے مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہوا اور تقریباً مسلمانوں کے دور اقتدار کی ہزار سالہ تاریخ نے اپنے اوراق سمیٹ لیے دوسری طرف استعماری طاقتوں نے عالمِ اسلام کی امیدوں کے آخری مرکز مسلمانانِ عالم کے لیے سرمۂ چشم خلافت عثمانیہ کے دامنِ عظمت کو تار تار کر دیا۔ ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد کی شخصیت ہندوستانی مسلمانوں کے لیے درد کا درماں اور ان کے حق میں مسیحا بن کر ابھری۔ انھوں نے اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لیے ہمہ جہت اور منصوبہ بند کوششوں کا آغاز فرمایا مولانا موصوف کی مساعی جمیلہ کی اصلی محور و مرکز ہندوستان میں حکومت الٰہیہ علی منہاج النبوۃ کا قیام نہ تھا۔ اس کے لیے انھوں نے ہندوستان میں امارت شرعیہ کے قیام اور انتخاب امیر اور اسلامی قوانین کے نفاذ و اجراء کے لیے عملی اقدام کیا اور ایک حد تک جماعتی نظام کے قائم کرنے میں وہ کامیاب بھی رہے جس کا جیتا جاگتا نمونہ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ ہے جو اپنی پچھتر سالہ روشن خدمات کے لیے ملک و بیرون ملک میں مشہور و معروف ہے جس کے بارے میں مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا ارشاد عالی ہے۔" اگر مجھے کسی صوبہ پر رشک آتا ہے تو بہار پر، اور بہار پر رشک آتا ہے تو امارت شرعیہ کی وجہ سے۔" سب سے پہلے انھوں نے مدرسہ انوار العلوم گیا کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ۳۰ صفر ۱۳۳۶ھ ہجری میں بہار کے علماء و مشائخ اور زعمائے ملت کا اجتماع بلایا۔ اس اجتماع میں بہار کے گوشہ گوشہ سے علماء و مشائخ شریک ہوئے، مولانا نے ان کے سامنے ملک کے حالات رکھے اقامت دین اور قوانین الٰہی کے نفاذ و اجراء پر گفتگو فرمائی علماء و مشائخ کے شکوک و شبہات کا ازالہ فرمایا، اسی اجتماع میں "انجمن علمائے بہار" کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اس وقت مرکزی و صوبائی سطح پر مسلمانوں کی کوئی فعال و مؤثر تنظیم نہیں تھی۔ انجمن علمائے بہار کے قیام کے بعد آپ سراپا مجسم عمل بن گئے، ہندوستان کا

دورہ کیا، مدارس کے علماء اور خانقاہوں کے مشائخ سے ملے، دوران سفر خاندان فرنگی محل کے چشم و چراغ اور ہندوستان کے ممتاز عالم دین مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے خصوصی ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنے خیالات و جذبات اور عزائم تفصیل سے رکھے اور ان سے تعاون کی درخواست کی اس کے صرف ایک سال کے بعد مرکزی سطح پر خلافت کمیٹی اور "جمعیۃ علمائے ہند" کا قیام عمل میں آیا۔ دونوں کے قیام میں آپ پیش پیش رہے اور خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کے قیام کا فیصلہ جس مجلسوں میں کیا گیا آپ اس میں سرفہرست رہے خلافت کے نام پر پورے ملک میں نظم ملت کا چرچہ ہوا۔ امام المسلمین کی ضرورت پر پورے ملک کے علماء و مشائخ کے دستخط کے ساتھ فتویٰ شائع ہوا۔ جن پر خود مولانا نے چند تائیدی سطریں لکھ کر دستخط فرمایا۔ دوسری طرف جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ہندوستان میں قیام امارت شرعیہ اور انتخاب امیر کی ضرورت پر آپ نے زور دیا۔

(۱) جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید دہلوی نے مولانا سجاد سے اپنی پہلی ملاقات اور جمعیۃ علماء ہند کی تأسیس کا ذکر کرتے ہوئے جو تحریر قلم بند فرماتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ "مولانا سجاد کی ذات گرامی ہے جس نے علماء و مشائخ کو اس پر آمادہ کیا کہ انجمن علماء بہار کی طرح ہندوستان کے تمام علماء اور ارباب حل و عقد کی ایک نمائندہ جماعت تشکیل دی جائے جو مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کے حل میں اہم رول ادا کرے مولانا محمد سجاد نے دہلی میں منعقدہ علماء کے اجتماع میں علماء کے سامنے اپنے درد دل اور اضطراب قلب کو اس انداز سے رکھا کہ ہر آنکھ نمناک ہوگئی اور ہر دل متاثر ہوگیا اور علماء کا یہی اجتماع علماء ہند جیسی متحرک اور فعال جماعت کے قیام کا باعث بنا۔ مولانا احمد سعید دہلوی مولانا محمد سجاد کی اثر انگیز تقریر اور دل پذیر خطبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

مولانا مرحوم (محمد سجاد صاحب) سے سب سے پہلی ملاقات خلافت کانفرنس دہلی میں ـــــ ہوئی تھی، اس خلافت کانفرنس میں بعض اہل علم سے مشورہ کیا کہ

(۱) تاریخ امارت ص ۷۳

ہندوستان کے علماء کی تنظیم قائم ہونی چاہیئے، چنانچہ علماء کی ایک مختصر اور مخصوص جماعت کا اجتماع دہلی کے مشہور بزرگ سیّد حسن رسول نما کی درگاہ پر منعقد ہوا اس میں تمام حضرات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حضرت مولانا سجاد صاحب نے بھی اس جلسہ میں ایک مختصر تقریر فرمائی تھی اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا کے جذباتِ ایمانی کا ترجمان تھا۔ حاضرین کی تعداد گرچہ دس بارہ سے زیادہ لوگ پر مشتمل نہیں تھی لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس نے اثر قبول نہ کیا، اس جلسہ کا اثر تھا کہ جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی اور اس کا پہلا اجلاس امرت سر میں خلافت کانفرنس کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس کے پہلے اجلاس میں مولانا سجاد مرحوم شریک ہوئے اور انھوں نے اپنے خیالات کا پھر اعادہ کیا۔ اس اجلاس کے صدر مولانا عبدالباری تھے (۱)

حکومت الٰہیہ کا تصور

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے تصور حکومت الٰہیہ اس کے قیام کے لیے مولانا کے جدوجہد کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) ہندوستان کے ان چیدہ علماء متبحرین میں سے تھے جو ہندوستان کی متبرک سیاست میں حصّہ دار ہونے کے باوجود "حکومت الٰہیہ" کے اس نصب العین کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے جو ان کی جدوجہد کا حقیقی محور و مرکز تھا۔ (۲)

مولانا محمد سجاد علیہ الرحمۃ کا نظریہ یہ تھا کہ حکومت الٰہیہ کے بغیر اس کائنات میں نہ امن عام نصیب ہو سکتا ہے اور نہ ہی انسانی برادری میں اخوت عام کا سکہ رائج ہو سکتا ہے وہی ایک سیدھی اور روشن راہ ہے جو ہم کو اور دنیا کے ہر جاندار کو عالم گیر امن، ہمہ گیر اخوت اور اخلاق و کردار کی ہمہ گیر وسعت سے ہمکنار کرتی ہے، خود مولانا کے الفاظ میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) حیات سجاد (۲) مقدمہ حکومت الٰہیہ ص ۱۱

لیکن بلاشبہ ان قوانین کے نفاذ و تنفیذ اور اس کی خلاف ورزیوں کے انسداد کے لیے یا یوں کہا جائے کہ مومنت اور انسانیت کی استواری اور خوشگواری کے لیے جماعتی نظام اور اس کے قیام کی ضرورت بہر حال باقی رہے گی اور وہ انہیں اصولوں پر زیادہ مفید و مؤثر ہو سکتا ہے جن اصولوں پر خود اس پیغمبر نے خالق کی اصولی تعلیم و ہدایت کے ماتحت جماعتی نظام قائم کیا ہو اور اس کے فوائد مرتب کیے ہوں۔

مولانا موصوف اپنی زندگی کے مقصد وحید یعنی خلافت الٰہیہ اور نظام اسلامی کے خدوخال اور حکومت الٰہیہ کے مکمل نظام کو تحریری شکل میں امت کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کی ترتیب و تدوین کا آغاز فرمایا تھا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی اپنی حیات مستعار بسر کر کے ربّ کائنات سے جا ملے ہو صوف کی یہ غیر مکمل اور تمہیدی تحریر مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے قیمتی مقدمہ کے ساتھ حکومت الٰہیہ کے عنوان سے زیور طبع سے آراستہ ہوئی، مولانا نے اس کتاب میں سب سے پہلے قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی نظام حکومت اس وقت تک عادلانہ نظام اور عالم گیر امن کا پیغام ثابت نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ قانون کے مؤسس کی شخصیت اس کے اوصاف و اطوار روشن دن کی طرح سامنے نہ آجائے، مولانا نے تمہیدی کلمات میں اول قرآن کریم اور عقلی دلائل سے اس جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ جبکہ خالقِ کائنات نے اپنی ربوبیت کاملہ سے ہر شئی کی مادی تربیت کا سامان فراہم کیا اور استعدادات کے پیش نظر ان کے درجات میں ترقی عطا فرماتے ہیں۔ تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی شان ربوبیت کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس نے عقل و شعور، ادراک و احساس اور جذبات و روح کے حامل انسان کی روحانی تربیت اور نشو و نما کا کوئی سامان مہیا نہ فرمایا ہو اس ضمن میں اسلام کے نظام اجتماعی کی ضرورت پر عقلی بحث کر کے اس کی ضرورت و اہمیت کو واضح اور مدلّل کیا گیا ہے۔

مولانا موصوف کی نگاہ میں "اجتماعی نظام" کے برپا کرنے کی دو ہی صورتیں ممکن

ہیں۔ ایک یہ کہ افراد انسان اوران کی جماعتیں خود اس نظام کو ترتیب دیں، دوسرے یہ کہ انسان اور کائنات انسانی سے بالاتر ہستی (خداوند قدوس) اس نظام اجتماعی کو نازل فرمائے ..... پہلی صورت میں امن عام اور رضاء جمہور ناممکن الحصول ہے ایسا نظام تمام کائنات انسانی کے لیے مساوات اور عادلانہ ہمسری کا حامل کب رہ سکتا ہے۔ [1]

مولانا موصوف کی دیرینہ خواہش تھی کہ جماعتی نظام اور اس کے قواعد و ضوابط کی تفصیلات مرتب و مدون فرمادیں، چنانچہ اس کتاب کے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اب سوال یہ ہے کہ وہ جماعتی نظام کیا ہے۔ اور اس کے قواعد وضوابط کی تفصیلات کیا ہیں؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر انشاء اللہ دوسرے باب میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔ [2]

جمیعۃ علماء ہند کے اجلاس خصوصی منعقدہ ۱۶، ۱۷ جمادی الآخر ۱۳۴۳ھ کے صدارتی خطبہ میں آپ نے نظام اسلام اور امارت شرعیہ کا مختصر خاکہ بھی پیش فرمایا تھا۔ مگر افسوس کہ مولانا کی عمر نے وفا نہیں کی اور اس کی تکمیل سے پہلے ہی وہ رب حقیقی کے جوار رحمت میں جا پہونچے اور ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

امارتِ شرعیہ کا قیام

مولانا کی زندگی کا سب سے روشن اور عظیم کارنامہ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا قیام ہے۔ جو ہندوستان میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ ۱۹۱۹ء میں جمیعۃ علماء ہند کے قیام کے بعد مولانا موصوف جمیعۃ علماء کے پلیٹ فارم سے امارت فی الہند کے قیام اور انتخاب امیر کے لیے کوشاں رہے، مولانا کا خیال تھا کہ ہندوستان کی پوری مسلم آبادی کو ایک امیر کے ماتحت منظم و متحد کردیا جائے اور انہیں نظام شرعی کا پابند بنادیا جائے اس مقصد

---

[1] مقدمہ حکومت الٰہی۔ / ۱۵ [2] حکومت الٰہی ص ۱۳۶

کے لیے انھوں نے جمیعۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء دہلی جس کی صدارت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نے فرمائی تھی، اس اجلاس میں پورے ملک سے علماء و مشائخ اور قائدین ملت شریک ہوئے۔ آپ نے اس اجلاس میں امارت فی الہند کا مسئلہ پیش فرمایا، شیخ الہند نے اس تجویز کی بھرپور تائید کی، مولانا عبدالصمد رحمانی نے تاریخ امارت میں تحریر فرمایا ہے۔

"آپ (حضرت شیخ الہند) کا اصرار تھا کہ اس نمائندہ اجتماع میں جبکہ تمام ذمہ داران ملت اور ارباب حل وعقد جمع ہیں امیر الہند کا انتخاب کرلیا جائے اور میری چارپائی کو اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے جایا جائے پہلا شخص میں ہوں گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا" [1]

مگر افسوس مولانا کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ اور کچھ اسباب و حالات کی بناء پر "امارت فی الہند" کا معاملہ معرض التواء میں پڑ گیا۔

مولانا چونکہ عملی آدمی تھے۔ انھوں نے جب یہ محسوس کرلیا کہ "امارت فی الہند" کا قیام مشکل ہے تو انھوں نے بہار میں امارت شرعیہ کے قیام کی جدوجہد شروع کردی، تاکہ اس کا عملی نمونہ امت کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ اس غرض سے انھوں نے ۱۹۲۱ء میں جمیعۃ علماء بہار کی مجلس منتظمہ کا اجلاس پھلواری شریف میں منعقد کیا۔ اس میں طے کیا گیا کہ امارت شرعیہ کے قیام پر غور و فکر کرنے کے لیے صوبائی جمیعۃ کا اجلاس عام دربھنگہ میں منعقد کیا جائے۔ اور اس کی صدارت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کو دعوت دی جائے اس تجویز کے مطابق ۲۳، ۲۴ شعبان ۱۳۳۹ھ میں دربھنگہ میں اجلاس عام ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی علالت کی وجہ سے شریک اجلاس نہیں ہوسکے۔ اور اجلاس کی صدارت مولانا شاہ محی الدین پھلواروی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں امارت شرعیہ بہار کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لیے ۱۸، ۱۹ شوال ۱۳۳۹ھ کو

---

[1] تاریخ امارت ص ۱۵

پتھر کی مسجد پٹنہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں اجلاس ہوا، جس میں شرکاء کی تعداد پانچ سو سے زائد تھی۔ سو سے زیادہ علماء و مشائخ تھے۔ اس اجلاس میں اتفاق رائے سے مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی کو امیر شریعت اور مولانا محمد سجاد کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا۔

اس وقت سے لیکر آج تک امارت شرعیہ اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ و اجراء شعائر اسلام کے تحفظ اور مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مصروف عمل ہے، امارت شرعیہ مولانا موصوف کا ایسا روشن کارنامہ ہے جس کی ضرورت پورے ملک میں محسوس کی جارہی ہے۔

مولانا کا اسلوب

مولانا محمد سجاد ایک متبحر عالم دین، کامیاب مدرس، جلیل القدر مربی و روحانی پیشوا، و مصلح الامت اور عظیم دینی قائد تھے، ان کی زندگی کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ گفتار سے زیادہ کردار و عمل کے پیکر تھے۔ انہیں تصنیف و تالیف کے لیے سکون و اطمینان اور یکسوئی کا ماحول نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود ان کی تحریروں میں ادبی چاشنی، عبارت آرائی، شگفتگی، اور قلم کی روانی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے وقت کے صاحب طرز، انشاء پرداز اور مصنف تھے حکومت الہٰی کا مندرجہ ذیل اقتباس بار بار پڑھیئے اور سوچیئے۔ کہ مولانا کا قلم کیسا شگفتہ، انداز بیان کیسا سہل اور موثر اور ادب عالی کا کیسا شاہکار ہے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"اس کی وجہ تم سوچو اور دنیا کے تمام عقلاء سے پوچھو اس کی وجہ صرف یہی کہی جاسکتی ہے کہ آوازوں کے امتیاز اور عدم اشتباہ میں صرف خالق کے ارادہ اور تدبیر کو دخل ہے اس کے سوا کوئی دوسری وجہ نہیں ہوسکتی ہے۔ اگر نباتات کے پتوں اور پھولوں کو دیکھو تو تمہیں نظر آئے گا کہ ایک ہی پھول کے درخت کی ہر ایک پتی اور پھول میں مختلف رنگ، مختلف نقش و نگار ہیں جن کو دیکھ کر تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک اور لذت محسوس ہوتی ہے اور دل میں مسرور ہوتے مگر یہ تو سوچو کہ پودا ایک،

زمین ایک، زمین کی کھاد اور آب و ہوا ایک، ایسی وحدت و یکجہتی کے باوجود مختلف رنگ اور مختلف نقش و نگار کس طرح پیدا ہو گئے۔ مادیات جن سے پودوں کو غذا ملتی ہے اور جن سے وہ پرورش پاتے ہیں۔ ان میں نہ ارادہ ہے نہ شعور ہے کہ کچھ بھی کر سکیں چہ جائیکہ اس حسن ترتیب، وحسن وصنعت کے ساتھ کسی کام کو انجام دے سکیں پھر نیلے نیلے پیلے اودے سرخ اور گلاب رنگ ایک خاص تناسب سے ہری ہری ڈالیوں اور کلیوں میں کس طرح پیدا ہو گئے؟ (۱)

جمیعہ علماء ہند کے اجلاس خصوصی منعقدہ ۱۳۴۳ھ بمقام مرادآباد کے خطبۂ صدارت کی حسب ذیل عبارت بھی ایک ادبی شہ پارہ ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

"احکام شرعی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے نزدیک اقامت خلافت کے دو طریقے ہیں۔ اول راہ عزیمت ہے جو نہایت پرخطر ہے۔ لیکن کامیابی کی منزل تک جلد پہونچانے والی ہے مگر یہ راہ ان کے لیے مخصوص ہے جو ارباب عزائم ہوں، ہم جیسے ہندوستانی ضعفاء کو اس راہ سے کیا نسبت جن کی تمام عمریں صرف رخصت پر عمل کرنے میں گزری ہیں۔ اس لیے بحالت موجودہ اب صرف دوسری ہی راہ ہے کہ جس کو اختیار کر کے مسلمانان ہند اقامت خلافت کی سعی میں کافی حصہ لے کر کسی حد تک اپنے فرائض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ (۲)

طوالت کے خوف سے صرف نمونہ کے طور پر مولانا کی تحریر کے دو اقتباس پیش کیے گئے ہیں۔

۱۔ حکومت الٰہی / ۹۷ - ۹۶ ، ۲۔ خطبۂ صدارت / ۴۴ /

محمد الیاس ندوی بھٹکلی
استاذ جامعہ اسلامیہ بھٹکل

اسلامی نشاۃ ثانیہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی دامت برکاتہم کا حصہ

ماذا خسر العالم کی روشنی میں

موجودہ پندرہویں صدی ہجری کے بارے میں آثار و قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ یہ صدی اسلامی صدی ہوگی، پچھلی صدیوں کے مقابلہ میں اگرچہ مسلمانوں کے مسائل و مصائب میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ لیکن دوسری طرف عددی اور مادی اعتبار سے مسلمانوں نے سابقہ صدیوں کے مقابلہ میں غیر معمولی ترقی کی ہے، اس وقت اقوام متحدہ میں عالمی آبادی سے متعلق شعبہ کی رپورٹ کے مطابق روئے زمین پر بسنے والے ۱۶ ارب انسانوں میں مسلمان تقریباً ڈیڑھ ارب کے ساتھ پچیس فیصد کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ حالانکہ ابھی ۱۴۷ سال قبل ۱۸۵۰ء میں مسلمانوں کا جملہ عالمی تناسب بمشکل ۱۹ فیصد تھا۔ دنیا کے جملہ ۲۲۸ ممالک میں اس وقت ۵۵ مسلم ممالک ہیں۔ چالیس پینتالیس سال قبل تک ان میں سے ۱۶ ممالک فرانس، ۱۷ برطانیہ اور ۷ روس کے قبضہ میں تھے اور عالمی جغرافیہ میں پندرہ مسلم ممالک بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ رقبہ میں مسلمانوں کی ترقی کا حال بھی اس سے زیادہ ہی خوش کن ہے۔ ابھی انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں برصغیر میں مغلیہ سلطنت اور افریقہ کے اکثر مسلم ممالک کے زوال سے مسلمان صرف ۶۵ لاکھ کے قریب مربع کلومیٹر پر حاکم تھے جو دنیا کا ۵ فیصد سے بھی کم حصہ تھا لیکن اس وقت الحمد للہ ۱۹۹۷ء میں ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ مربع کلومیٹر سے بھی زائد رقبہ کے ساتھ پوری دنیا کے ۲۵ فیصد رقبہ پر مسلمان حکومت کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی سب سے بڑی صنعتی دولت پٹرول کے ۸۴ فیصد حصے مسلمانوں کے

قبضہ میں ہیں۔ یورپ وامریکہ میں اسلام کے شیدائیوں میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو رہا ہے۔ افریقی و ایشیائی ممالک کے مسلمانوں میں تعلیمی تناسب بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے غرض یہ کہ مجموعی طور پر پوری دنیا میں اس وقت اسلام ہی سب سے مقبول ترین مذہب کی شکل میں سامنے آگیا ہے۔

اسلام کی اس نشأۃ ثانیہ میں اللہ نے اپنے جن نیک ومقبول بندوں کو ذریعہ و وسیلہ بنایا ہے ان میں ایک نام اپنے نیک وصالح والدین کی دعائے نیم شبی کے زیر اثر خالص روحانی وعلمی ماحول میں پرورش پانے والے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی ذات گرامی کا ہے۔ جن کا شجرہ نسب بقول ماہر القادری اصلها ثابت وفرعها فی السّماء تؤتی اکلها کل حین باذن ربها کا مصداق ہے۔

اسلامی نشأۃ ثانیہ میں مولانا کے حصّہ کو ہم خطبات وتالیفات کے دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول الذکر کی بھی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ اوّل وہ دعوتی تقریریں اور عوامی مواعظ جن کے اندر نہ صرف پیغام عمل اور پیام فکر ہے بلکہ وہ ادب پاروں کے رنگا رنگ گلدستے بھی اور بقول شاہ حلیم عطا صاحب اس میں وہ علمی نکتے سننے کو ملتے ہیں جو علماء سلف کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اور بقول صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب جس میں فصاحت طلاقت لسانی کا رس گھولتی ہے۔ جس کو سن کر ملک کے مایہ ناز خطیب شورش کاشمیری کو بھی فردوس کی روشوں کا گمان ہوتا ہے۔ جہاں زبان تنوع حاصل کرتی ہے اور دماغ فکر ونظر کے جادوں پر ٹہلنے لگتا ہے۔ اور شورش صاحب اپنی کتاب فن خطابت میں مولانا کو ہندوستان کے حجازی خطیب کا نام دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جن تقاریر کو سن کر شیخ وقت حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلوی نے یوں فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ تقریریں لاکھوں کی تعداد میں عربی انگریزی اور اردو میں چھپیں اور ایک ہزار نسخوں کا میں خود پیشگی خریدار بنوں۔

دوسری قسم علمی وسیاسی سطح کے چوٹی کے لوگوں سے خصوصی وذاتی ملاقاتوں کے ذریعہ ان کو نظام مملکت صحیح اسلامی ودینی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی مولانا کی ترغیب ہے۔ جن میں والی حجاز شاہ فیصل مرحوم اور جنرل ضیاء شہید وغیرہ جیسے لوگ شامل ہیں۔

اسی طرح ہم مولانا کی تصنیفی خدمات کو بھی دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول دینی مدارس

واسلامی معاہد کے لیے دینی تعلیمی نصاب کی تیاری میں مولانا کی وہ غیر معمولی کوششیں ہیں جس میں بیک وقت بقول مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم زبان ودین کو اس طرح پیوست کر دیا گیا ہے۔ جس طرح گوشت اور ناخن کو اور جس کو مولانا عبدالماجد دریابادی نے بچوں کے علم کلام سے تعبیر کیا ہے اس میں سرفہرست قصص النبیین اور القراءۃ الراشدہ کے مختلف اجزاء کے علاوہ مختارات وغیرہ شامل ہیں اور جو اس وقت برصغیر سے زیادہ عربی وروسی مدارس وغیرہ میں داخل نصاب ہیں۔ اور جس میں انبیاء کے واقعات کی تشریحات کو صاحب فی ظلال القرآن نے ایمانی حقائق کی نقاب کشائی سے تعبیر کیا ہے۔

تحریر کی دوسری قسم مختلف اوقات وماحول میں متعدد مجلات ورسائل میں لکھے جانے والے ہزاروں مضامین کے علاوہ اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے والی وہ مستقل تالیفات وتصنیفات ہیں جنہیں سے ہزاروں بندوں کے قلوب شمعِ ہدایت سے فروزاں ہوئے اور لاکھوں نوجوان مغرب کے ملحدانہ افکار ونظریات سے محفوظ رہے۔ استاد مکرم مولانا نذرالحفیظ صاحب ازہری اپنے سفرنامہ ترکی شہرِ آرزو استنبول میں لکھتے ہیں کہ اس وقت ترکی میں وزارت داخلہ کی خفیہ رپورٹ کے مطابق وہاں آنے والی اسلامی بیداری کی نئی لہر میں مولانا کی کتابوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اور اس وقت ترکی میں جن تین مسلم شخصیات کی کتابیں سب سے زیادہ پڑھی جارہی ہیں۔ ان کتابوں میں سرفہرست ماذاخسر العالم اور تاریخ دعوت وعزیمت وغیرہ ہیں۔ موضوع کی وسعت کے پیش نظر اس وقت ہمارا روئے سخن اول الذکر کتاب تک محدود ہے۔

آخر ماذاخسر العالم میں وہ کیا بات ہے کہ عالم عرب میں اس کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی وہاں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو ہندوستان کو تو نہیں جانتے لیکن صاحبِ ماذاخسر سے ضرور واقف ہیں۔ بعض علاقوں میں کتاب خود صاحب کتاب سے زیادہ شہرت رکھتی ہے۔ تو لیجئے بیسویں صدی عیسوی کے نامور صاحب قلم اور داعی ومبلغ عالم اسلام کے چوٹی کے مفکر اور اخوانی رہنما سید قطب اس کی وجہ بیان کرتے ہیں۔

"اس کتاب نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی ہے۔ اس سے ان میں ماضی

پر اعتماد اور مستقبل کے بارے میں امید و حوصلہ بیدار ہوا ہے۔ کتاب میں صرف جذبات کو ابھارنے اور عصبیت کو جوش دلانے کے بجائے اپنے دعوے کے بارے میں ٹھوس علمی حقائق سے کام لیا گیا ہے جو بیک وقت وجدان و شعور اور فکر و نظر دونوں کو اپیل کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات اور اس عصر کے ماحول و متعلقات ایسے منصفانہ طریقہ پر پیش کئے گئے ہیں جن میں مصنف کی روشن دماغی صاف جھلکتی ہے۔ پھر فیصلہ واقعیت اور صداقت اور قلب و ضمیر کی بصیرت کے سپرد کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کے مباحث کی تمام کڑیاں مربوط و پیوست نظر آتی ہیں اور کہیں بھی کسی مسئلہ میں مقدمات سے نتائج اخذ کرنے میں غیر واقعیت یا تکلف کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ علمی مرقع خط ارضی کے صحیح خد و خال نمایاں کرتا ہے۔ جس کی ترتیب میں مؤلف نے کسی خود رائی یا ضد کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوب نگارش سے بے نیاز ہو کر تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہیئے۔ غرض یہ کہ اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں جو چند بہترین کتابیں میری نظر سے گذری ہیں ان میں یہ ایک کتاب ہے۔"

اب تک انسانی و اسلامی تاریخ میں اس بات پر بہت ہی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی کہ دنیا میں مسلمانوں کا سیاسی زوال کیوں اور کب ہوا اور اس کے ظاہری اسباب کیا تھے، اب تک یہی سمجھا جا رہا تھا کہ عالمی نقشہ میں مسلمانوں کے سیاسی عروج سے صرف مسلم امّہ ہی کو فائدہ پہنچا اور ان کے زوال کے اثرات بھی انہی تک محدود رہے لیکن دنیا کی رہنمائی سے مسلمانوں کے کنارہ کش ہو جانے سے عالم انسانیت کو جو نقصان پہنچا اور بحیثیت ایک اُمّت دعوت کے اس خدا شناس ملّت کے ہاتھ سے قیادت کے چھن جانے اور مادہ پرست انسانوں میں عالمی قیادت کے آجانے سے جو زوال آیا اس کو مستقل موضوع بنا کر تحقیقی و علمی کام نہ ہونے کے برابر تھا، ضمنی حیثیت سے تو اس پر متعدد تالیفات میں روشنی ڈالی گئی تھی اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے یہ نقطہ نظر سامنے

آیا کہ خود انسانیت کی حقیقی بھلائی کے لیے بھی مسلمانوں کا اس وقت پورے عالم میں منصب قیادت پر فائز ہونا ناگزیر ہے اور اس کتاب کی اشاعت سے خود مسلمانوں کے اندر بھی اپنی مجرمانہ کوتاہی پر ندامت و شرمندگی کے ساتھ عالمی قیادت کو حاصل کرنے کا جذبہ و ولولہ پیدا ہوا اس کتاب میں سب سے پہلے علمی دنیا میں جاہلیت کی اصطلاح کو ماقبل عہد نبوی یا کسی زمانے یا وظیفہ کے ساتھ خاص کرنے کے بجائے یہ دکھایا گیا کہ جاہلیت انسانی فکر کی مخصوص ساخت کا نام ہے جو اس وقت ابھرتی ہے جب انسان خدا کے مقرر کردہ اخلاقی و دینی حدود کو پار کر جاتا ہے۔ اور اس معنی میں یہ جاہلیت آج بھی مغرب میں اپنی علمی و صنعتی ترقی کے باوجود موجود ہے مغرب کے لیے چیلنج اور مشرق کے لیے تازیانہ بننے والی اس کتاب کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر اور مشہور مغربی مستشرق سارجن کو یہ کہنا پڑا کہ اگر برطانیہ میں کسی کتاب کی درآمد پر پابندی لگانے کا رواج ہوتا تو میری سفارش ہوتی کہ اس کتاب کے داخلہ پر پابندی عائد کی جائے بالآخر ۱۹۹۵ء میں فرانس کے ہوائی اڈہ پر مغربی تہذیب پر مدلل تنقید کی پاداش میں جن تین عالمی مسلم شخصیات کی کتابیں ضبط کی گئیں ان میں ایک صاحب ماذا خسر بھی تھے۔ ام القریٰ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد قطب کہتے ہیں کہ ماذا خسر نے پہلی بار سب سے پہلے بڑی خود اعتمادی سے مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کی تحریروں سے اسلام کی عالمی اور ابدی قیادت کی صلاحیتوں پر اعتماد بحال ہوتا ہے۔ لندن یونیورسٹی میں میڈل ایسٹ سکشن کے چیرمین ڈاکٹر بکنگھم کو بھی اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس اعتراف کے بغیر چارہ کار نہیں رہا کہ اس صدی میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جو کوشش بہتر سے بہتر طریقے پر کی گئی ہے یہ کتاب اس کا ایک نمونہ اور تاریخی دستاویز ہے۔

مشہور ادیب و مؤرخ استاذ محمد المبارک نے زبان حق سے یہ گواہی دی کہ میرے نزدیک ماذا خسر کا یہ علمی تحفہ اس صدی کی چند بہترین کتابوں میں سے ہے۔ عالم اسلام کے ممتاز قائد مفتی امین الحسینی صاحب مصنف کتاب کے نام ۲۷ر جون ۱۹۵۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ نے نہ صرف ملت کی بیماریوں کی تشخیص کی ہے بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کیا ہے جامعہ ازہر میں کلیۃ اللغۃ کے سربراہ ڈاکٹر عبد المنعم احمد یونس کا کہنا ہے شیخ ندوی اپنی ان تحریروں کے ذریعے نہ صرف

مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کے مربی و محسن بن گئے ہیں اس کتاب میں اسلام کی روح کو اس کے صحیح اصولوں کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور مؤرخانہ انصاف کا اس قدر لحاظ رکھا گیا ہے کہ سید قطب مرحوم کو بھی اپنی معرکۃ الآراء تفسیر فی ظلال القرآن میں اس کے اقتباسات نقل کرنے پڑے ہیں اور خود برصغیر میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے بھی اپنی کتاب نقش حیات میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

کتاب میں جس اسلوب کا لحاظ رکھا گیا ہے اس کے لیے خطیب وقت اور محقق عصر علامہ یوسف القرضاوی کی گواہی کافی ہے جن کا کہنا ہے کہ شیخ ندوی کا اسلوب نہ صرف ادیبانہ بلکہ ساحرانہ ہے وہ ایسے داعی ہیں جو انسانوں کی نفسیات اور ان کی عقلی سطح کے مطابق گفتگو کرتے ہیں تمام انسانی طبقات کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیتوں سے اللہ تعالیٰ نے انھیں نوازا ہے وہ زمان و مکان اور انسانی طبائع و مزاج کی پوری رعایت رکھتے ہیں شیخ ندوی کی حس تاریخ کے بارے میں اتنی تیز ہے کہ جو اہم دعوتی و تربیتی نتائج وہ نکالتے ہیں ہمارا ذہن بھی اس طرف نہیں جاتا ائمہ حرم کو بھی صحن حرم سے پوری انسانیت کے نام اپنے جمعہ و عیدین کے خطبات میں بارہا ماذا خسر العالم کے حوالہ سے گفتگو کرتے سنا گیا ہے۔

دنیا کی سب سے قدیم اور باوقار یونیورسٹی جامعہ ازہر کے شیخ الازہر کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ یہ کتاب اس صدی کا بہترین تحفہ ہے اپنے وقت کے محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۹ء میں حضرت مولانا کے نام ایک خط میں آپ کے دعوتی اسلوب کی خوبیوں کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ آپ کا قلم شہد خالص کی طرح شفا کا کام دیتا ہے اور زخم کا مرہم ثابت ہو کر دین کی لگن پیدا کرتا ہے برصغیر کے نامور مؤرخ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر خلیق احمد نظامی کو جو خود بھی اس میدان تاریخ میں مولانا کے ہم پایہ ہیں یہ اعتراف کرتے سنا گیا کہ اس کتاب میں ایک حساس ملی شعور کی آنکھیں شاہراہ مقصود کا پتہ دیتی ہیں اس نے مغرب کو اس تہذیب کے مہلک اثرات سے باخبر کیا ہے جو خودکشی کے لیے اپنے ہی دامن میں خنجر چھپائے ہوئے ہے مولانا کی علمی و ادبی کاوشوں کا رشتہ ملت کی ضروریات و حالات کے تقاضوں دعوت و اصلاح

کے مطالبوں اور احیاء دین کے جذبات سے کچھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ اگر ان تاریخی تصانیف کا پس منظر ذہن میں ہو تو ملّت اسلامیہ کا ذہنی و فکری تاریخ کا جیتا جاگتا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ پاکستان کے مشہور صاحب قلم کوثر نیازی مرحوم اسی کتاب سے متأثر ہو کر اپنے ایک سفرنامہ میں یوں لکھتے ہیں کہ جدید و قدیم نسلوں کو اپنی زبان و قلم سے متأثر کرنے کا زبردست ملکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت میں رکھا ہے وہ پوری دنیائے اسلام میں کئی حیثیتوں سے اپنا ثانی نہیں رکھتے جامعہ ازہر کے سابق پروفیسر محمد یوسف موسیٰ نے علمی دنیا میں ببانگ دہل اس بات کا اعلان کیا کہ میرے نزدیک اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو اس وقت کسی بھی ناحیہ سے اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں ہے آخر کیا بات ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر برصغیر کے مشہور نقاد عامر عثمانی بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مجھے مولانا کی تحریر میں غزالی کی فکر شبلی کا قلم اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص کارفرما نظر آتا ہے۔

غرض یہ کہ مغربی تہذیب پر نقد اور اسلام کے دفاع کے سلسلہ میں مدافعانہ و معذرت خواہانہ اسلوب کے بجائے خوددارانہ اور جارحانہ اسلوب کی وجہ سے عربی ممالک میں عدالت کی بحثوں اور پارلیمان کی تقریروں میں اس کتاب کے حوالہ دیئے جاتے ہیں اس وقت یہ کتاب نہ صرف کئی ممالک کے نصاب تعلیم بلکہ عالمی اسلامی تحریک اخوان المسلمین کے تربیتی کورس میں بھی داخل ہے۔ آنے والے مؤرخین جب بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی بیداری کی لہر کے پس منظر میں کارفرما عوامل کا جائزہ لیں گے تو انھیں یہ کتاب یقیناً سرفہرست نظر آئے گی۔ جس کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۲ء تک اس کے مصر و بیروت و شام وغیرہ سے عربی میں سولہ قانونی ایڈیشن نکل چکے تھے اور آخری ایڈیشن بھی ایک لاکھ نسخوں پر مشتمل تھا جو کسی بھی دینی کتاب کے لیے جو علمی و تحقیقی ہو ایک عالمی ریکارڈ سے کم نہیں اردو کے دس بار ایڈیشن کے علاوہ انگریزی فارسی ترکی اور روسی وغیرہ کے دسیوں ایڈیشن اس کے علاوہ ہیں۔ اور یہ بھی صرف قانونی ایڈیشنوں کا ایک مختصر خاکہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت مولانا کو ان کی علمی و دینی خدمات کی بدولت ملی غیر معمولی

مقبولیت ہی کا نتیجہ ہے کہ پورے ہندوستان میں مولانا ہی کو سب سے پہلے فیصل ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا جس کی حیثیت اس وقت عالم اسلام میں نوبل پرائز کی ہے اور بقول محترم مولانا عباس صاحب ندوی اپنی عمر کی رفتار سے زیادہ تیز علمی و دینی سفر کرنے والا اللہ کا یہ مقبول بندہ عمر کے اس مرحلہ میں بھی جب اسکو آرام کی بہت زیادہ ضرورت ہے کبھی آکسفورڈ کے اسلامی سنٹر میں صدارت کرتے ہوئے نظر آتا ہے تو کبھی رابطہ عالم اسلامی کے باوقار ڈائس پر شیخ بن باز کے ساتھ دکھائی دیتا ہے کبھی ملک کے وزیراعظم سے ملّی مسائل پر گفتگو کرتے دکھائی دیتا ہے تو کبھی ترکی مراقش کی علمی مجالس میں۔

اس کی یہی وہ ملّی تڑپ اور کڑھن ہے جس کی بنا پر اس کے حق میں ائمہ حرم اور شیوخ ازہر سے ابونا اور شیخنا کے الفاظ سن کر ہم ہندوستانیوں کا سر فخر سے اونچا ہوتا ہے اور بقول پاکستانی سپریم کورٹ کے جج مولانا تقی عثمانی صاحب ان سب ملّی خدمات کے عوض اس کی پوری زندگی دعوت الی الاسلام کا دوسرا نام بن گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ ملّت کی اس عظیم امانت کو تادیر سلامت رکھے۔ اور ان کو آخرت میں اپنی شایانِ شان بدلہ نصیب فرمائے۔ آمین

محمد خالد ندوی غازیپوری

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور اسلامی نشاۃ ثانیہ

تحقیق و تصنیف، علم اور ادب کسی ایک ذات میں مشکل سے جمع ہوتے ہیں، برصغیر پاک و ہند میں علامہ شبلی نعمانی اس گروہ کمیاب کے نمائندہ ہیں، وہ اعلیٰ درجہ کے عالم اور بلند پایہ محقق ہی نہ تھے ایک نغز گو شاعر اور ژرف بین نقاد بھی تھے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کو یہ روایت ورثہ میں ملی اور سید سلیمان ندوی اور شاہ معین الدین ندوی سے ہوتی ہوئی سید صباح الدین عبدالرحمان تک پہنچی، آج وہ ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن علم و ادب، تاریخ و تحقیق، تحریر و صحافت اور تصنیف و تالیف کے ایوانوں میں ان کے نگارشات کی تنویر سے روشنی حاصل کی جاتی رہے گی، وہ اپنے ذاتی اور انفرادی دائرے سے نکل کر ایک ایسے علمی اور تحقیقی مرکز کے نمائندے بن چکے تھے جس نے برصغیر ہی نہیں بلکہ ایشیا میں مسلمانوں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں اور نہضت و بیداری میں تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے اور اسلام پر مکمل اعتماد بحال کرنے اور مسلم نوجوانوں کے دل سے احساس کمتری کے زنگ کو کھرچ کر نکال دینے میں اہم رول ادا کیا۔

بلاشبہ اس ادارے کے ترجمان اور نقیب مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم تھے جنھوں نے اس تاریخ ساز ادارے کی چوکھٹ پر زندگی کی ترپن بہاریں گزار دیں اور انیس سال تک سربراہی کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کی اور اپنے پیچھے جدید منہاج علم و فکر کی ایک ایسی تحریک چھوڑ گئے جو ثقافت، تمدن اور تہذیبی روایات کے سائنٹفک شعور کا آئینہ دار ہے حقیقت یہ ہے کہ دبستان شبلی کے جملہ خصائص ان کی ایک ذات میں جمع ہو گئے تھے۔ جناب معصومی صاحب نے ان کے ناگہانی حادثہ وفات

پر اشعار کے جن آبگینوں میں خراج عقیدت کی جو سلسبیل پیش کی ہے وہ تاثراتی ادب کا ایک حصہ ہے وہ کہتے ہیں

فروغ چہرۂ تحقیق کیوں نہ ماند پڑے
کہ یک بیک ہوئے رحلت گزیں صباح الدین
وہ باغ دسنہ کا سرو سبز پوش و بلند
ربیب سید والا حبیب شاہ معین!
وہ بزم ہائے گزشتہ کا محرم اسرار
نگہ میں جس کی بہم صد نگار خانہ حسیں
وجود اس کا تھا دار المصنفین شعار
نمود اس کی معارف نمائے صدق و یقین
وہ جس کی شیوہ بیانی اور جستجو کے طفیل
بسی رہیں گی نظر میں محافل پیشیں
وہ جس کے خامۂ گلریز کی روانی سے
ورق ورق ہیں فروزاں صحائف رنگیں
برنگ خاص یگانہ وہ پیکر اخلاص
رہ وفا کا مسافر بشیوۂ تمکین
فراز گومتی رکشا سے اس کا گر پڑنا
اجل کا تھا وہ بہانہ جو بن گیا سنگین
عزیز اس کو تھی دار المصنفین کی خاک
وہ بعد مرگ بھی ہے اس کی خاک ہی کا مکیں
سدا بہار رہیں سب اس کی خدمتیں یارب
مقام اس کا شہیدوں کی ہو بہشت بریں

وطن مالوف: مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان کا وطن رسنہ تھا جو صوبہ بہار کا ایک مردم خیز قصبہ شمار کیا جاتا ہے یہاں کی سرزمین سے وہ نامور ہستیاں اٹھیں جنھوں نے علم و ادب فکر و فن تحقیق و تصنیف کے ایوانوں کو نئے انداز سے ترتیب دینے میں عظیم خدمت انجام دی جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی سید شہاب الدین دسنوی، سعید الحق، مولانا ظفر احمد ندوی اور ڈاکٹر وصی احمد انصاری (پاکستان کے مشہور سرجن) قابل ذکر ہیں۔

موصوف اس قدیم قصبہ میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دسنہ کے قدیم مکتب میں حاصل کی ۱۹۲۵ء میں میٹرک امتحان پاس کیا ۱۹۲۷ء میں مظفر پور سے ایف اے کرنے کے بعد پٹنہ آئے اور ۱۹۲۹ء میں پٹنہ کالج سے بی اے کیا۔ بعد ازاں مدرسہ شمس الہدیٰ (جس کے تعاون سے آج رابطۂ ادب اسلامی کا یہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے) میں داخل ہوئے لیکن بیماری کے طویل سلسلہ کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکے اور واپس دسنہ چلے گئے، صحت یابی کے بعد وہ علی گڑھ گئے اور مسلم یونیورسٹی سے بی ٹی کی سند حاصل کی۔

سید صباح الدین عبدالرحمان کی علمی اور تحقیقی زندگی کا آغاز دارالمصنفین سے ہوتا ہے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فیض صحبت اور برکات تربیت سے ان میں علمی تحقیقی اور انشاء پردازی کا شوق پیدا ہوا اس شوق کو مہمیز کر کے صحت مندانہ کردار کا آئینہ دار بنانے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ زلف تحقیق و انشاء کی کس طرح مشاطگی کرتے رہے خود صباح الدین عبدالرحمان کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

ایک مرتبہ علامہ نے ایک مضمون لکھنے کی غرض سے مجھے چند کتابیں دیں اور کہا کہ ان کے مطالعہ کے بعد اس پہلو پر مضمون تیار کرو۔ میں ڈبل ایم اے کر چکا تھا چنانچہ نوجوانی کے نشہ میں اور یونیورسٹی کی تعلیم کی دھونس جمانے کی خاطر بڑی محنت سے مضمون تیار کیا۔ علامہ نے جب اس پر نظر ثانی کی تو پورا مضمون بدلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر بڑی شرم آئی اس موقع پر

علامہ نے کہا کہ چھوٹے سے چھوٹے جملے اور کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معانی اور خیال پیش کرنے کی کوشش کرو، گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا نام علم ہے۔

ادب و تاریخ سے مولانا کو زمانہ طالب علمی سے لگاؤ تھا دار المصنفین کے ماحول نے اس طبعی میلان کو اور زیادہ تقویت دی۔ اس ادارے میں انھوں نے تاریخی موضوعات کو اپنے تتبع و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا ہدف بنایا۔ برصغیر میں اسلامی عہد کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ اس دور سے متعلق مرحوم کا مطالعہ بہت ہی وسیع اور غائر تھا لہذا اس عہد زریں کے بارے میں ان کی چند بیش بہا تصانیف شائع ہوئیں مثلاً بزم مملوکیہ، بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، ہندستان کے عہد مغلیہ کی ایک جھلک ہندستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام، رزم نامہ، مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری جیسی معرکۃ الآرا اور شاہکار کتابیں شامل ہیں جو اسلامی زمانے کی سیاسی ثقافتی، علمی اور ادبی احوال و آثار کا بڑا واضح اور جاندار نقشہ پیش کرتی ہیں (از ڈاکٹر محمود الرحمان، فکر و نظر ص ۵۲)

ان کتابوں کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یہ مختلف موضوعات پر مشتمل کتابیں ہیں لیکن مصنف کے ذہن و فکر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان ساری کتابوں کا موضوع صرف ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے اسلام اور مسلمانوں کے تمدن کی آفاق گیر وسعت اور تاریخی دلائل کی روشنی میں اس حقیقت کا اثبات۔

مغرب نے علمی میدانوں میں ہمارے خلاف جو متعدد محاذ تیار کیے تھے ان میں ایک سب سے زیادہ خطرناک محاذ ایسا بھی تھا جس سے ہمارے تاریخی اور تمدنی حقائق کو مسخ کرنے کا سلسلہ بڑی تیزی سے جاری تھا۔ دشواری یہ تھی کہ اس محاذ پر تنہا اہل مغرب ہی نہیں بلکہ ہندو بھی ان کے حلیف بن گئے تھے اور ہمارے تمدن اور طرز حیات کے بارے میں تاریخ کے نام پر یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کا ارتقاء عالم انسانی کے حق میں عدل و مساوات، اخوت و شائستگی اور وسیع النظری کے اعلیٰ روایات کے ساتھ نہیں بلکہ ظلم و وحشت اور بربریت کے ساتھ ہوا مقصد یہ تھا

کہ ہمارا ذہن اور ہمارا عقیدہ اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کی بھیانک تصویر دیکھ کر اور اپنی تاریخ پر شرمسار ہو کر یہود و نصاریٰ کے سامنے معذرت خواہانہ انداز میں سرنگوں ہو جائے اور وہ ضمیر و اعتقاد اور اسلاف کے علمی ورثہ پر ہمارا اعتماد سلب کرنے میں کامیاب ہو جائیں لہٰذا دنیا کو علمی اور سائنسی بنیادوں پر چیلنج کرنے والی سب سے بڑی قوم فکری محاذ پر پسپا ہو کر اپنے امتیازات کھو بیٹھی۔ یہ تھا وہ محاذ جس کو سامنے رکھ کر اسلام کی قدروں کو مستحکم کرنے کی خاطر اس کی نشاۃ ثانیہ کا سامان فراہم کرنا ضروری تھا چنانچہ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان کی ساری کتابیں اس ذہنی پس منظر کے ساتھ وجود میں آئیں اور اپنے تحقیقی منہاج اور منفرد اسلوب کی بنا پر مقبول ہوئیں۔ ان مؤلفات کے مضامین و مشمولات پر دوست و دشمن دونوں متوجہ ہوئے یہ ان کے اخلاص کا بانکپن اور ان کی علمیت کی فتح تھی۔

اس سلسلہ کی پہلی کتاب بزم تیموریہ تھی جو دو ضخیم جلدوں میں سامنے آئی اور پہلی بار یہ حقیقت مبرہن ہو کر نمایاں ہوئی کہ تیموری سلاطین صرف علم پرور ہی نہ تھی بلکہ زبان و ادب کے بھی محسن تھے اور ان کے عہد کو بجا طور پر علمی و ادبی اعتبار سے زریں عہد کہا جا سکتا ہے کتاب کے تحقیقی مقام و مرتبہ کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہندستانی ڈاکٹر کو محض اس کے فارسی ترجمے پر تہران سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ ایک خط میں مصنف کو اس تصنیف کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"جو تصویر تم نے کھینچی ہے وہ نہایت عمدہ ہے اور مصنف کے کمالات تعریف کے مستحق ہیں۔" (مکتوب سید سلیمان ندوی بنام سید صباح الدین عبدالرحمان ۳ دسمبر ۱۹۴۸ء)

ایک ہی سال کے بعد دوسری کتاب بزم صوفیہ کے نام سے وجود میں آتی ہے جو اپنی علمی سطح کے اعتبار سے تذکرہ و تاریخ سے صرف بلند ہی نہیں بلکہ مواد تحقیق کے اعتبار سے مسلم تمدن کے مختلف موضوعات پر کام کرنے کے لیے اہم حوالے کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

تاریخ و تمدن کے مطالعہ کے سفر میں ایک طالب علم کو جو طبقہ اپنے اثر و نفوذ اپنے فلسفہ و فکر اور اپنے علمی کردار کے اعتبار سے نہایت ممتاز مقام پر نظر آتا ہے وہ بلاشبہ

صوفیہ کا طبقہ ہے جس کا قابل ذکر علمی جائزہ یا تو پروفیسر نکلسن نے لیا یا پھر سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور خلیق احمد نظامی نے اسی بزم صوفیہ کے بدولت ملفوظات ادب کی ہمہ جہت قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوا اور ملفوظات کی علمی افادی اور تاریخی حیثیت کا تعین بھی ہوا۔ اس باب میں بعض مورخین کے تسامحات پر بھی فکر انگیز بحث ملتی ہے نیز مجموعی طور پر صوفیہ کے اسلامی کردار کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم نے بزم صوفیہ لکھنے کی جو غرض و غایت بیان کی اس کی ابتدا تمہید میں وہ یوں کرتے ہیں۔

صحابۂ کرام تابعین اور تبع تابعین کی طرح صلحاء اور اخیار امت کی زندگی بھی مسلمانوں کے لیے نمونہ ہے اس لیے دارالمصنفین کے سلسلہ سیر الصحابہ اور تابعین کے بعد سیرت صوفیہ کی بھی ضرورت تھی یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے راقم سطور تاریخ ہند کا ادنیٰ طالب علم ہے اس لیے اس کتاب میں یہ بھی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خانقاہ کے بوریہ نشینوں نے اپنے عہد کے مسلمانوں کے مذہب، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا تاریخ ہند کے مطالعہ میں عموماً مسلمان حکمرانوں کے افعال و کردار سے اس زمانے کے مسلمانوں کے اخلاق و سیرت و کردار کا اندازہ لگایا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے، ہندستان میں صلحا اور مشائخ ہی نے اسلام کی معنوی شوکت و عظمت قائم کی اس لیے ان کے حالات و تعلیمات کو ہندستان کے کے عہد کی تاریخ سمجھنا چاہیئے۔

مولانا محمد میاں صدیقی بزم صوفیہ سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

"حقیقت ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں سب سے مؤثر آلۂ کشش نمونۂ عمل ہے کتابوں کے اوراق اور ان کے بے جان حروف کو متحرک اور سرگرم عمل حقیقتوں پر غالب آتے بہت کم دیکھا گیا ہے یہی وجہ تھی کہ بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ صوفیہ کرام ہی ہیں۔ یہی وہ محرک تھا جس نے برصغیر کے معروف صاحب قلم اور تاریخ داں جناب صباح الدین عبدالرحمان کو برصغیر کے صوفیہ کا تذکرہ لکھنے پر آمادہ کیا۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی علیہ الرحمۃ "ذاتی سرگزشتوں کی داستان

کسی کی بھی ہو دلچسپ ہوتی ہے چہ جائیکہ ان بزرگوں کی سرگزشت جو انسانیت کے پتلے، تسلیم و رضا کے بندے و محبوبیت کے مجسمے تھے۔ دلآویزی ان کے تذکروں میں نہ ہوگی تو کہاں ہوگی ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمٰن وُدّا" اور پھر جبکہ داستاں گو خود داستاں سرائی سے واقف اور اس فن میں منجھا ہوا ہو۔ بزم صوفیہ میں جن بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اپنے رتبے اور خدمت اسلام کے لیے بلا شبہ بہت بلند مقام رکھتے ہیں، ان کی تعداد انیس ہے جن کا ذکر پانچ سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ بزم صوفیہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ اس قسم کا کوئی تاثر نہیں پیدا ہوتا کہ صوفیہ عام طور پر شریعت کے عالم نہیں ہوتے تھے یا علماء ظاہر کی طرح شریعت کی اتباع نہیں کرتے تھے بلکہ کافی حد تک اس کی نفی ہوتی ہے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ملفوظات سے جو دلیل العارفین کے نام سے شائع ہوئے ہیں صاحب بزم صوفیہ نے یہ ملفوظ بطور سند نقل کیا ہے جس سے تصوف کی ماہیت و کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

"تصوف نہ علم ہے نہ رسم بلکہ مشائخ رحمہم اللہ کا ایک خاص اخلاق ہے صوری حیثیت سے اس اخلاق کی تکمیل یہ ہے کہ سالک اپنے ہر کردار میں شریعت کا پابند ہو، جب اس سے کوئی بات خلاف شریعت نہ سرزد ہوگی تو وہ دوسرے مقام پر پہنچے گا جس کا نام طریقت ہے اور جب اس میں ثابت قدم رہے گا تو معرفت کا درجہ حاصل کرے گا اور جب اس پر بھی پختہ ہو جائے گا تو حقیقت کا مرتبہ پائے گا۔

ایک مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء خلافت سے پہلے ایک مسجد میں بیٹھے کسی شرعی مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے وہاں ایک مجذوب بھی تھا وہ کہنے لگا یا مولانا نظام الدین! علم بڑا حجاب ہے۔ خواجہ نظام الدین کے دل میں یہ بات کھٹکی کہ علم حجاب تو ہو سکتا ہے لیکن بڑا حجاب کیسے ہو سکتا ہے، خواجہ اپنے مرشد بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے مجذوب کی یہ بات نقل کی۔ بابا فرید الدینؒ نے فرمایا حجاب دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ظلمانی دوسرا نورانی۔ گناہ اور برائیاں ظلمانی حجاب ہیں جو شخص ان سے توبہ کرے گا،

اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے لیکن علم ایک نورانی حجاب ہے جس کو نہ ہر شخص عبور کر سکتا ہے اور نہ اس کے کنارے سے اٹھ سکتا ہے جس وقت تک شرعی علوم میں دستگاہ نہ ہوگی خدا کی معرفت، محبت اور قربت نہیں حاصل ہو سکتی ہے۔

بابا فرید الدین گنج شکر نے ایک موقع پر اپنے مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"جب ایک آدمی تین باتوں سے اجتناب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے تین چیزیں اٹھا لیتا ہے۔ اول جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا تو اللہ تعالیٰ اس کے مال سے برکت اٹھا لیتا ہے دوسرے جو شخص قربانی نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے سکون و عافیت چھین لیتا ہے تیسرے جو شخص نماز نہیں پڑھتا اللہ تعالیٰ مرنے کے وقت اس سے ایمان کو جدا کر دیتا ہے۔"

اس کتاب کا مطالعہ قاری کو یہ تاثر دیتا ہے کہ صوفیہ کی زندگی صبر قناعت اور توکل کا مرقع تھی وہ اس علم و عمل کے جامع تھے جو ایک مومن صادق کا مقصود حقیقی ہونا چاہیئے انھوں نے اپنی ذات سے زیادہ دوسروں پر توجہ دی خود مشکل اور مصیبت میں ہوتے ہوئے دوسروں کی ضرورتیں پوری کیں۔ تبلیغ دین اور خدمت خلق کو اپنا شعار بنایا۔

یقیناً بزم صوفیا سیرت و سوانح کے ذخیروں ہی میں نہیں اردو ادب میں بھی ایک گراں قدر اضافہ ہے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں جن کلیدی عناصر کی ضرورت ہو سکتی ہے برصغیر کے خصوصی حالات کے پیش نظر ان کی طرف اس کتاب سے رہنمائی بھی ہوتی ہے۔

فاضل مصنف نے اپنے گہر بار قلم سے صوفیا کی حقیقی خدمات کی پیکر تراشی ہی نہیں کی بلکہ اس ضمن میں سلاطین کا کیا رول رہا، اسلام کی خدمت میں وہ کس حد تک پیش پیش رہے۔ اس موضوع پر ان کی معرکۃ الآرا کتاب "ہندستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات" پر ایک نظر ہے یہ کتاب اسلامی ہند کے مذہبی ذہنی، فکری اور ضمناً سماجی اور ثقافتی حالات سے متعارف کراتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ دور قریباً ساڑھے چھ سو سال پر محیط ہے جو تیرہویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول تک پھیلا ہوا ہے اور اس عرصہ میں ۴۸ بادشاہ سلطنت ہند کے تخت پر متمکن ہوئے۔

فاضل مصنف نے جس مذہبی ماحول اور علمی فضا میں اس نازک موضوع پر قلم اٹھایا اس کا تقاضا تھا کہ میسر مواد کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس مواد کا تجزیہ کر کے ان حقائق کو ثابت کیا جائے جن سے چشم پوشی کی گئی ہے لہذا فاضل مصنف نے تجزیہ کرتے وقت عام طور پر بے لاگ محاکمہ کیا اور تاریخی حقائق سے چشم پوشی یا حالات کا غلط رخ اپنانے سے جو غلط فہمیاں اہل علم کے ہاں پیدا ہو چکی تھیں انھیں دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اس کتاب کے ذریعہ یہ حقیقت بڑی حد تک ثابت کر دی گئی ہے کہ مسلمان حکمراں علماء اور مشائخ نے برصغیر میں دین اسلام اور انسانیت کی خدمت کی بلند پایہ مثالیں قائم کیں۔ اسی طرح ایک حقیقت پسند مورخ کی طرح ان انسانی کوتاہیوں اور لغزشوں کا اعتراف کیا جو بعض حکمرانوں سے سرزد ہوئیں لیکن مجموعی طور پر انھوں نے اسلام کی انسانی خدمت اور مسلمانوں کی رواداری کو ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ہندستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر اردو ادب میں ایک عمدہ اضافہ ہے جس کے مطالعہ سے برصغیر میں اسلام کی نشو و نما اور معاشرے کے تئیں بڑے طبقوں کے باہمی تعلقات کھل کر سامنے آتے ہیں جن کی بدولت اس خطہ میں اسلام کو فروغ ملا اور جن کی مساعی سے مسلمانوں کا تشخص قائم رہا اور آج تک قائم ہے۔

سید صباح الدین عبد الرحمان صاحب نے جہاں ہندوستان میں اسلامی تاریخ کے مختلف گوشوں کو دانشگاہ انداز میں پیش کیا ہے اس پر محاکمہ کیا ہے اس کے دور رس اثرات و نتائج کو بڑے قرینے اور سلیقے سے پیش کیا ہے اور اسلامی کردار کی روشن مثالیں لائے ہیں وہیں انھوں نے ادبی اور فکری مضامین کے ذریعہ اسلامی معاشرہ کے قالب و روح کے مابین حسن انسجام اور اس کے تقاضوں کو بھی بیان کیا ہے ماہنامہ معارف کے وہ مدیر بھی تھے جس کو صحافتی اور فکری افق پر علامہ سید سلیمان ندوی اور ان کے جانشینوں نے چندے آفتاب و چندے ماہتاب بنا دیا تھا جناب سید صباح الدین عبد الرحمان نے اس رسالہ کی فکری روح اور ادبی قالب کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کو بڑے اچھوتے اور

دلکش انداز میں نبھایا۔ ان کے شذرات حالات حاضرہ کی تصویر ہوتے۔ ملی مسائل پر بحث ہوتی معاشرے میں بہت سے اٹھتے ہوئے سوالات کی نشاندہی ہوتی نامساعد حالات اور ماحول کی برہمی کی صورت میں حالات کے مقابلہ کے لیے پامردی، استقامت، حوصلہ مندی، شجاعت، طالع آزمائی، جانبازی، جوانمردی کی دعوت ہوتی ان کی تحریروں میں اقبال کی بلند نظری، شبلی کی روشن ضمیری، علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی متانت اور فکری رفعت کی چاندنی چھٹکی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہی وہ شخصیتیں ہیں جن سے براہ راست وہ متاثر ہوئے۔ لہٰذا ان کا فکری ارتقا ان بزرگوں کے اسلامی افکار و نظریات کا رہین منت ہے ان کا اسلوب انتہائی سادہ رواں الفاظ مختصر لیکن معانی سے پر ہوتے ہیں اس میں ادب کی چاشنی اور فکر کی حلاوت و رفعت پورے آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال پر ان کے صاحبزادہ نامدار جاوید اقبال نے زندہ رود تین جلدوں میں لکھی، زندہ رود، جلد اول پر تقریظ کا آغاز دیکھیں اور سید صباح الدین عبد الرحمان کی موثر ادبیت پر سر دیں۔

علامہ محمد اقبال کے جاوید نامہ میں جو مختلف کردار ہیں ان میں ایک زندہ رود بھی ہے جو خود علامہ ہیں۔ ان کی اس سوانح حیات کا یہ نام رکھ کر ان کے لائق فرزند نے ان ہی کی طرح اپنی جدت ذہن کا ثبوت دیا ہے۔ زندہ رود کے معنی مسلسل بہتی ہوئی حیات آفریں ندی بتلائے گئے ہیں۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اچکتی، اٹکتی، لچکتی، سرکتی اچھلتی، پھسلتی اور بڑے پیچ کھا کر تاریخی سیاسی اور معاشرتی واقعات کے تودوں کو چیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

آگے دیکھئے علامہ کے شعری پیکر کا نثری روپ سید صباح الدین عبد الرحمان صاحب نے کس مؤثر انداز اور خوش سلیقگی سے پیش کیا ہے، رقمطراز ہیں:

"وہ اس وجودی تصوف سے بیزار ہو گئے جس کی حکمت ملکوتی اور علم لاہوتی میں حرم کے درد کا درماں نہیں اور جس کی تعلیم میں ذکر نیم شبی، مراقبے اور سرور ہیں مگر اس

سے دل یا نگاہ مسلمان نہیں بنی یا اس وجودی فلسفے سے بے رغبتی ظاہر کی جس سے اسلاف کا جذبہ دروں حاصل ہوتا ہو۔ نہ جس سے زمرۂ لایحزنوں میں شریک ہونے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے، جس میں خرد کی گتھیاں سلجھا کر صاحب جنوں ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہو یا جس میں مئے "لا الٰہ الا ھو" پی کر من و تو کی تفریق مٹ جاتی ہو یا جس سے وہ فقر حاصل ہوتا ہے جس کے ہزاروں مقام میں روح قرآنی بے پردہ نظر آتی ہے۔ (اقبال ریویوص ۱۰۹، ۱۱۰)

اقتباس بالا میں مبصر نے ضرب کلیم اور بال جبرئیل کے بالترتیب مندرجہ ذیل اشعار کا نثری روپ اور ان کی تحلیل کی ہے۔ جس سے ان کی اقبال کے فکر و فن کے ساتھ گہری ہم آہنگی کی شہادت ملتی ہے جس کو ان کی فکری تشکیل کا اہم عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔

اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، تیرے مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

عطا اسلاف کا ذوق جنوں کر — شریک زمرہ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو — پلا کے مجھے مئے لا الٰہ الا ہو

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے — وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی

آگے رقمطراز ہیں:

علامہ اقبال اس لحاظ سے خوش نصیب باپ ہیں کہ ان کے لائق فرزند نے سوانح عمری لکھ کر نہ صرف ان کی روح کو خوش کیا بلکہ ان کی ملت کو ایک بیش بہا اور دل نواز تحفہ

پیش کیا۔ یہ وہی جاوید اقبال ہیں جن کو مخاطب کر کے ان کے والد بزرگوار نے کہا تھا۔

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخ خاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

یہ تینوں (زندہ رود) کی جلدیں لکھ کر اس کے مصنف نے دل فطرت شناس کا کا ثبوت دیا ہے اور اپنے والد بزرگوار کی زندگی کے سکوت لالہ و گل سے ہم کلام ہو کر اور ان کے خیالات کی شاخ اور ان کے افکار کی غزل کے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر دیا ہے۔ (اقبالیات) ص ۵۵)

جناب سید صباح الدین عبدالرحمان حقیقت میں اقبال کے بہت معترف تھے انھوں نے جو کچھ ماہر القادری کے تعلق سے علامہ اقبال سے ان کی ارادت مندی کا تذکرہ کیا ہے، اس جگ بیتی میں آپ بیتی ہی کا عکس جمیل ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔

"اقبال کے بہت معترف تھے کہتے کہ میر کی شاعری آہ ہے سودا کی واہ تو اقبال کی شمع راہ ہے۔ رومی نے مسلمانوں کو ولی اللہ بنانے کی کوشش کی تو اقبال نے کافر کو مسلمان بنایا۔ اقبال کی وفات پر ایک غمناک غزل بھی لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کارواں خواب میں تھا بانگ درا سے پہلے
ساز میں سوز بھی تھا تیری نوا سے پہلے

اللہ اللہ ترا قافلۂ نطق و کلام
باب جبرئیل کے سائے میں ہوا گرم خرام

صرف مشرق ہی نہیں مغرب کو بھی پیغام دیے
نگہ و فکر پر اسرار خودی فاش کیے

تو کبھی شعلۂ رقصاں کبھی رفتار نسیم موج کوثر ترے اشعار کہیں ضرب کلیم

ترے شعروں میں کہیں معرکۂ بدر و حنین کہیں ایمانِ براہیم کہیں عزمِ حسینؓ
ترا سرمایۂ دانش تھا فقط عشقِ رسولؐ

سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب نہ صرف علامہ محمد اقبال کے مداح و معترف تھے بلکہ وہ ان کے پیغام کو عام کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی بھی تاکید کرتے تھے۔ خود رقمطراز ہیں۔

"اس شاعرِ مشرق پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے آئندہ بھی لکھا جائے گا اور جتنا بھی لکھا جائے گا۔ کمی محسوس ہوگی مگر انھوں نے جو پیغام دیا تھا اس پر عمل ہوا بھی کہ نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے خوابِ گراں سے بیدار ہوں۔ وہ ناموسِ ازل کے امین، جبرئیل و اسرافیل کے صیاد ظاہر و باطن کی خلافت کے سزاوار، زہر کا تریاق، مہر و مہ و انجم کے حاکم، خود نگر خود گیر، بانگِ درا، بالِ جبرئیل اور ضربِ کلیم بن کر رہیں، اگر ان کے پیام پر عمل نہ ہو تو اس اجتماع کے دھوم دھام تزک و احتشام کے اندر ان کی روح منڈلاتی ہوئی کہہ رہی ہوگی۔

خون و دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

اسی فکر و تخیل کے ساتھ صباح الدین عبدالرحمان شمعِ حیات کو فروزاں کیے رہے، اشہبِ خانہ کو مہمیز کرتے رہے۔ دل و دماغ کی توانائیاں نچوڑتے رہے۔ اسلام کی بادِ بہاری کی تمنا لیے نخلِ آرزو کو بڑھتا، پھلتا اور پھولتا دیکھنے کے لیے وہ زندہ رہے اور زندگی کے ساتھ ساتھ رواں دواں رہے، اپنی پیرانہ سالی ضعف و نقاہت کے باوجود طویل اسفار کرتے۔ ایک دفعہ پاکستان تشریف لے گئے۔ فاران کلب انٹرنیشنل کے سرگرم اور اسلام نواز صدر جناب عبدالرحمان چھابرا نے ایک بہت ہی منتخب مجمع کے سامنے اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان کی ایک تقریر کرائی اس موضوع پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

ظہیر الدین محمد بابر کا بیان ہے کہ مجھ سے بڑے بڑے بہادرانہ کارنامے انجام پائے

میری نظر میں میری سب سے بڑی بہادری یہ تھی کہ ایک روز لڑائی میں شکست کھا کر جنگل میں سو گیا تھا آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک بڑا سانپ میرے سینہ پر کنڈلی مارے میرے منہ پر پھنکار مار رہا ہے یہ دیکھ کر میرے ہوش و حواس جاتے رہے لیکن یکایک سنبھلا اور جب اس نے پھنکار مارنے کے لیے منہ بڑھایا تو میں نے اپنے اوپر نیچے دانتوں سے اس کا سر دبا لیا اور تیزی سے کھڑے ہو کر اس کو ایک طرف جھٹک کر پھینک دیا پھر اپنی تلوار سے اس کو ٹکڑے کر دیا۔

"مستشرقین مسلمانوں کے سینہ پر کنڈلی مار کر پھنکار رہے ہیں' اس سانپ کو اس طرح مارنا ہے جس طرح بابر نے مارا تھا مگر ایسی بہادری تو مسلمان اپنی تن آسانی اور غفلت شعاری کے شاید نہ دکھا سکیں لیکن ہمارے مسلمان پارٹ ٹائم مسلمان بننے کے بجائے فل ٹائم مسلمان بن کر زندگی بسر کریں تو مستشرقین کے تمام وار خالی جائیں۔"

سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب مستشرقین کی دسیسہ کاریوں سے خوب واقف تھے اسی لیے دارالمصنفین میں بین الاقوامی سیمنار صرف اسی موضوع پر کرایا جو بہت کامیاب ہوا۔ اس سے نئی نسل کو مستشرقین کی زہرناکی کا اندازہ ہوا۔ ان کے علم و تحقیق کا طلسم ٹوٹا جس کے مفید اثرات و نتائج برآمد ہوئے کاش وہ ہمارے درمیان زندہ رہے ہوتے لیکن

ازل ہی سے یہ قدرت نے اجل کو کام سونپا ہے
چمن سے پھول چننا اور ویرانے میں رکھ دینا

لہٰذا تعمیری ادب کے نیستاں میں وہ خامۂ عنبریں جو سرچشمۂ نور نکہت بن کر خشک موضوعات کو سدا بہار گلستانوں میں تبدیل کرتا تھا اور ان کی آبیاری میں مدۃ العمر زندہ رہا۔ ۱۰ نومبر ۱۹۸۷ء کو فراز گومتی لکھنؤ سے گزرتے ہوئے حادثۂ جانکاہ کا شکار ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے یہ بہار زندگی نزاد دیدہ چمن کی نذر ہو گئی۔ مالک شہود و غیوب اس شاخ گل ریز عطر بیز بہار خیز کو بہار جاوداں میں سرسبز و شاداب رکھے۔ (آمین)

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

شاہ ہلال احمد قادری
پھلواری شریف

فکر اسلامی کے احیاء میں

کلام اقبال کی اہمیت

کلام اقبال کی دینی و ملی اور ادبی خصوصیات پر اب تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس پر اضافہ کرنا مشکل ہے، لیکن تحقیق و تلاش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، اقبال کی شاعری کی جامعیت اور وسعت و ہمہ گیری کا تقاضا ہے کہ قوم کے افراد اس سے استفادے کا سلسلہ موقوف نہ کریں، یہ چند سطریں کلام اقبال کے ایک سرسری مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔

ملت اسلامیہ کے اس دور انحطاط و زوال میں جن شعراء نے اپنی شاعری کو قوم مسلم کے تن مردہ میں روح پھونکنے اور قوم کو خواب گراں سے بیدار کرنے کا ذریعہ بنایا، ان میں علامہ اقبال کا نام سرفہرست ہے، بلکہ وہ اپنی شاعری میں الفاظ و معانی کی مناسبت، استعارات و تلمیحات، اور نکتہ آفرینی کے ساتھ ساتھ جذبۂ ملی، فکر بلند اور دل دردمند کے لحاظ سے بھی اپنے ہمعصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں، حقیقتاً ان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود کو صاحب دردِ اک اور دانائے راز کہیں،

اقبال کی شاعری حقیقت میں محض شاعری نہیں بلکہ ایک واقف رموز دین کا پیغام ہے، وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ شاعری کرنا ان کا مقصود نہیں، اپنے عزیز ترین دوست مولانا غلام قادر گرامی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"میرا مقصد کچھ شاعری نہیں بلکہ غایت یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں میں وہ احساس ملیہ پیدا ہو، جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا خاصہ تھا، اس قسم کے اشعار لکھنے

سے غرض عبادت ہے نہ شہرت ہے، کیا عجب کہ نبی کریمؐ کو میری یہ کوشش پسند آجائے اور ان کا استحسان میرے لیے ذریعہ نجات ہو جائے۔" (کلیات مکاتیب اقبال)

ان کے بعض اشعار پر باعتبار زبان دانی اعتراضات بھی ہوتے رہے تھے، اس سلسلے میں محمد دین فوق کے نام مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

" لکھنؤ والے یا اور معترض یہ خیال کرتے ہیں کہ اقبال شاعر ہے، مگر میری غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں، نہ میں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر سمجھا ہے، حقیقت میں فن شاعری اس قدر دقیق اور مشکل ہے کہ ایک عمر میں بھی انسان اس پر حاوی نہیں ہو سکتا پھر میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہوں ..... میرا مقصود گاہ گاہ نظم لکھنے سے صرف اسی قدر ہے کہ چند مطالب جو میرے ذہن میں ہیں ان کو مسلمانوں تک پہنچا دوں۔"

(کلیات مکاتیب اقبال)

یہ ایک الگ بحث ہے کہ اقبال شاعر تھے یا نہیں اور ان کے ناقدین اپنی تنقیدوں میں کہاں تک حق و راستی پر تھے، اپنے شاعر ہونے کی نفی ان کے کمال ظرف کا ثبوت ہے، آج ان ناقدوں کے نام کوئی نہیں جانتا لیکن کلام اقبال کو روز افزوں اقبال نصیب ہے۔

اقبال کی شاعری کے محرکات میں ایک محرک اور بھی ہے جس نے ان کو مثنوی اسرار خودی لکھنے کی طرف مائل کیا، خود ان ہی کے الفاظ میں سنیے، مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں۔

" یہ مثنوی جس کا نام اسرار خودی ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے، میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے مگر قسم ہے خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا، جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا میری روح کو چین نہیں آئے گا۔ (مکتوب مورخہ ۳ اپریل ۱۹۱۶ء) (کلیات مکاتیب اقبال)

ان کو اپنی ذات کا ایسا عرفان حاصل تھا، کہ زبور عجم میں فرماتے ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

مثنوی اسرار خودی طبع ہوئی تو بعض علمی حلقوں کی طرف سے اس پر تناقض کا اعتراض ہوا اور خودی پر تنقید ہوئی معترضین میں اکبر الہ آبادی بھی تھے خودی کی وضاحت کرتے ہوئے ان کو لکھتے ہیں۔

"میں اس سچی خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے، یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا، اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہو" (کلیات مکاتیب اقبال)

اس سچی بے خودی جس سے خودی پیدا ہوتی ہے کی اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے، اس طرح پر کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپروا ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے" (کلیات مکاتیب اقبال)

مسلمان کی زندگی میں تعیشات کی گنجائش نہیں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ سامان زندگی میں اختصار سے کام لو اور دنیا میں آزاد مردوں کی طرح زندگی گذارو، اسرار خودی میں اقبال اس مضمون کو یوں منظوم کرتے ہیں ؎

راہ دشوار است و ساماں کم بگیر در جہاں آزاد زی آزاد میر
سبحۂ اقلل من الدنیا شمار از تعش حرّاً اشوی سرمایہ دار

اقبال، قوم کے ان نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہیں جنھوں نے مغرب کی تقلید میں اسلامی مزاج، اور اپنے طور طریقے، لباس و زبان کو خیر باد کہہ دیا ہے،

فکر تو زنجیری افکار غیر در گلوئے تو نفس از تار غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار در دل تو آرزو ہا مستعار

قمریانت را نوا ہا ساختہ سرو ہایت را قبا ہا خواستہ
آن نگاہش سر مازاغ البصر سوئے قوم خویش باز آید اگر
می شناسد شمع او پروانہ را نیک داند خویش و ہم بیگانہ را
لست منی گویدت مولائے ما وائے مائے وائے مائے وائے ما

ان اشعار میں قوم کے فرزندوں سے کہتے ہیں کہ تمہاری فکر غیروں کے فکر کی غلام ہے، تمہارے گلے میں سانسوں کی آمد و رفت غیروں کے تار سے ہے، تمہاری زبان پر جو گفتگو ہے وہ مستعار ہے، تمہاری آرزو بھی تمہارے میں مستعار ہے تمہاری قمریوں کی نوا مستعار، تمہارے سرو کی قبا مستعار۔ اگر قوم کو وہ نگاہ دوبارہ حاصل ہو جائے جو مازاغ البصر کا راز ہے، تو شمع کو پروانے کی شناخت اور اپنے و بیگانے کی پہچان میں کوئی مشکل نہیں ہے، ہمارے آقا رسول اکرمؐ تم سے کہتے ہیں کہ (غیروں کے افکار و خیالات میں ڈھل جانے کے بعد) تو مجھ سے نہیں ہے، افسوس ہمارے حال پر صد افسوس،

قوم جب تک تہذیب مغرب کے پھندے سے نہیں نکلتی اسلامی فکر کی حامل نہیں ہو سکتی، مسلمان کو بتان فرنگ کا اسیر دیکھ کر اقبال کا دل تڑپتا ہے، ان کے دل کی بے چینی اور اضطراب کا اندازہ ان کے اردو اشعار سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے کھل کر مغربی تہذیب کی مذمت کی ہے، خان محمد نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں۔

"نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چھتڑا ہے قومیت کے اصول حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائداری مرور ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ (کلیات مکاتیب اقبال)

اسرار خودی میں ہجرت کے مفہوم کو نظم کیا ہے، اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ قلب مسلم کا وطن صرف اسلام ہے، ہند و روم و شام نہیں ہے، قومیت کا عقدہ، رسول

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت از وطن سے ہی کھلا، اور آپکے ہاتھوں سے کلمہ کی بنیاد پر مسلمان کی قومیت قایم ہوئی ہجرت، مسلمان کی زندگی کا قانون ہے، مسلمانوں کے ثبات و استحکام کا یہ ایک بڑا سبب ہے۔ قید وطن سے آزاد ہونے کے مفہوم کو مختلف مثالوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، مثلاً سورج آزاد ہو کر چلتا ہے تو سارا آفاق اس کے قدموں میں ہوتا ہے، نہر بارش کے پانی کی محتاج ہوتی ہے لیکن سمندر بے کراں ہوتا ہے، جو سمتوں کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے وہ فلک کی طرح شش جہات ہو جاتا ہے، بوئے گل پھول سے نکلتی ہے تو چمن کی وسعتوں میں پھیلتی ہے، چمن میں ایک جگہ پڑے رہنا اور ایک بلبل کی طرح ایک ہی پھول کا ہو کر رہنا قابل تعریف بات نہیں ہے، بلکہ صبا کی طرح سبک بار ہونا چاہیے تاکہ تمام گلشن اپنی آغوش میں آجائے،

اسی نقطۂ نظر کی بنا پر اقبال نے کہا تھا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مثنوی اسرار خودی کے مذکورہ مضمون کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ہندی و چینی سفال جام ماست　　رومی و شامی گل اندام ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست　　مرز بوم او بجز اسلام نیست

عقدۂ قومیت مسلم کشود　　از وطن آقائے ما ہجرت نمود

ہجرت آئین حیات مسلم است　　ایں از اسباب ثبات مسلم است

بایدت آہنگ تسخیر ہمہ　　تا توی باشی فراگیر ہمہ

ہر کہ از بند جہات آزاد شد　　چوں فلک در شش جہات آباد شد

ملت اسلامیہ کی جن قابل قدر شخصیات سے اقبال متأثر تھے ان میں حضرت سیدہ فاطمہ زہرا اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم سرفہرست ہیں، گرامی کو، جن سے وہ اکثر مشورہ سخن کرتے تھے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"افسوس فاطمہ زہرا کے مفصل حالات نہیں ملے، سیدہ خاتون زمانۂ حال کی مسلمان

عورتوں کے لیے ایک اسوۂ کاملہ ہیں، مثنوی کے دوسرے حصّے میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں فکر میں ہوں کہ کوئی ایسا شعر نکلے کہ مضمون کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو، ایسا گوہر نایاب ہاتھ آگیا تو آپ کی خدمت میں پیش کروں گا" چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔

" البتہ فاطمہ زہرا کے متعلق ایک مضمون ذہن میں آیا ہے یعنی یہ کہ احترام وعزت اگر نسبتوں پر موقوف ہے تو مریم کو صرف ایک نسبت حاصل تھی یعنی یہ کہ وہ مسیح کی ماں تھیں مگر فاطمہ" پھر اسی کے ساتھ یہ اشعار لکھتے ہیں۔

نور چشم رحمۃ للعالمیں — آں امام اولین وآخریں
آنکہ جاں در پیکر گیتی دمید — روزگار تازہ آئین آفرید
بانوئے آں تاجدار ہل اتیٰ — مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
بادشاہ وکلبۂ ایوان او — یک حسام ویک زرہ سامان او
مادر آں مرکز پرکار عشق — مادر آں کاروان سالار عشق

دوسرے مکتوب میں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے بارے میں ان اشعار کا اضافہ کیا۔

آں یکے شمع شبستان حرم — حافظ جمعیت خیر الامم
تا بمیرد آتش پیکار کیں — پشت پا زد بر سر تاج ونگیں
واں دگر مولائے ابرار جہاں — قوت بازوئے احرار جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسین — اہل حق حریت آموز از حسین

پھر گرامی کو لکھتے ہیں " اب ان اشعار کے بعد کا مضمون یہ ہے کہ ایسے بیٹوں سے جن کے یہ اوصاف ہوں ہاں کی تربیت کا اندازہ کرنا چاہیے تاکہ معلوم ہو کہ اس ماں کی آغوش میں کیا تاثیر تھی جس میں ایسے بچوں کی پرورش ہوئی " (کلیات مکاتیب اقبال)

اقبال قوم کے افراد کو مجاہدانہ عزم وہمت کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں، اس لیے اپنے

اشعار میں جا بجا جہاد کی تعلیم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں،

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں؟ — مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں — ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی — دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے — یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

لیکن اسی کے ساتھ وہ اس قوت و شوکت کو جو دین سے الگ ہو خطرناک قرار دیتے ہیں کہ یہ نشۂ قوت عقل و نظر، علم و ہنر سب کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے، ؎

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھکر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

فرنگی افکار و تہذیب پر ان کے اشعار ضرب کلیمی کا کام کرتے ہیں، حالانکہ یورپ میں ایک عرصہ گذارا تھا لیکن ان کا حال یہ تھا ؎

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی — نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

یورپ میں رہ کر انہوں نے نہ صرف قلب و نگاہ کی پاکیزگی کو برقرار رکھا بلکہ یورپ کی تعلیم ان کے ملی افکار اور دینی خیالات پر بھی اثر انداز نہ ہو سکی، کسی افرنگ زدہ کو مخاطب کرتے ہیں ؎

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی — فقط نیام ہے زرنگار و بے شمشیر

(ضرب کلیم)

مغربی تہذیب کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کو وہ اسلامی معاشرت و مزاج کے قطعاً منافی سمجھتے تھے، فرماتے ہیں ؎

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

(ضرب کلیم)

فکر اسلامی کے احیا، میں علامہ اقبال نے پوری شاعرانہ قوت صرف کردی ہے، مضامین بھرے پڑے ہیں ان کے اردو و فارسی اشعار میں، ان سطور میں چند نمونے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے، جس سے ان کے کلام کی قدر و اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے خود کہتے ہیں ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

پروفیسر وہاب اشرفی

اسلامی نشاۃ ثانیہ اور بہار کا اردو ادب

(پس منظر و پیش منظر)

بہار میں شعر و ادب کی ابتدائی چمن بندی میں صوفیاء کرام کا جو رول رہا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا مناقب الأصفیاء (مؤلف حضرت مخدوم شیخ شعیب شیخ پوری) میں بہار کے صوفیائے کرام کی ابتدائی تاریخ درج ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے کس طرح تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہ درست ہے کہ ان کی حقیقی جولانگاہ عربی و فارسی زبانیں تھیں لیکن مقامی افراد اسی وقت متأثر ہو سکتے تھے جب ان کی بولیوں میں گفتگو کی جائے، پروفیسر اختر اورینوی لکھتے ہیں کہ :

> "..... وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے عوام سے انہیں کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے۔ ان صوفیاء نے بہار میں مشترک بہاری ریختہ، اور پھر کھڑی بولی ریختہ یعنی ہندوستانی یا معیاری اردو کی ابتداء و ارتقاء میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہاں صوفی خانوادہ کی خانقاہیں چھٹی صدی ہجری میں منیر شریف، بہار شریف، پھلواری شریف وغیرہ میں قائم ہو گئی تھیں۔"

ان روحانی گہواروں نے بڑی خاموشی سے اسلام کی نشر و اشاعت کا کام انجام دیا ساتھ ہی ساتھ کھڑی بولی کے ابتدائی نقوش کو ابھارا بھی۔ ایک طرف تو یہ ہوا، دوسری طرف ایرانی شعراء کی آمد سے بہار کی بولی یا بولیوں پر دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ معروف فارسی شعراء

کلیم عارف، مولانا نادم گیلانی، مولانا حسین قزوینی، سیرتی، مولانا محمد معزالدین یزدی، مولانا عبدالشکور، مرزا قاسم امامی، میر یحییٰ قیمی، مرزا محمد صادق وغیرہ نے بہار کو رشک ایران میں مبدل کر دیا تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے صبح صادق از مرزا محمد صادق) یہی وجہ ہے کہ بہار میں شعراء کے ابتدائی تذکرے مثلاً گلزار ابراہیم، تذکرہ شورش عظیم آبادی تذکرۂ عشقی وغیرہ فارسی میں لکھے گئے جن سے بہار کے شعراء کی تصویر واضح طور پر ابھرتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ بہت کم ایسے شعراء ہیں جن پر تفصیل سے کچھ لکھا گیا ہے۔ اور یہ ابتدائی نقوش بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتے گئے۔ فارسی شعراء مثلاً بیدل عظیم آبادی، فرد عظیم آبادی شاہ الفت حسین فریاد، اور چند دوسروں سے ہم بطریق احسن واقف ہیں۔ لیکن صوفیاء اور شعراء کی ایک بڑی تعداد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اردو فارسی کی ادبی تاریخ میں ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل ہمارے اسلاف کے کارناموں سے واقف نہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی بڑے درد سے اس کا اظہار کرتے ہیں کہ:

> "ہندوستان نے ارباب کمال کے تمام اصناف میں صرف دو کے نام زندہ رکھتے ہیں۔ مشائخ و اولیاء اور شعراء کہ وقتاً فوقتاً ان کے با اخلاص مریدوں اور معتقدوں نے ان کے ملفوظات و مکتوبات اور تذکرے لکھ کر ان کے فیوض و برکات اور زبانی و ذہنی الہامات کو قائم و باقی رکھا۔ مگر اس صوبہ (بہار) نے حضرت مخدوم الملک بہاری اور ان کے رفقاء کو چھوڑ کر ہندوستان کی اس رسم کہن کو بھی تازہ نہ رکھا۔" (نقوشِ سلیمانی)

حضرت مولانا کا کرب توجہ چاہتا ہے لیکن اس کے اسباب پر میں اس مقالے کے اختتامی حصے میں روشنی ڈالوں گا۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اردو کی ابتدائی نشو و نما سے ابتک صوفیاء کرام اور علماء کرام نے جس طرح اپنی خدمات انجام دی ہیں وہ ایک مربوط اور ارتقائپذیر تاریخ بناتی ہیں جس کے لیے تذکرہ تذکروں کے علاوہ جلوۂ خضر از حضیر بلگرامی، کاشف الحقائق از امداد امام اثر تاریخ شعرائے بہار از سید عزیز الدین بلخی، بہار میں اردو زبان و ادب

کا ارتقاء از ڈاکٹر اختر اورینوی، بہار میں اردو نثر کا ارتقاء از ڈاکٹر مظفر اقبال، اعیانِ وطن از مولانا حکیم محمد شعیب، تذکرہ بزمِ شمال از شاداں فاروقی، تذکرۃ الصالحین از مولوی حسیب اللہ عظیم آبادی، مناقب الاصفیاء از مخدوم شاہ شعیب، تذکرہ علمائے بہار از ابوالکلام قاسمی وغیرہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فہرست ادھوری ہے مخطوطات اور غیر مطبوعہ مقالوں کا گراں بہا سرمایہ خانقاہوں کی زینت ہے جن سے باکمال صوفیاء اور علماء کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ پھر علاقائی سطح کی کتابوں کا ایک ذخیرہ بھی ہے جن کی تخلیق میں ہمارے باکمال علماء کا جو ادیب و شاعر بھی رہے ہیں حصہ رہا ہے ان سب پر نگاہ ہونی چاہیئے۔ تاکہ اسلامی نشاۃ ثانیہ پر بہار کے علماء کرام کی کارگزاریوں سے ہم واقف ہوسکیں۔ اس مقالے میں ایسی گنجائش نہیں کہ تفصیلات پیش کی جائیں میری کوشش یہ رہے گی کہ کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ امور احاطۂ تحریر میں آجائیں۔

بہار میں اسلامی نشاۃ الثانیہ کی بحث میں کوئی متعینہ تاریخ گمراہ کن ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی عمومی بحث سلطنت مغلیہ کے اثرات سے شروع کی جاسکتی ہے۔ ہمیں اس کا علم ہے کہ مغلوں کے عہد میں اسلامی عقائد کو نئی طرح کے رخنوں سے ہمکنار ہونا پڑا تھا۔ غیر اسلامی ثقافت اور عقائد تیزی سے اس میں داخل ہونے لگے تھے۔ شرعی امور کی پامالی عام تھی اورنگ زیب سے پہلے کئی بادشاہوں نے اسلامی شعور کو وسعت دینے کے نام پر گمراہی کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ وسعت قلبی اور ثقافت کی نئی روش کے نام پر اسلامی عقائد و افکار پر مسلسل ضرب لگائی جارہی تھی۔ اختر اورینوی لکھتے ہیں کہ:

"مغلیہ عہد میں خالص اور ٹھیٹھ اسلام پیش کرنے کی سعی مشکور حضرت احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہوئی اس دور میں ہند اسلامی تہذیب و تمدن کی ذیلی و ثانوی سطحوں کے علاوہ اسلامی عقائد

دانشکار کے مرکزی طبقات میں بھی عجمی و ہندی ملاوٹ شدت سے ہونے لگی تھی۔ ایک مذہبی تہذیب کے حواشی پر دوسری تہذیبوں کی آمیزش و امتزاج کو اسی حد تک برداشت کیا جاسکتا ہے جو مرکزی امور کو خطرے میں نہ ڈالے۔ لیکن ایک مذہبی ثقافت اپنی بنیادوں اور اپنے دائرہ خاص میں کسی قسم کے امتزاج و ترکیب کو بہ رضا و رغبت قبول نہیں کرتی۔ عہد مغلیہ میں بالعموم ہند اسلامی کلچر کے غیر اسلامی عناصر خطرناک محور پر بڑھ رہے تھے۔ دور جہانگیر میں حضرت سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی وحدانیت و وحدت کی تجدید کی پرزور کوشش فرمائی اور دور احمد شاہ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اسلامی سیرت اور صحیح سماجی، سیاسی اور اقتصادی فضا پیدا کرنے کی جدوجہد کی حضرت شاہ ولی اللہ بارہویں صدی کے مجدد تھے۔ تو حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ تیرہویں صدی ہجری کے۔۔۔۔۔"

میرے خیال میں بہار میں صادق پوری تحریک سید احمد بریلوی ہی کی مرہون منت ہے جس سے اسلامی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور جس کی عنان اسی صوبے میں مولانا سید ولایت علی زبیری صادق پوری کے ہاتھوں میں تھی۔ اس سلسلے کے بزرگوں نے اسلامی شعائر میں مرکزی کیفیت از سر نو پیدا کی تو دوسری طرف اپنی نگارشات سے ادب کے دامن کو بھی وسیع تر کیا۔ مولانا عنایت علی زبیری صادق پوری کی نگارشات میں رد شرک، رسالہ دعوت، رسالہ شجرہ باثمرہ، بیان الشرک اور رسالہ بدعت ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بہار میں اردو نثر کے ارتقاء میں مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کی کارگزاریاں ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے تصنیف کردہ رسالے ایک زبردست محرک کے ساتھ لکھے گئے جن میں منظم اجتماعی کوششیں اور عوامی میلانات مضمر تھے۔ ان علماء نے اپنے رسالوں میں عام فہم، سادہ اور بے تکلف

زبان استعمال کی ہے جو آج کی زبان سے مماثل ہے۔ اتنا ہی نہیں ان رسالوں نے اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کی بہار کی حد تک پہلی اینٹ رکھی ہے۔

لیکن مذکورہ نثر نگاروں سے پہلے بہار میں اردو شاعری علماء اور صوفیاء کے یہاں فروغ پا رہی تھی۔ ہم کسی طور اس امر کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کہ سید عماد الدین قلندر پھلواروی، علامہ محمد علیم تحقیق عظیم آبادی، قاضی عبد الغفار غفا، غلام نقش بند سجاد حضرت بی بی ولیہ، شاہ آیت اللہ جوہری، شیخ غلام یحییٰ حضور، شاہ کمال علی کمال، خواجہ امین الدین امین، شاہ نور الحق طپاں پھلواروی، شاہ امان علی ترقی، شاہ ظہور الحق ظہور پھلواروی، شاہ ابوالحسن فرد وغیرہ اردو شاعری کی مختلف صنفوں میں اپنی تخلیقات پیش کرتے رہے۔ ان کا تعلق کسی نہ کسی نہج پر خانقاہوں سے قائم ہوتا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہار میں اردو شاعری خانقاہوں کی پروردہ رہی ہے بلکہ اس کے قوام میں روحانیت کا ایسا غلبہ رہا ہے کہ بہت دیر اور دور تک اس کی گونج سنائی دیتی ہے دراصل ان شعراء نے اردو شاعری کا مذاق عام کیا اور اسلامی تعلیمات کو اپنی تخلیق کا مرکزی سرچشمہ قرار دیا۔ بعد کے علماء نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ جناب ابوالکلام قاسمی شمسی کی کتاب تذکرہ علمائے بہار کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے جس میں پانچ سو ایک[۱۰۱] علماء کا ذکر ہے۔ اس میں کم از کم ستر ایسے ہیں جن کا تعلق شعر و شاعری سے ہے میں نام گنوا کر اپنے مقالے کو طویل نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے اسلاف میں اکثر وہ ہیں جن کا تعلق روحانیات اور دینیات سے ہے، اور یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے شعر و ادب کی ابتدائی بزم آراستہ کی اور اسے فروغ دیا۔ آج بہار یا عظیم آباد ایک ادبی دبستان ہے، شاعری سید عماد الدین پھلواروی راسخ عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، صغیر بلگرامی۔ اکبر داناپوری، شوق نیموی، فضل حق آزاد، اجتبیٰ رضوی، جمیل مظہری، راز عظیم آبادی، اور ثاقب عظیم آبادی سے ہوتی ہوئی عطا کاکوی، کلیم عاجز، اور اس کے بعد کی نسل تک ایک ارتقائی سفر پیش کرتی ہے۔

کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ابتدائی شعراء مذہبی اور روحانی اقدار کو جس طرح فروغ دے رہے تھے اس سے آج کی نسل تطابق نہیں رکھتی۔ یہ بیان درست ہے، لیکن شاعری اکہری معنویت کی حامل نہیں ہوتی۔ قدروں کے زوال کے سبب روحانی اور دینی افکار کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں روشن لکیریں بھی ہیں۔ جب ہم نئی نسل کی تخلیق کردہ حمد و نعت وغیرہ کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ اس میں بہار کے شاعر حسن نعیم ہوں یا مظہر امام، پروفیسر لطف الرحمٰن اور صدیق مجتبیٰ ہوں یا وہاب دانش، پرکاش فکری یا سلطان اختر، ظہیر صدیقی ہوں یا ناوک حمزہ پوری وفا ملک پوری ہوں یا شہزاد معصومی، صابر آروی ہوں یا شکیب ایاز، نادم بلخی ہوں یا شفیع مشہدی، شمیم قاسمی ہوں یا خورشید اکبر۔ احسان دربھنگوی ہوں یا ظہیر غازی پوری، سب کے سب ایک ملتہب دل کا پتہ دیتے ہیں اس کا بھی احساس دلاتے ہیں کہ ان کی رگوں میں روحانیت کا خون دوڑ رہا ہے۔ اور یہ کیفیت صرف شاعری کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اردو افسانے کی تخلیق میں بھی بہار کا نام روشن ہے۔ اختر اورینوی نے اپنے افسانوں میں اسلامی فکر کی جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی پھیل رہی ہے۔ اور براہِ راست تو نہیں مگر بالواسطہ طور پر کسی نہ کسی سطح پر روحانی اور دینی اثرات محسوس کیئے جا سکتے ہیں۔ پاکستان میں انتظار حسین نے فقہ حدیث اور اسلامی حکایات سے اپنے افسانوں کے خدوخال مرتب کئے ہیں۔ ان کی راہ پر بہار کے کئی نامور افسانہ نگار مثلاً کلام حیدری شفیع جاوید، شفیع مشہدی، منظر کاظمی، انیس رفیع، عبدالصمد، حسین الحق، شفق، شوکت حیات، رضوان احمد مشتاق احمد نوری، فخرالدین غازی، وغیرہ قدم بڑھا رہے ہیں، ان افسانہ نگاروں کے مشہور افسانوں کے محض عنوانات ہی مثال کے طور پر۔ الف لام میم (کلام حیدری) تعریف اس خدا کی (شفیع جاوید) مسدود راہوں کے مسافر (رضوان احمد) اب وہ اترنے والا ہے (انیس رفیع) وقنا عذاب النار (حسین الحق) بنجر پرندوں کا سفر (شفیع مشہدی)

یہ احساس دلانے کے لیے کافی ہیں، کہ وہ اپنے افسانوں میں اسلامی اقدار کی پیش کش پہ زور دیتے رہے ہیں اسی طرح تنقید کے میدان پہ نگاہ ڈالیے تو احساس ہوتا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی نے اسلامی ادب کو اپنی تنقید کا جزو خاص بنا رکھا ہے۔ علامہ اقبال پر ان کی متعدد کتابیں اور "تشکیل جدید" کے علاوہ مضامین کے دوسرے مجموعے بھی اس بات پہ شاہد ہیں کہ وہ اسلامی فکر کی گود میں پرورش پانے والی اخلاقیات کو ادبی فن پاروں کی لازمی خصوصیت قرار دیتے رہے ہیں۔ بہت محدود پیمانے پر یہ کام ڈاکٹر احمد سجاد بھی انجام دے رہے ہیں، خانقاہوں سے تعلق رکھنے والی کچھ ادبی شخصیتوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں شاہ عون احمد قادری، شاہ فرید الحق عمادی، سید شاہ طلحہ رضوی برق اور سید شاہ طیب ابدالی وغیرہ کا ذکر بھی ناگزیر رہے۔

دراصل یہ کیفیت اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ یہاں کی سرزمین حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے عرفان و آگہی سے مسلسل فیض اٹھا رہی ہے مکتوبات صدی معدن المعانی اوراد شرفی، ارشاد السالکین و ارشاد الطالبین، خوان پر نعمت، مونس المریدین وغیرہ ہمارے سامنے ہیں انہیں کتابیں نہ کہئے۔ یہ علم و عرفان کے بیش بہا خزانے ہیں، علوم شریعت و طریقت کا بحر بیکراں ہیں، رشد و ہدایت کی شمع ہیں، تبلیغ دین کا مؤثر آلہ ہیں، تعلیم دین اور اصلاح امت کا سرچشمہ ہیں۔ دیکھئے مکتوبات صدی کے بارے میں دور حاضر کے عظیم دینی و مذہبی مفکر اور ادیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کیا فرماتے ہیں:

"آپ کے مکتوبات ایک زندہ و جاوید کارنامہ اور علوم و معارف کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ شاید کسی نے اپنے قلم اور زور تحریر سے اور خطوط و مکتوبات کے ذریعہ اتنا عظیم الشان، انقلاب انگیز اور دیرپا وسیع اصلاح و تربیت کا کام نہیں کیا، جیسا کہ آپ نے نہ صرف تصوف

کے ذخیرے میں بلکہ علوم و معارف، نکات و لطائف کے عالمگیر ذخیرے میں مکتوبات کا یہ مجموعہ خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اور اپنی تاثیر، ادب و انشاء کی قوت، برجستگی اور زندگی کے لحاظ سے پورے فارسی ادبیات میں کم کتابیں اس پایہ کی ہوں گی۔"

یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ مکتوبات صدی کا اردو ترجمہ شاہ نجم الدین احمد فردوسی اور شاہ الیاس یاس بہاری فردوسی نے بطریقِ احسن کیا ہے اور اس کے دو ایڈیشن سامنے آچکے ہیں۔ اسی طرح خوان پر نعمت کا ترجمہ ڈاکٹر محمد علی ارشد فردوسی نے بڑی محنت سے کیا ہے کتاب چھپ گئی ہے۔ دوسری کتابیں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں۔ نئی نسل جو عربی و فارسی سے ناآشنا ہوتی جا رہی ہے اس کے لیے یہ ترجمے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ وراثت ہمارے عالم ادباء کے یہاں منتقل ہوتی چلی گئی ہے۔ اور ان کے نام اور کام سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ واقف ہے۔ بلکہ بعضوں کی حیثیت تو بین الاقوامی ہو گئی ہے۔ میری مراد مولانا سید سلیمان ندوی، سید مناظر احسن گیلانی، مولانا مسعود عالم ندوی، سید ریاست علی ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن اور اسی قبیل کی دوسری باکمال شخصیتوں سے ہے دور حاضر میں قاضی مجاہد الاسلام کی ذات گرامی ایسے ہی لوگوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ وہ ایک عرصے سے جس طرح اسلامی مسائل پر نئی فکر کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ اس کی عالمی سطح پر ستائش ہو رہی ہے۔ بہار کی مختلف خانقاہوں اور مذہبی اداروں سے وابستہ کچھ دوسرے افراد بھی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر اسلامی اقدار کو فروغ دینے کے لیے ادب کو وسیلہ بنائے ہوئے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی مشہور کتاب "پرانے چراغ" (تین جلدیں) میں جس طرح مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ مولانا سید مسعود عالم ندوی، اور مولانا

منت اللہ رحمانی کی ادبی و علمی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ میں اس پہ کچھ اضافہ نہیں کر سکتا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ ان بزرگوں کے کارنامے نئی نسل کے لیے نہ صرف گراں بہا سرمایہ ہیں بلکہ مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ہماری ادبی توانائی کا ایک سرچشمہ ہیں جسے نظر انداز کر کے ادب عالیہ نہیں تخلیق کیا جا سکتا۔ دراصل ہمارے علماء اور صوفیاء نے ایسی راہوں پہ بھی قدم بڑھایا جو آج کے ادیبوں کے لیے رہنمائی کا کام کر رہی ہیں۔ مثلاً تمثیل نگاری کا ایک بڑا حصہ حضرت صوفی منیری کی "راحت روح" سے متاثر ہے۔ اردو کی تمثیل نگاری آج بھی اس داستان سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔ اور اشاراتی اور ایمائی ادب کی یہ پہلی عمارت آج بھی اسی طرح ممتاز و منفرد ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ملا وجہی کی "سب رس" جو ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے "راحت روح" کے ساتھ پڑھی جائے۔ تو یہ اندازہ لگانا دشوار نہ ہوگا کہ صوفی منیری ملا وجہی سے عرفان و آگہی میں کس درجہ آگے ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی "راحت روح" کو "سب رس" پہ فوقیت حاصل ہے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ کتاب یعنی 'راحت روح' صرف بہار کی یونیورسٹیوں تک محدود ہے۔ دوسری یونیورسٹیوں کے ارباب حل و عقد یا تو اسے قابل اعتنا نہیں سمجھتے یا انہیں اس کتاب کی خبر ہی نہیں ہے۔

یہاں میں اس نکتے کو واضح کر دوں جو میں نے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے کرب کے سلسلے میں پیش کیا تھا۔ عمومی طور پر اسلامی درسگاہوں سے فارغ افراد نئی انگریزی تعلیم دینے والی یونیورسٹیوں کے فارغین سے خاصا بُعد رکھتے ہیں۔ ان میں Interaction نہیں ہے۔ دونوں شقوں کے لوگ ایک دوسرے سے اس طرح الگ ہیں کہ ان کی ادبی اور علمی کاوشوں کا ایک دوسرے کو پتہ نہیں چلتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء و فضلاء کی لکھی ہوئی اچھی کتابیں بھی عام نصاب کا حصہ نہیں بن پاتیں اسی طرح یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی لکھی ہوئی کچھ اہم کتابیں اسلامی درسگاہوں تک

نہیں پہنچتی ہیں۔ پھر یہ بھی ہوا ہے کہ عربی و فارسی کی تعلیم عنقا ہوتی جارہی ہے، چنانچہ انگریزی تعلیم سے وابستہ افراد ایسی کتابوں کی طرف جو عربی و فارسی میں لکھی گئی ہیں، عام طور سے مائل نہیں ہیں۔ لیکن جو ترجمے کے راستے سے بھی داخل ہونا چاہتے ہیں انہیں جلد ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کی تعلیم تو ادھوری ہے۔ حد تو یہ ہے کہ شعر و ادب کے ایک بڑے سرچشمے سے وہ اب تک فیضیاب نہیں ہو پہ تھے۔ اس صورت کو مزید روشن کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں اپنا تعصب ختم کریں ورنہ ان کے فارغ طلباء ادھوری تعلیم کو ہی تکمیل تعلیم کا منظر نامہ بنالیں گے۔ کیا بدقسمتی ہے کہ حضرت علی میاں کی اقبال پر مختصر مگر اہم کتاب ہماری یونیورسٹیوں میں بار نہیں پاسکی۔ نقصان کس کا ہے؟ سیّد ابوالحسن علی ندوی کا نہیں ہے بلکہ متعلقہ استاذ اور طالب علموں کا ہے۔ دارالمصنّفین کی کتابیں بیشتر اپنے محتویات کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں۔ اگر ہم اسلامی فکر کے دھارے کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں تو اپنے ذی علم علماء کی تصنیفات و تالیفات سے دامن کشاں نہیں گزر سکتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلامی ادارے عام طور پہ ناول اور افسانے نہیں چھاپتے۔ لیکن جہاں تک علمی اور دینی افکار کا تعلق ہے، ان کی تفہیم کے لیے لازمی ہے کہ ہم دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء سے متعلق مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کریں۔

میرے خیال میں اسلاف کے علمی دینی اور ادبی اثاثے کی دیکھ بھال تب ہی ممکن ہے جب ارباب کمال ان کے ملفوظات و مکتوبات اور تذکرے لکھ کر ان کے فیوض و برکات اور زبانی و ذہنی الہامات کو قائم و باقی رکھیں۔

ڈاکٹر مظفر حسین غزالی
الفلاح ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی

اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں

اردو صحافت کا کردار

کسی فکر، نظریے اور عقیدے کے حلقہ بگوشوں میں اضافہ کرنے، اسے پروان چڑھانے یا اس پر چھائے گرد و غبار کو چھانٹنے میں ذرائع ابلاغ کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ترسیل ابلاغ کے ذرائع ہر زمانے میں مختلف رہے ہیں۔ البتہ وہ نظریات زیادہ لوگوں تک پہنچے جن کے حاملین نے ترقی یافتہ یا جدید ذرائع ترسیل ابلاغ کو استعمال کیا۔ کاغذ کی ایجاد اور طباعت کی سہولیات کے مہیا ہونے کے بعد ترسیل کا سب سے طاقت ور ذریعہ اخبار و رسائل کی شکل میں سامنے آیا۔

اسلام اور اردو زبان کے فروغ میں مذہبی رسائل کا حصہ ناقابل فراموش ہے۔ ان رسائل اور ان میں شائع ہونے والے مضامین کی فہرست مرتب کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس موقع پر ان تمام اخبار و رسائل کو یاد کیا جانا چاہیئے۔ لیکن سردست ان سب کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ لہٰذا اس مقالے کو منتخب اخبارات و رسائل کے مطالعے تک محدود رکھا گیا ہے۔

مواد مضمون کے لحاظ سے اگر انھیں تقسیم کیا جائے تو تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے اوّل: ادبی، دوم: مذہبی اور سوم: عوامی۔ ادبی نوعیت کے صرف رسائل ہوتے ہیں۔ اخبارات اور عوامی دلچسپی کے رسائل میں ہر طرح کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں حالات اور سماج کی ضرورتوں یا سماجی کمزوریوں کے پیش نظر شائع کیے جاتے ہیں۔ ان میں عوام کے لیے رہنمائی بھی ہوتی ہے اور یہ کاغذ پر چھپی ہوئی تحریریں

سماج کو تبدیل کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔

بیسویں صدی کے چند اخباروں کا موضوع کے ذیل میں تذکرہ کیا جارہا ہے۔بنیادی طور پر اس مضمون کا مقصد اہل علم کی توجہ اس پہلو کی طرف متوجہ کرنا ہے تاکہ آئندہ اس پر تفصیل سے کام ہو سکے۔اس صدی کے اخبارات میں سب سے پہلا نام البلاغ اور الہلال کا لیا جاسکتا ہے۔اس اخبار کی پیشانی اس آیت کریمہ سے مزین ہوتی تھی۔

لَاتَهِنُوا وَلَاتَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۔ صحافت کا کام صاحب البلاغ کی نظر میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی تھا۔اس لیے ان کا خیال تھا کہ اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیئے۔اس آزادی کی جھلک ان کے شذرات میں جا بجا پائی جاتی ہے۔مولانا خطوط اور خبروں کی معرفت بھی عوام میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ عوام میں صحیح سوچ و فکر کو پروان چڑھانے کے قائل ہیں۔مثال کے طور پر وہ لارڈ میکالے کے ایک مضمون کا اردو ترجمہ شائع کرتے وقت لکھتے ہیں۔

> اکثر انقلابات کی ابتدا نہایت خراب دیکھی جاتی ہے مگر قوم جب تک آزادانہ زندگی بسر کرے وہ آزادی کے صحیح استعمال سے واقف بھی نہیں ہو سکتی انگورستان کے باشندے عموماً شرابی نہیں ہوتے۔ (الہلال ۱۴ مئی ۱۹۱۳ء نمبر ۱۹ ج ۲۔ص ۱۲)

البلاغ اور الہلال میں کئی مستقل کالم نظر آتے ہیں۔ان میں شئون اسلامیہ تفسیر قرآن مذاکرہ علمیہ مطبوعات جدیدہ، اسوۂ حسنہ، مقالات اور مقامی و بیرونی خبریں قابل ذکر ہیں، مقالات کے تحت اصلاح معاشرت اور اسلام کے عنوان سے شائع شدہ مضمون کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> "اسلام نے ایک طرف تو اس سختی و احاطہ کے ساتھ کسب معاش کا حکم دیا کہ دنیا کی کسی تعلیم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، دوسری طرف معاش کے بعض ان ذریعوں اور صورتوں کو پوری سختی کے ساتھ روک بھی دیا جن سے انسان کی

نوعی مساوات وفطری حقوق کو نقصان پہنچتا تھا اور نیز طرح طرح کے اخلاقی و اجتماعی فسادات پیدا ہوتے تھے"[1]

مقالے کی ابتدا میں ہی اسلام کے معاشی نظام کی طرف انسان کے ذہن کو متوجہ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور مقالے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس میں شیخ عبدالعزیز کی مامون رشید کے دربار میں حق گوئی کی ایک تصویر پیش کی گئی ہے۔

"آہ! تم ہوا کا وہ جھونکا ہو جس سے شریعت کی آگ تو نہ روشن ہو سکی مگر اس نے سنّت کے چراغوں کو گل کر دیا۔ تم سیلاب خلافت کی وہ رو ہو، جو بدعات ومنکرات کی خس وخاشاک کو تو نہ بہا سکی مگر اس نے حق پرستی کے تناور درختوں کو گرا دیا تم امارت وسیادت کی وہ تلوار ہو جو بطلان وناحق کوشی کی فوجوں کو تو نہ قتل کر سکی پر اس نے ارباب حق کے سروں کو اپنی برش وروانی کا تختۂ مشق بنایا! اب تک تمہارا دعوا رسول کی جانشینی کا رہا تھا مگر اے مامون بن ہارون! تو اب رسول کی جانشینی ہی کا نہیں بلکہ رسول سے زیادہ حق رسالت کا مدعی ہو گیا ہے"[2]

باب التفسیر کی ایک جھلک بھی دیکھتے چلیں کیوں کہ یہ ان کی تحریر کا شاہکار کہے جانے کا مستحق ہے۔

"تم نے اصلاح کو افساد، مصلحین کو مفسدین سے، نور کو ظلمت سے، پھول کو کانٹوں سے الگ کر کے دیکھ لیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مفسدین ومصلحین کی یہ صفیں صرف کاغذ ہی کے صفحے پر علاحدہ قائم کی جا سکتی ہیں یا سطح زمین پر بھی ان کی بزم آرائی ہو سکتی ہے۔ قرآن حکیم اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ خدا نے نفس انسانی کو بدکاری اور پرہیزگاری دونوں کی راہیں دکھلا دیں"[3]

---

[1] البلاغ ۲۵ فروری ۱۹۱۶ء ص ۲۰۸

[2] البلاغ ۱۱ فروری ۱۹۱۶ء ص ۴

[3] ایضاً ۲۵ فروری ۱۹۱۶ء ص ۲۰۴

اس مختصر جائزے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مولانا آزاد اپنے اخبارات کی مدد سے اسلام اور اسلامی اقدار کو فروغ دے رہے تھے وہ چاہتے تھے کہ کلمہ گو ملّت کی تعمیر و اصلاح اسلامی خطوط پر کی جائے جس میں سوائے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے وہ کسی کے سامنے سرنگوں نہ ہو۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اسلامی بیداری اس کے فروغ اور بقا کا کام الہلال، البلاغ، ہمدرد اور زمین دار ہی کر رہے تھے یا اس کام میں دوسرے اخبارات و رسائل بھی شامل تھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے کی اُردو صحافت کا عام رجحان کیا تھا۔

اُردو صحافت کے ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میرا یہ خیال ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اوّل تک دو طبقے پائے جاتے تھے۔ ایک ترقی پسندوں کا طبقہ تھا اور دوسرا اس سے بیزار لہٰذا جو اخبارات و رسائل ترقی پسند طبقے کی طرف سے شائع ہوئے ان میں مذہب یا مذہبی اقدار کا مذاق اڑایا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی جگہ جو اقدار عالیہ انھوں نے پیش کیں وہ بھی اسلام سے یا بزرگوں کی تعلیمات سے ماخوذ نظر آتی ہیں۔ یہاں یہ بات وضاحت کے طور پر پیش کرنا ضروری ہے کہ ان حضرات کے ہاتھ میں گنتی کے اخبارات و رسائل تھے اور ان کے مخاطب عوام نہیں تھے۔ لہٰذا ان نظریات کا اثر پڑھے لکھے طبقے پر ہوا لیکن دوسرا گروہ زیادہ بڑا تھا اور اس کا براہ راست عوام تعلق تھا۔ اس طبقے کے افراد نے جو اخبارات و رسائل شائع کیے ان میں مولانا آزاد کی طرح جوش و خروش تو نہ تھا لیکن اسلامی اقدار اور معاشرت کو پروان چڑھانے کی تمنا ضرور نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں ماہنامہ عصمت کا یہ اقتباس دیکھیے۔ یہ آزادی نسواں کے موضوع پر لکھے گئے مضمون "یہ آزادی ہے یا غلامی" سے لیا گیا ہے۔

"آج کل آزادی اور روشن خیالی کا گھر گھر چرچا ہے ہر قوم اور ہر جماعت آزادی کی راہ میں جد و جہد کرتی نظر آتی ہے۔ موجودہ صدی میں ہماری بہنوں کو بھی یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ ہمیں آزاد ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے

آزادی اور روشن خیالی کا صحیح مفہوم ہی نہیں سمجھا ہے۔ آج ہماری یہ کیفیت ہے کہ یورپ کی ہر نئی تحریک چاہے وہ معاشرتی ہو یا اخلاقی اس کی نقل کرنے پر ہم تیار ہو جاتے ہیں یورپین پوشاک کا زیب تن کر لینا اور مکانات کی چہار دیواری سے باہر نکل آنا آزادی کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ہم ہی اپنی یورپین بہنوں کی نقل کرنے سے آزاد ہو جاتے ہیں اور نہ وہ خود آزاد ہیں جن کی ہم نقل کرتے ہیں"[1]

اسی طرح مخزن میں متعدد مضامین ایسے نظر آتے ہیں جو ہمارے آج کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اس رسالے کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ہم اس کا صرف حوالہ دے کر آگے چلیں گے:۔

"دنیا میں کیا آئے ایک آفت میں پھنس گئے۔ یا دنیا ہے کہ ایک سلسلۂ مصیبت کوئی اسے دوزخ سے تشبیہ دیتا ہے کوئی دار المحن کے نام سے یاد کرتا ہے۔ گو عملاً سب اس کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اور سوائے چند خدا رسیدوں کے یہاں سے کوچ کرنے کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا، تاہم ایک زمانہ ہے کہ اسے برا کہنے پر تلا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اس حق پسند کی نظر غائر کی داد دینی پڑتی ہے جس نے دنیا کی الجھنوں سے قطع نظر کر کے اس کی بے شمار دلچسپیوں کا دھیان کیا ہے اور شکر گزاری کا ثبوت دیا ہے"[2]

یہ معاملہ صرف مخزن یا عصمت کا نہیں ہے اس زمانے کے اکثر اخبار و رسائل اسلامی اقدار، اسلامی معاشرت، اسلامی اخلاق، تصوف اور صوفیا کی تعلیمات کو اپنے اپنے انداز میں پیش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں عبد الحلیم شرر کے اتحاد، مولانا حسرت موہانی کے اردوئے معلیٰ ظفر علی خاں کے ستارہ صبح، مولوی مجید حسن کے اخبار مدینہ اور عبد الماجد دریابادی

---

[1] عصمت اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۲۹۵

[2] انتخاب مخزن جلد اول ص ۱۲

کے صدق اور صدق جدید کا نام لیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی نے سب سے پہلے ہفتہ وار سچ لکھنؤ سے شائع کیا تھا اس کی جو پالیسی انھوں نے مرتب کی وہی ان کے تینوں اخباروں کی بنیاد رہی۔ وہ لکھتے ہیں:

"سچ عامۃ المسلمین کو، انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کو، عربی مدارس کے طلبار ومشائخ کو غرضکہ مسلمانوں کے ہر طبقے کو اسلامی زندگی بسر کرنے کی دعوت دینا چاہتا ہے"[1]

مولانا کا اپنا ایک الگ انداز تھا اسی طرح ان کا اخبار بھی دوسروں سے مختلف تھا۔ مولانا کے پیش نظر اصلاح معاشرہ اور اصلاح قوم دونوں پہلو رہتے تھے لہٰذا وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اپنے شذرات کو اس طرح سجاتے تھے کہ اس کی اثر آفرینی کئی مقالوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ ان کا کالم سچی باتیں خاص طور سے قابل مطالعہ ہے۔

"عمر کے ہر سال کے ہر روز بھی ایک مرتبہ نہیں پانچ پانچ مرتبہ آپ سنتے رہتے ہیں کہ اونچی اونچی مسجدوں سے پکار پکار کر کہا جا رہا ہے۔

حیّ علی الفلاح ـــ دوڑو فلاح کی طرف

فلاح کے معنی کامیابی و بہبود کے ہیں۔ کامیابی، مقصد و بہبود، اصلاح حال کی یہ دعوت آپ کو کبھی کبھی نہیں بلا ناغہ ہر روز اور ہر روز بھی پانچ پانچ بار، چوری چھپے نہیں ہانک پکار کے ساتھ پہنچ رہی ہے۔ اپنی بھلائی و بہتری کے لیے ہر شخص بیتاب نظر آتا ہے پھر آپ نے اس دعوت فلاح پر کتنی بار لبیک کہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"[2]

مولانا عبد الماجد دریابادی نے سیکولرزم کی تبلیغ کرنے اور مسلمانوں کی مذہبیت

---

[1] روزنامہ ہمدرد دہلی جلد ۱ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۴ء

[2] ہفتہ وار سچ لکھنؤ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۷ء

پر طنز کرنے والوں کی سخت تنقید کی ہے۔ جب وہ اس طرح کے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی غیرت ایمانی اپنے شباب پر ہوتی ہے۔ ایک مضمون "صحرا کی زبان اور ہے گلشن کی زبان اور" میں انھوں نے اکثریت کی رضا جوئی اور موجودہ فضا سے ہم آہنگی کو مسلمان اپنا مقصد زندگی بنالیں۔ اس طرح کا مشورہ دینے والوں پر تبصرہ کیا ہے۔

"بے شک موقع شناسوں اور آخرت سے منھ موڑ کر دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لینے والے مصلحت شناسوں کی صدائیں ہر دور میں ایسی ہی آتی ہیں اور انھیں میں وقت کے بڑے بڑے فیضی اور ابوالفضل بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ان فرزانوں کی صفوں سے الگ دیوانوں میں بھی ایک جماعت ہمیشہ موجود رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ہے اس کی دعوت یہی رہی ہے کہ اسلام جس طرح کسی بھی دور میں اور کسی بھی ماحول کے درمیان رہنمائی سے قاصر نہیں رہا ہے آج بھی قاصر نہیں ہے"[1]

یہ چند اشارے ہیں جو صحافت کے حوالے سے پیش کیے گئے تاکہ اس موضوع پر آئندہ تفصیل سے غور کیا جاسکے۔ یہ ایسا ذریعہ ہے جس نے سابق میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ آج بھی اسلامی اقدار کے فروغ میں معاون ہوسکتا ہے۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ اخباری صحافت کے علاوہ جو دوسرے جدید ذرائع موجود ہیں انھیں بھی کام میں لایا جائے۔ اس طرف توجہ کی گئی تو شاید آئندہ کی تاریخ پر مثبت اور قومی زندگی خاص طور سے ملت اسلامیہ کی معاشرتی زندگی پر خوش آئند اثرات مرتب ہوں۔

---

[1] صدق جدید لکھنؤ ۱۴ر جنوری ۱۹۶۶ء